

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

ڈ

فروری 2013





قاسم رضا

میناش

16

دل کو دبا دینے والی خوف و دہشت طاری  
کرتی پراسراریت سے بھرپور سبق آموز کہانی

رفعت محمود

لبے بال

45

حدود سے تجاوز کرتے ہی اکثر اوقات انسان  
پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ سبق آموز کہانی

اسرارہ نوشین

دل کے رشتے

73

کیا نادیدہ قوتیں بھی دل کے ہاتھں مجبور ہوتی  
ہیں حقیقت کا پتہ تو کہانی پڑھ کر ہی چلے گا

ایس حبیب خان

ہیر و سن

85

جادو کی کہانیاں پڑھنے والوں کیلئے ایک عجیب  
و غریب دماغ پرست طاری کرتی خوفناک کہانی

ایم اے راحت

سنہری تابوت

100

شاہکار کہانیوں کے حلائی لوگوں کے لئے  
انتخابی میں ڈائی جمرت انگیز اور تھرر انگیز کہانی

ناصر محمود فرہاد

کلون

35

مغادر پرست اور دھوکے باز اکثر مکالمے میں  
رہتے ہیں۔ جس کا جہت کہانی میں موجود ہے

اسے وحید

رولو کا

48

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا ملک تھا جس کی جہت انگیز  
لہر چاہتی کہ شہر ساریں آپ کو تک کر دیں گی

ایس امتیاز احمد

شیطانی کھوپڑی

77

کیا حقیقت ہے کہ مغادر پرستی انسان کیلئے اکثر  
بہشت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ دل گرفتہ کہانی

اقصی رباب

زندگی

95

دل و دماغ پرست طاری کرتی ایک ناقابل  
یقین عجیب و غریب حیرت انگیز ڈرائی کہانی

شائستہ سحر

قاتل

123

دھرم پانچھیں بند کر کے مہر مہر کرنے والے  
اکثر زندہ رہ گئے ہو جاتے ہیں سبق آموز کہانی

احسان سحر

خونی پاؤں

133

کیا رشتوں کی اپنا اتفاقی منصوبہ مکمل کرتی ہیں  
یہ جاننے کے لئے یہ کہانی پڑھنا نہ بھولے گا

عامر ملک

دعا کی طاقت

153

صدق دل سے کی گئی دعا اپنا اثر رکھتی ہے ایک  
ناقابل فراموش دل گرفتہ دل فریختہ کہانی

عبدالحمید ساگر

جادوگر

171

جرم و سزا کی ایک اچھوتی اور دل و دماغ  
کو بہت کرتی حیرت انگیز خونی کہانی

عابد علی

خلاء کا پیسی

201

کیا حقیقت ہے کہ دوسرے سیارے پر بھی  
سائنسدانوں سے آگے ہیں ایک ایسی کہانی

عمران قریشی

سیاہ بھوت

138

رات کے گھناؤنے اندھیرے میں جنم لینے  
والی ایک دہشت ناک اور دل گرفتہ کہانی

ساجدہ راجہ

موت کا پیچھا

159

کیا کبھی بھار مارائی قوتیں بھی انسانی مدد کی  
طلبگار ہوتی ہیں اس کا پتہ کہانی پڑھ کر چلے گا

انیم۔ الیاس

بلیک ٹائیگر

176

جنس اور سہنس سے بھرپور واقعات جو  
پڑھنے والوں کو خطرہ حیرت میں ڈال دیں گے

ادارہ

قوس و قزح

218

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین  
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

شہزادہ چاند زیب عباسی

واصل جہنم

224

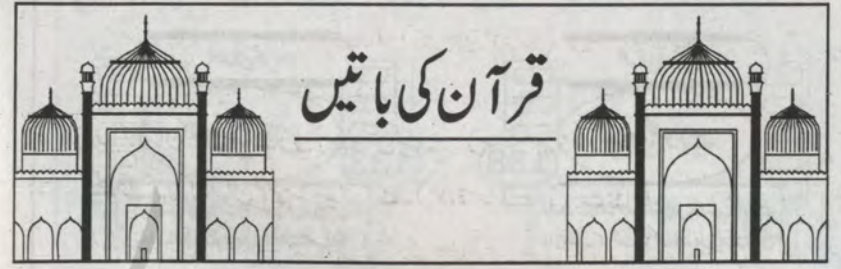
علم و تربیت کی انتہا پرستی جسم و جاں پر کبھی  
طاری کرتی خوفناک اور حیرت انگیز کہانی

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری  
نہیں۔ ڈراما تجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی  
ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقاً ہو سکتی ہے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈراما تجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔





## قرآن کی باتیں

- ☆ کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے آخرت اور دنیا تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ (سورۃ نجم 53 آیت 24 سے 25)
- ☆ اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ (سورۃ نجم 53 آیت 39)
- ☆ کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ (سورۃ معارج 70 آیت 19)
- ☆ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے ضرور کریں گے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے کو خود سری کرتا جائے۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 3 سے 5)
- ☆ بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھا۔ ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں تو ہم نے اس کو مستند دیکھنا بنایا اور اسے رستہ بھی دکھایا۔ اب وہ خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔ (سورۃ دھر 76 آیت 1 سے 3)
- ☆ اے انسان تجھ کو اپنے رب کرم گستر کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا؟ وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضا کو ٹھیک کیا اور تیری قامت کو معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔ (سورۃ انفطار 82 آیت 6 سے 8)
- ☆ ہم نے انسان کو تکلیف کی حالت میں رہنے والا بنایا ہے۔ (سورۃ بلد 90 آیت 4)
- ☆ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ (سورۃ تین 95 آیت 4)
- ☆ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے کچھ شک نہیں کہ اس کو تمہارے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (سورۃ اشراہ 94 آیت 5 سے 8)
- ☆ انسان اپنے رب کا احسان ناشناس اور ناشکرا ہے اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔ (سورۃ عادیات 100 آیت 20)
- ☆ عصر کی قسم کہ انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔ (سورۃ عصر 103 آیت 1 سے 3)
- ☆ اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دبا اور پھنسا جاتا ہے۔ اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔ (سورۃ حشر 59 آیت 21)
- ☆ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو رحم مادر میں ٹپکایا جاتا ہے۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 37)
- ☆ (کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکر یہ شیخ بک ابجی کراچی)

- ☆ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 28)
- ☆ اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا ہر حال میں ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں تو بے لحاظ ہو جاتا اور اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کو ان کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے ہیں۔ (سورۃ یونس 10 آیت 12)
- ☆ اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں پھر اس سے اس کو چین لیں تو ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔ (سورۃ ہود 11 آیت 9)
- ☆ اور انسان جس طرح جلدی سے بھلائی مانگتا ہے اسی طرح برائی مانگتا ہے۔ اور انسان جلد باز (پیدا ہوا) ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 11)
- ☆ اور جب ہم انسان کو بخشتے ہیں تو روگرداں ہو جاتا اور پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اسے سختی پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 83)
- ☆ کہہ دو کہ اگر میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے ان کو بند کر رکھتے اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 100)
- ☆ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے سمجھانے کے لئے طرح طرح کی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ (سورۃ کہف 18 آیت 54)
- ☆ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میرے علم و دانش کے سبب ملی ہے، نہیں بلکہ وہ آزمائش ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (سورۃ زمر 39 آیت 49)
- ☆ اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو حالات اس کے دل میں گزرتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔ اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔ (سورۃ ق 50 آیت 16)



بلیقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! سب سے پہلے تو میری طرف سے ادارہ ڈاٹ انجسٹ کو اور اس کے تمام ورکرز کو دل کی سچی نیو ایئر مبارک ہو۔ نیا سال، اللہ کرے خوشیوں اور کامیابیوں سے پر مزین ہو۔ تمام لکھاریوں کو اور تمام پڑھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی خوشیاں اور آمد مبارک ہو۔ جنوری 2013ء کا ڈاٹ انجسٹ مل گیا۔ ٹائٹل، بہت زیادہ خوبصورت تھا۔ ٹائٹل کی دونوں لڑکیاں بہت معصوم اور خوبصورت تھیں۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے دل کو نور کی روشنی سے منور کیا پھر سب دوستوں کے خطوط پڑھے۔ بہت زیادہ اچھے لگے۔ جن دوستوں نے مجھے ڈاٹ انجسٹ میں دیکھ کر ان کا تہہ دل سے شکر یہ! ایڈیٹر قسط دار اسٹوریز میں سنہری تابوت، کا پڑا بھاری رہا۔ رولو کا بھی زبردست رہی۔ بلیک ٹائٹلر میں ایک بار پھر سروجا آگئی۔ بہت زبردست ایم ایلیاس صاحب! اس ماہ کی ساری کہانیاں زبردست اور انوکھی و اچھوتی رہیں۔ مگر ٹاپ تھری میری نظر میں یہ تین کہانیاں رہیں۔ نمبرون پر، پہاری کے جن، نمبر دو پر لگام، نمبر تین پر برادر امورتی! علی کاشف آفاقی میں آپ کی کہانی برادر امورتی کو پڑھ کر فطرت سے خوش ہو گئی۔ باقی اچھی کہانیاں میں آسبی مہر، خودی کا قاتل، انجام، جنات کا مہمان، بدر دوح پیکر، مغرور، تابوت، نقشہ اچھی لگی۔ خونی جوکر، انگش اور ہندی ڈرامہ لگی۔ ڈراما بات، مہر ناک رہی، غزلوں نظموں میں، عثمان غنی کی غزل اور شعر نے بہت متاثر کیا۔ جب کہ انوری رمضان کی غزل بہت اچھی لگی۔ انگل جی، کیا میری کہانی دیوی شامل اشاعت ہوگی کہ نہیں۔ اگر ہے۔ تو کب تک ہو جائے گی۔ اگر نہیں تو صبر بس اللہ ہی مالک ہے۔ شائد کبھی کہانی لکھنے کی ہمت نہ کر سکوں!

☆ بلیقیس صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکر یہ۔ آپ کی دیوی ضرور شائع ہوگی اصلاح طلب زیادہ ہے اس لئے وقت کی کمی کے باعث پڑی ہوئی ہے امید ہے کہ بہت جلد شائع ہوگی۔ ایک کہانی ارسال کر کے بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں۔ غزل شامل اشاعت ہے اور امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجتا بھولیں گی نہیں۔

دضیہ عارف کراچی سے، نیا سال 2013ء کا ٹائٹل اپنی انفرادیت اور نئے چمن کی وجہ سے بہت بھلا لگا۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے یہ تو اپنی اپنی پسند ہے کسی کو اچھا لگا ہو کہ نہ ہو بہر حال مجھے تو اچھا لگا، کئی ماہ مصروفیات کی وجہ سے میں خط نہ لکھ سکی ایک تو گھریلو کام کا جو اس پر سے قیامت خیز مہنگائی نے دن رات بلکہ پل پل کا سکون بر باد کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر گھر چاہے چھوٹا ہو کہ درمیانہ، بڑے گھرانوں کی تو بات ہی الگ ہے کیونکہ بڑے لوگ مالی پریشانیوں سے بہت کم دوچار ہوتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ درمیانہ طبقہ ہی متاثر ہوتا ہے چونکہ آمدنی محدود ہوتی ہے اس لئے اگر سر ڈھانپا جائے تو بیکر کل جاتا ہے اور اگر پاؤں ڈھانپیں تو سر کھٹتا ہے۔ اتنا مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب نئے حکمرانوں نے ملک کا باگ ڈور سنبھالا اس وقت تیل اور مٹی 80/- روپے کھو گھا۔ اب اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس ہوشربا مہنگائی نے لوگوں کی حالت کو کیا بنا ڈالا ہے۔ آج بھی ایک عام کپڑی کا 180/- روپے کلو ہے۔ اس لحاظ سے ضروریات زندگی کی تمام چیزیں دستیاب ہیں۔ مہنگائی تو بڑھ گئی مگر آمدنی محدود پھر اس کے علاوہ بجلی کے، گیس کے بل اس کے علاوہ ٹرانسپورٹ کے لئے CNG۔ ڈیزل اور پٹرول کا بل بھی بدستور بدتر ہے۔ میرے خیال سے اگر پوری دنیا کی معیشت کا تجربہ کیا جائے تو جو حال آج پاکستان کا ہے ایسا کہیں اور نہیں، جب کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ جمہوریت ہوتی ہے، لوگوں کے لئے، لوگوں کی اور لوگوں سے مگر ایسی جمہوریت سے کیا فائدہ کہ لوگ جموک سے بلک رہے ہیں، لوگوں کا خون سڑکوں پر بہہ رہا ہے، لوگ اپنی عزتیں بچانے پر مجبور ہیں، کئی جگہ تو لوگ اپنے دل کے ٹکڑے تک فروخت کرنے کے لئے راضی ہوئے، لوگوں نے بے روزگاری اور مہنگائی کی وجہ سے خود کشی تک کر ڈالی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر عزت دار اور شریف انٹس لوگ کریں تو کیا کریں۔ ایسے لوگ صرف اور صرف اللہ سے لوں لگائے وہ زاری کر رہے ہیں۔ اور یاس و محرومی سے آسان کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ نہ جانے کیا رحمت خداوند جوش میں آئی گی۔ خبر یہ سب سوچ سوچ کر سوائے دل جلنے اور ٹینشن کے ہے کیا ایک عام آدمی کے گھر میں۔ خبر اب بات ہو جائے پیارے ڈاٹ انجسٹ کی تو تمام کہانیاں زبردست تھیں قسط دار میں رولو کا جواب نہیں یہ واحد کہانی ہے جو کہ میرے دماغ پر چھانی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں قسط دار

بھی ٹھیک ہی جا رہی ہیں ویسے یاد آ یا انشائیں رمضان، انوری رمضان پرچے میں نظر نہیں آ رہی ہیں میری ان سے ریکوسٹ ہے کہ پلیز آپ لوگ اپنے پڑھنے والوں کا خیال رکھیں۔ باقی باتیں آئندہ ماہ کروں گی کیونکہ بہت جلد ملنا ہو گیا ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی۔ شب و روز ڈاٹ انجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ رضیہ صاحبہ: بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے مصروفیات کے باوجود ڈر کے لئے وقت نکال کر حقیقت بھرا خط لکھا، ہم آپ کے خیالات کی تعریف کرتے ہوئے یہ امید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ ارسال کرنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks نورین اعظم راولپنڈی سے، امید ہے کہ ڈاٹ انجسٹ کی پوری ٹیم خیر خیر سے ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو دن دگنی رات چوکی ترقی عطا فرمائے اور اس طرح شاد باور ہے آئین۔ میں ڈر کی بہت پرانی کم ہمت پڑھنے والی ہوں کم ہمت اس لئے کہ میں خط بھیجوں اور آپ شائع نہ کریں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے لکھنے والوں کو دل سے دیکھ کر کرتے ہیں۔ بس پھر میں نے بھی قلم سنبھال لیا امید ہے کہ آپ ضرور شائع کریں گے اور میرا دل نہیں تو ڈس گے کہانیاں میں مجھے سنہری تابوت اور رولو کا بہت پسند ہیں کہانی پڑھتے ہوئے اتنے کھوے جاتے ہیں کہ اس پاس کا ہوش نہیں رہتا۔ میں ایک حد کہانی اور غزل بھیج رہی ہوں امید ہے کہ آپ اسے ضرور شائع کریں پلیز پلیز میرا حوصلہ ضرور بڑھائیے گا تاکہ میں آئندہ بھی لکھتی رہوں شکر یہ اگر کہانی بھیجوں تو کیا آپ اسے شائع کریں گے۔

☆ نورین صاحبہ: ڈر ڈاٹ انجسٹ میں موست دیکھ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں کیونکہ آپ کا خط بہت لیٹ موصول ہوا، کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آپ کا خط شائع ہو گیا حوصلہ افزائی ہوگی اور اب امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی ضرور خط لکھیں گی۔ سیدہ شمائیلہ ظفر کراچی سے، امید ہے آپ خیرت سے ہوئیں۔ میں نے سنی کے مینے میں آپ کو دو کہانیاں ارسال کی تھیں جو آپ نے کہا تھا کہ شائع کر دیں گے پر شاید وہ آپ کے معیار کے مطابق نہیں تھی اس لئے آپ نے شائع نہیں کی۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ وہ دونوں کہانیاں آپ واپس بھیج دیں تاکہ میں ان کو کہیں اور بھیج سکوں۔ کہانیاں کے نام ہیں۔ "لفٹ ملینی" اور "کرائے دار"

☆ شائد صاحبہ: دراصل آپ کی ارسال کردہ کہانیاں بہت چھوٹی ہیں ڈر کے دو صفحات بھی نہیں بننے اور کام کی زیادتی کی وجہ سے ہمیں نام نمبر مل رہا ہے کہ ان کہانیوں کو مزید بڑھا کر شائع کیا جائے۔ اگر آپ ان کہانیوں کو پھر کسی اور کہانی کو بھیج کر کے ارسال کر دیں تو مہربانی ہوگی۔

فاریہ قبسم ٹھیک موزون طور سے، السلام علیکم! ایک تناؤں کے ساتھ خط کا آغاز کرتی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ تمام پڑھنے والے اور لکھاری بخیریت ہوں گے۔ جنوری 2013ء کا شمارہ بہت لیٹ ملا۔ قرآن دیاں گلاں زبردست ہیں۔ خطوط وچ غلام نبی نور، بلیقیس خان، عائشہ ارمان، محمد حسین، اور کائنات بلوچ دیے خط و کچھ کے خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں خودی کا قاتل، اک سبق آموز کہانی تھی اس کے علاوہ رولو کا، زبردست جا رہی ہے، اس کے علاوہ انجام، لگام، ہمایک سزا، روح بیتی، خونی جوکر، نقشہ دل کو دھلا دینے والی کہانیاں تھیں۔ تو س قزاق میں نوشین خان، انوری رمضان، عائشہ ارمان، منیل مایین، آفسی رباب، غلام نبی نور اور اذان عزیز نے کام زبردست تھے۔ دہری لگا۔ آج پہلی بار پنجابی میں خط کی مسکن کی ہے امید ہے کہ شائع کر کے شکر یہ کا موقع دیں گے، امید ہے آئندہ ماہ کہانی بھیجوں گی۔ آئندہ ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔

☆ فاریہ صاحبہ: خلوص نامہ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks آئندہ ماہ بھی آپ کے تجزیہ کا شدت سے انتظار ہے گا۔ ساجدہ واجہ ہندوستان سرگودھا سے، میری طرف سے تمام ڈر کے راسخ زور اور پڑ کو سلام، امید ہے آپ تمام لوگ خیریت سے ہوں گے پچھلے ماہ کچھ مصروفیت کی وجہ سے خطوط کی تکمیل میں شرکت نہ کر سکی لیکن ڈر کے مطالعے سے غافل نہیں رہی، تمام کہانیاں بہت زبردست تھیں، قسط دار بھی اچھی تھیں بس بلیک ٹائٹلر کچھ بوسے ہے..... اسارہ نوشین ٹھیکس، یاد رکھئے کہ دبیر کے شمارے میں موجود فروغ پر جو کہانی ہے وہ پہلے بھی ایک رسالے میں پڑ چھ چکی ہوں کہانی کا نام تھافرعون کی قربانی باقی دیگر کہانیاں ٹھیک تھیں۔ ڈبیر کے نام سے پھر ان تحریر کب شائع ہوگی باقی ڈرامہ زیر مطالعہ ہے آئندہ تک کے لیے خدا حافظ۔

☆ ساجدہ صاحبہ: امید ہے آپ کی نشاندہی پر راسخ صاحب ضرور غور فرمائیں گے پھر ان کہانی بہت جلد شائع ہو جائے گی اور نبی



کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے آپ شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی اگلے ماہ بھی۔

**کنول عمران خان** کراچی سے، ادب میں نے پہلی دفعہ کسی ڈائجسٹ میں خط لکھا ہے اور ڈرڈائجسٹ تو میرا سب سے زیادہ پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ کیونکہ مجھے خوفناک کہانیاں بہت پسند ہیں۔ آپ کے ڈائجسٹ کی بہت تعریف سنی تھی کہ آنے والوں کو بہت حوصلہ دیتے ہیں۔ تو اس لئے میں نے بھی ایک کہانی لکھی ہے امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیں، ڈرڈائجسٹ دن دکنی رات چوٹی ترقی کرے۔ (آمین)

☆ کنول صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو مایوسی سے واسطہ نہ پڑے اور جہاں تک ہوسکتا ہے ہم کہانیوں کو اصلاح کر کے شائع کرتے ہیں، امید ہے آپ اگلے ماہ بھی خط ارسال کر کے شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی۔

**پرنسز ڈی** سرگودھا سے، السلام علیکم، میری طرف سے ڈر کے اسٹاف، رائٹرز اور ریڈرز کو بھینٹوں بھر اسلام ڈر سے رشہ جوڑے زیادہ عرصہ نہیں گزر رہا مگر اس کے اچھوتے انداز نے اپنا سیر بنالیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں اپنی تخلیق کردہ کچھ ہولناک اور پراسرار کہانیاں ڈر میں چھپوانے کی خواہش مند ہوں مگر اس کے لئے پہلے اجازت درکار ہے کہ آیا اس محفل میں جہاں مجھ سے کہیں زیادہ عظیم رائٹرز موجود ہیں تو وہی سی جگہ ملے گی؟ اگر مجھے ایک موقع دیا جائے تو میں ثابت کر سکتی ہوں میں بھی کہانی لکھ سکتی ہوں۔ آپ پلیز! بتا دیں کیا آپ میری کہانیاں شائع کریں گے۔ ایک کہانی ارسال کر رہی ہوں اسے پڑھ کر آپ فیصلہ کریں کہ کیا یہ شائع ہونے کے لائق ہے؟ میں انشاء اللہ منتظر رہے کہ مزید کہانیاں ارسال کر دوں گی۔

☆ پرنسز ڈی صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید آپ کی کہانی چونکہ بہت لیٹ موصول ہوئی اس لئے پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ گھبراہٹ میں نہیں موضوع اچھا ہوا تو اصلاح کر کے ضرور شائع کر دی جائے گی آپ بعد شوق کہانیاں بھیجتی رہیں باقی کام ہمارا ہے۔ بہت مر دال مدد خدا، ہمت اور حوصلہ والے لوگ ہی کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ شکر یہ

**انوری رمضان** پٹنڈا خان سے، تمام پڑھنے والوں کو میرا سلام! آپ سب کو Happy New year دینے تو ہمارا سال محرم کے مہینے سے شروع ہوتا ہے لیکن دین اور دنیا دونوں کے لئے کوشاں رہنا چاہیے۔ اب آتے ہیں نومبر کے شمارے کی طرف میرے فیورٹ رائٹرز "افشاں، صبا، سجاد" میں سے کسی کی کہانی بھی شائع نہیں ہوئی جس کی وجہ سے دل افسردہ رہا مگر ڈسپر میں دل خوش ہو گیا۔ گمشدہ مسافر اچھی تھی۔ ایڈیٹر صاحب آپ نے کہا تھا کہ ٹاپ تھری اسٹوریز کا آغاز جلدی ہوگا تو پھر کیا ہو؟ خط، محافظہ اور تابوت کہانی ایک سے بڑھ کر ایک اور ڈسپر کے شمارے میں دھوم مچا دینے والی کہانیاں تھی۔ اسماہ نوشین اور بلقیس خان بہت بہت شکر مابدولت کو یاد رکھنے کے لئے بہت بہت شکر یہ۔ خدا حافظ

☆ انوری صاحبہ: آپ کی ارسال کردہ کہانی اگلے ماہ شائع ہوگی۔ ٹاپ تھری اسٹوریز کا معاملہ اپنی جگہ مسلم ہے گھبراہٹیں نہیں پورا پورا انصاف ہوگا۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی۔

**ایس حبیب خان** کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈرڈائجسٹ کی ٹیم اور اس کے پڑھنے والے سب خیریت سے ہونگے۔ جنوری 2013ء کا "ڈر" نئے سال کی آمد کے احساس کے ساتھ گزرے سال کی یادیں لے کر موصول ہوا۔ سرورق انتہائی جاذب نگاہ لگا۔ خطوط کی محفل میں تھروں کے ساتھ ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات پڑھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی تو سب سے پہلے "لگام" نے واقعی ابتدائی صفحات کا خوبصورتی سے حق ادا کیا، "جنات کا مہمان" ہمیشہ کی طرح اہلس۔ امتیاز احمد کی شاندار تحریر تھی، "آئینی مہم" رائٹرز نے بد عمدہ انداز سے لکھی بہت پسند آئی۔ "مغزوہ" بھی کیا خوب رہی ویلڈن، "پہاڑی کے جن" آخری صفحات کی خوبصورت سوغات رہی۔ یہ تو بات تھی کہ کہانیوں کی اس کے علاوہ میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتی ہوں کہ اس مرتبہ میری کہانی میں خاصی "مس پرنسنگ" تھی۔ اور بھی کئی چیزیں تھیں۔ آپ کی توجہ مبذول کرانے کی خاص وجہ یہی ہے کہ کسی بھی چیز کی وجہ سے ڈر کا معیار متاثر نہ ہو۔ امید کرتی ہوں کہ آپ غور کریں گے۔ آخر میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ آنے والے دنوں میں ان گنت خوشیوں سے میرے وطن پاکستان کو نوازے اور اس کی سلامتی و بقا قائم رکھے، ساتھ ہم سب کو جذبہ ایمانی سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

☆ ایس صاحبہ: آپ کو آئندہ ایسی شکایت نہ ہوگی دراصل کمپیوٹر کی وجہ سے پروف والا نہیں بلکہ بغیر پروف والا میگزین غلطی سے لگ گیا تھا اس کے لئے معذرت۔ کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ Thanks

**عاصمہ رمضان** پٹنڈا خان سے، السلام علیکم! سب سے پہلے نئے سال کی مبارک باد باد پلٹے ہیں ڈسپر کے ڈر کی طرف خط، محافظہ، ہولناک رات، تابوت کہانی زبردست کہانیاں تھی۔ مطلب دھماکے دار افشاں رمضان سے ایک بات پوچھوں گی۔ آپ اتنی معلومات کہاں سے لیتی ہیں ویری گڈ، ایکسیلیٹ۔ خطوط میں اسماہ نوشین Thanks بلقیس خان Thanks محمد آصف شہزادہ Thanks اور حسن علی کے ساتھ ساتھ سب کے لئے دعائیں۔ غزلوں میں سنبل مایین، طہ، عروج، مایین، طہ، افشاں رمضان اور ماہم عابد کے کلام اچھے تھے اور باقی سب سو سمجھتے۔

☆ عاصمہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ کو یاد کرنے کے لئے ویری ویری تھینکس آئندہ ماہ بھی خلوص سے بھرا تجزیہ کا انتظار رہے گا۔  
دفعہ محمد محمود راولپنڈی سے، امید ہے ڈر کے سارے اسٹاف کے لوگ خیریت سے ہوں گے۔ نئے سال کا پُر چودقت سے پہلے ہی مل گیا سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی ویدر فل ٹائٹل تھا اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے بے شک آپ مبارکباد کے مستحق ہیں اس کے بعد کہانیوں پر نظر پڑی تو دکھ ہوا کہ اتنے عرصے کے بعد کہانیاں ارسال کیں مگر ڈاک کی تاخیر کی نظر ہو کر رہ گئی اور دیر بعد ملتی ہیں۔ اس ملک میں کون سی چیز قائم پر پہنچ رہی ہے۔ سب ہی نظام درہم برہم ہے۔ ویسے بھی کراچی کے حالات خراب ہیں۔ سیاست عروج پر ہے سب ہی سب اچھا کیت الپ رہے ہیں۔ مگر ان کو ہنگامی بیرونگاری لاقانونیت نظری نہیں آ رہی۔ غریب دو وقت کی روٹی کے محتاج ہو گئے ہیں پھر بھی ایک نعرہ چل رہا ہے۔ "سب اچھا ہے۔" یہ نہیں کہ اس ملک کے حالات ٹھیک ہوں گے 65 سال ہو گئے ہیں پاکستان آزار ہوئے چھوٹے چھوٹے ملک ترقی کر کے کہاں پہنچ گئے ہیں مگر ہم حال سے بے حال ہیں۔ کہانیاں تقریباً سب ہی اچھی تھیں لیکن ان میں اگر کچھ تبدیلی لے آئیں تو اچھا ہوگا۔ اب 1999ء والا دور ختم ہو گیا ہے جب ڈر بنایا تھا اب یہ تیار و رخت بن گیا ہے ہر گھر کی زینت بن رہا ہے۔ ہاں اب ایک چھوٹی سی گزارش ہے کہ آپ جب بھی ساگرہ نمبر نکالیں تو کہانیوں کے ساتھ رائٹرز کا تعارف بھی لگادیا کریں کئی پرچے والے لگا رہے ہیں امید ہے میری اس آرا پر غور کریں گے۔ اب آخر میں ڈر پڑھنے والے تمام رائٹرز اور کارکنان کو پُر خلوص سلام۔

☆ رفعت محمود صاحب: ہمارے ملک کا یہی تو اصل مسئلہ ہے کہ ہم لوگ احساس قلبی سے عاری ہو چکے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کب قہر بن کر نازل ہوتا ہے۔ آپ کی تجویز قبول کر لی گئی ہے۔ عمل ضرور ہوگا پرچے میں تبدیلی کے بارے میں تجویز ضرور دیجئے گا۔ کہانی شامل اشاعت ہے آئندہ ماہ بھی امید ہے خلوص نامہ بھیج کر شکر یہ کاموقع ضرور دیں گے۔

**محمد علی چغتائی** خیرپور ناہیوالی سے، السلام علیکم! اور ادب امید ہے کہ ڈر کا جملہ اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ جنگجو حسینہ کے ٹائٹل والا ڈر 24 دسمبر کو ملا دیکھ کر دل بھج گیا کیونکہ ٹائٹل دھانسو قسم کا ہونا چاہے جیسا کہ ڈر کا مزاج ہے۔ خیر آئندہ سہمی۔ سب سے پہلے خطوط میں اپنا خط تلاش کیا دیکھ کر جچ نکلتے نکلتے رہ گئی فوراً بڑے بھائی کو دکھانے کے لیے بھاگا اور دروازے کی چوکت سے نکل کر ایسا طرح سر کے اوپر ایک اور سر نمودار ہو گیا۔ ہر حال So Thanks آپ نے مجھے اتنی خوشی دی۔ اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے رولو کا پڑھی جو میری توقع کے عین مطابق Super تھی اس کے بعد ایم اے راحت صاحب کی سنہری تابوت بھی ایک نیا موڈ لیتے ہوئے حیرت زدہ کر گئی عمران قریشی صاحب کی لگام اپنے اندر کچھ کچھ جاسوسی عنصر لے ہوئے تھی۔ انجام اعزین ہارمونی سے کافی متاثر تھی۔ خودی کا قاتل ہر لحاظ سے ایک بہترین تحریر تھی جسے پڑھ کر میں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ شائستہ صاحبہ کا بھیا کرمز اچھا موضوع لے ہوئے تھی۔ محمد آصف وارث صاحب کی آئینی متعجب سب کی لگی۔ صفدر شاہین صاحب کی روح بیتی بہت اچھی لگی۔ باقی کہانیاں باقی ہیں پڑھنے کو۔ میں زیادہ تر مزاحیہ شاعری کرتا ہوں اور ایک مزاحیہ غزل ارسال کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ حوصلہ افزائی ہوگی آخر میں اجازت چاہوں گا اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے (آمین)

☆ محمد علی صاحب: خط لکھتے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی ڈرڈائجسٹ کو یاد رکھتے ہوئے خیریت نامہ اور تجزیہ بھیجتا بھولیں گے نہیں۔ شکر یہ



محسن علی جٹ ساہیوال سے، امید ہے آپ باخیریت ہوں گے۔ جناب میں نے پچھلی بار بھی ایک کہانی نیت بھیجی تھی مگر لگتا ہے آپ کو نہیں میں نے لیر کے ساتھ بھیجی تھی وہ میری خود نوشت تھی مگر مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئیں تھیں، مثلاً کہانی پر اپنا نام اور ایڈریس نہیں لکھا تھا اس بار بھی ایک کہانی بھیج رہا ہوں کہانی کا نام بے وفا لوگ ہیں میرے ذہن کی تخلیق ہے امید ہے شائع کر کے حوصلہ افزائی کریں گے۔ نقل کرنا بری بات ہے اور کسی دوسرے کی چیز پر اپنا نام لکھ کر شائع کروانا بھی بری بات ہے ہر انسان کو اللہ پاک نے دماغ دیا اس سے انسان کام لے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اب جنوری 2013ء کی بات کریں تو مجھے رد لوگا ہی اچھی لگی ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں، مگر ایم ایلاس صاحب کی کہانی بلیک ٹائیگر بہت بوری تھی۔ میں رائٹروں پر تنقید نہیں کرتا کیونکہ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں ان کو ایک بات کہو گا کہ زیادہ سے زیادہ اچھا لکھنے کی کوشش کریں آہستہ آہستہ ان میں مکمل رائٹر بننا ہے۔ باقی تمام قارئین کا بھی شکریہ ادا کروں جو لکھتے ہیں ان کی وجہ سے مزید کہانیاں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ اس دفعہ کہانیوں میں تھوڑا بہت مزاح بھی تھا جو مجھے پسند آیا اور Joke پڑھ کر بھی بلاوجہ چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ اس مرتبہ میری کہانی ضرور شائع کیجئے گا دل نہ ڈریئے گا بہت امید ہے لکھی ہے۔ اللہ پاک ڈرڈا بجسٹ کو دل ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ ☆ ☆ محسن صاحب: پلیر! آپ دل برداشتہ نہ ہوں، وقت پر آپ کی کہانی بھی ضرور شائع ہوگی۔ آپ کہانی لکھتے رہیں باقی کام ہمارا، آپ بہت حوصلہ مند جوان لکھتے ہیں اور حوصلہ والے ہی کامیاب ہوتے ہیں امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی خیریت نامہ بعدہ تجزیہ ضرور ارسال کریں گے۔

غلام فیسی نووری کھٹیاں خاص سے، سب سے پہلے ڈر کے تمام قارئین، رائٹرز اسٹاف اور دیگر عملے کو دل کی اتھا گہرائیوں سے سلام، اس کے بعد جنوری 2013ء کے شمارے کا احوال کچھ یوں تھا کہ خطوط کی مغل میں پہنچے تو دیکھا کہ صرف حسین نے شاعری پسند کی اور قاریہ تبسم نے خط، ان کا بہت بہت شکریہ۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بلقیس خان، عائشہ ارمان، زاہد، عطا محمد، شگفتہ حسین، کائنات بلوچ، عثمان غنی، نجم آصف وارث، اور قاریہ تبسم کے خطوط محبت بھرے انداز میں لکھے گئے تھے۔ کہانیوں میں رد لوگا بیٹ آف دی ملتھی تھی۔ اس کے بعد بلیک ٹائیگر اور نہرزی تابوت زبردست رہی۔ ڈرڈا شمارہ نوٹش کی کہانی زبردست تھی۔ ہمایونک سزا، شائستہ بحر کی کہانی منفرد تھی، آسبی معمر، وارث آصف ویری گند، روح بچی، صفدر شاہین، خوب کہانی تھی۔ تابوت، شہاب شنگھ، نقشہ، نظارت نصر، کہانی بہت اچھی تھی۔ اس کے علاوہ خودی کا قاتل آتشی رباب آپ نے ڈر کی حد کر دی۔ خونی جوکر، جنات کا مہمان، لگام، انجام، اور ذرا سی بات اچھی تھیں۔ مفرد نقل شدہ تھی یہ پہلے بھی ایک جگہ شائع ہو چکی ہے۔ قوس قزح اچھا تھا خرمیں ڈر کے لیے دل کی اتھا گہرائیوں سے دعا گو ہوں۔

☆ ☆ ☆ غلام نبی صاحب: دل کی گہرائیوں سے خط لکھتے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت شکریہ آپ کے خلوص نامہ کا اگلے ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

قدیر دانا راولپنڈی سے، آپ کی خیریت کا طالب ہوں ایک غزل ارسال ہے۔ کسی بھی قریبی اشاعت میں جلد سے درمستور فرمائیں۔ جنوری کے شمارے میں شائع شدہ تمام کی تمام تحریر زبردست اور دل موہ لینے والی تھیں ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے غزلیں اور اشعار بھی من کو بھاگئے۔ آپ کی محنت اور ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ ☆ ☆ قدیر صاحب: ڈرڈا بجسٹ سے آپ کی والہانہ چاہت قابل دیدہ ہے امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع دیں گے۔ عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم میری طرف سے نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔ تمام لکھنے والوں کو اور پڑھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئے سال کی آمد پر سب کو خوشیاں عطا فرمائیں۔ ڈرڈا بجسٹ کا نئے سال کا پہلا شمارہ 20 دسمبر 2012ء کے آخر ماہ میں مل گیا۔ ٹائٹل بہت زیادہ خوبصورت تھا۔ میرا خط اور شعر و شاعری شائع کرنے پر آپ سب کا تہنیدل سے شکریہ اظہار تحریروں میں تینوں تحریریں خوبصورت اور زبردست رہیں۔ سنگل کہانیوں میں اول نمبر پر لگام عمران قریشی کی تحریر رہی۔ دوسرے نمبر پر پہاری کے جن نے یہ مقام حاصل کر لیا۔ تیسرے نمبر پر روح بچی، پچا واقعہ زبردست موضوع اور خوف سے بھر پور رہی۔ ان میں برآمدار موروثی زبردست تھی۔ مفرد اعلیٰ ذوق کی کہانی تھی۔ جنات کا مہمان تحقیق کہانی تھی۔ خودی کا قاتل متاثر کن رہی۔ انجام نے زیادہ متاثر کیا۔ تابوت جادوئی کالے منتر کی کہانی اچھی لگی۔ ذرا سی بات واقعی، گھریلو موضوع

اثر انگیز رہی۔ بدروح پیکر، نے متاثر کیا۔ باقی تمام دوستوں کی کہانیاں خوبصورت اور زبردست رہیں۔ کیا میری محنت شدہ کہانیاں، خوف اور یادداشت میں کسی ایک کا شائع ہونے کا امکان ہے۔ میں ڈرڈا بجسٹ تمام رسالو سے عزیز ہے۔ پلیر بھی کہانیاں بھیج رہا ہوں۔ اس کو شائع کر دیجئے گا۔

☆ ☆ ☆ عثمان صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر حرا آیا۔ کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری تھینکس۔ آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی۔ پلیر! گہرائیوں میں نہیں۔ جو کہانیاں زیادہ اصلاح طلب ہوتی ہیں ان میں وقت تھوڑا زیادہ لگ جاتا ہے۔ ہم کسی کی بھی تحریر ضائع نہیں کرتے۔ آپ کے خط کا آئندہ ماہ بھی انتظار رہے گا۔ Thanks

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہار سے، السلام علیکم 2013ء کی ابتداء ہے دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ یہ سال امت مسلمہ اور احباب سمیت ہم سب پاکستانیوں کو ہر آفت سے محفوظ رکھے آمین۔ مجھ سمیت ڈر کے سب ساتھی ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہیں۔ مگر 2013ء کا ڈر کا آغاز بہت غلط ہوا قوس قزح سمیت کئی صفحے غائب تھے مگر فہرست میں نام موجود تھے۔ فوراً ہی پڑوس میں کیشال پر چھاپہ مار ڈر کی جانچ شروع کی آخر مکمل ڈر مل گیا۔ ادارے کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنا چاہیے۔ تقریبی نوٹ کی وجہ سے دسمبر کے شمارے کا تبصرہ نہ کر سکا۔ دسمبر کے شمارے میں اشارہ نوٹش صاحب کی یادداشت کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی وہ ڈر کے ساتھیوں کو اپنا نیت بھرے دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔ جنوری کے شمارے میں ایس۔ امتیاز احمد۔ قاریہ تبسم، عائشہ، زاہد عطا محمد، ایس حبیب خان، شگفتہ حسین، نے ڈر کے لکھنے پڑھنے والوں کو دعاؤں کے ساتھ بہترین تبصرے لکھے جو بار بار پڑھے۔ میں پہلے بھی لکھا چکا ہوں کہ میں تین کلاس سے زیادہ اسکول نہیں گیا ہوں لہذا لکھنے میں آکسر غلطیاں ہوتی ہیں آپ صحیح کر سکتے ہیں کیوں کہ آپ لوگ بہت ذہین ہیں والسلام دعا میں سب کے لئے۔

☆ ☆ ☆ شرف الدین صاحب: آپ جو کچھ لکھتے ہیں اچھا لکھتے ہیں، آج کل کا ایک میٹرک کا طالب علم آپ جیسے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام قلمی رشتوں کو بخیر و عافیت رکھے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم امید ہے مزاح گرامی بخیر ہوگا سال کا پہلا خوبصورت شمارہ ہمارے سامنے ہے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ آرٹیکل لگانے کا شکریہ۔ میٹر آپ کے پاس ہے۔ پلیر دیکھئے گا۔

☆ ☆ ☆ امتیاز صاحب: خلوص نامہ بعدہ کہانی کے بھیجے کا شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی قلمی لگاؤ کا موقع ضرور دیں گے۔ Thanks

محمد وارث آصف واں بھجراں سے، 2012ء کا آخری شمارہ یکم کو ملا۔ سرورق بہت اعلیٰ اور بے حد پسند آیا۔ اسلامی باتیں پڑھ کر دل کو اسلام کی روشنی سے منور کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی رد لوگا پڑھی۔ بہترین الفاظ سے سچی یہ زبردست، ہولناک داستان ڈرڈا بجسٹ کی جان ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔

☆ ☆ ☆ آصف صاحب: آپ کی کہانی کاشدت سے انتظار ہے اور گزارش ہے کہ آپ ہر ماہ قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا تجزیہ ضرور ارسال کیا کریں۔ احسان سحر میانوالی سے، اس دفعہ قدرے ہٹ کر اور مختلف انداز کی اسٹوری حاضر خدمت ہے۔ ہر کہانی اور اچھی بات میں کوئی نہ کوئی اچھا سبق موجود ہوتا ہے۔ میں نے اپنی کہانی کو سبق آموز بنانے کے لیے بہت کوشش کی ہے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔

☆ ☆ ☆ احسان صاحب: اچھی تحریریں ہمیشہ دل موہ لیتی ہیں۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامے کاشدت سے انتظار رہے گا۔ عامر ملوک راولپنڈی سے، جنوری کا شمارہ نہایت ہی خوبصورت سرورق کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ تحریریں بھی ایک سے بڑھ کر ہیں۔ تمام رائٹرز اچھا لکھ رہے ہیں۔ سب کو سلام اور مبارکباد کہیں ایک تحریر ”مسکراتے زخم“ ارسال ہے۔ امید ہے جگہ پالے گی۔

☆ ☆ ☆ عامر صاحب: نئی کہانی ارسال کرنے کے لئے شکریہ۔ آپ کے خلوص نامہ کا آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

☆☆☆



اچانک پورے علاقے میں سفید دھواں پھیل گیا اور جب دھواں چھٹا تو دیو ہیکل عجیب الخلقت مخلوق نظر آئی۔ اس مخلوق کو دیکھ کر لوگوں کا پتا پتانی ہونے لگا مگر پھر اچانک اس جگہ ایک نورانی ہالہ نظر آیا اور پھر.....

دل کو ہلا دینے والی خوف و ہشت طاری کرتی پراسراریت سے بھرپور سبق آموز کہانی

ہوش میں آ گئیں۔ درد کا احساس ہوتے ہی وہ کراہنے لگیں ان کے بازوؤں اور گردنوں میں سے جہاں جہاں رسیاں پیوست تھیں خون نکل کر جم چکا تھا۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو زبان میں پیوست سوئی کی وجہ سے اس کی تکلیف بھری چیخ ہی نکل سکی، سبھی کے منہ میں اسی طرح سوئیاں پیوست کی گئی تھیں وہ سب چہرے سے گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ لڑکیاں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگیں مگر ان کی ہر حرکت انہیں تکلیف دے رہی تھی۔

آخر انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مگر تینوں لڑکے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ ان کی کمر پر بندھے تھے اور پاؤں مضبوط رسی سے باندھ کر دی اوپر چھت میں فکس کنڈوں میں لگائی گئی تھی۔ ان تینوں میں سے ایک لڑکے نے اپنا جسم اوپر اٹھایا۔ بازوؤں کو کمر سے اوپر بندھے پاؤں تک لے آیا اور جسم کو کمان کی طرح موڑتے ہوئے بازوؤں کی رسیاں منہ تک لے آیا۔ دانتوں سے رسی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کی مگر زبان میں لگی سوئی تکلیف دینے لگی۔ اس نے

**شہر** سے کوسوں دور ویران جنگل کے بیچوں بیچ وہ غلت کھنڈرات اس ویرانے کی پراسراریت کو بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ اس طرف آنے والے سیاح اور شکاری وہاں کے ویرانوں میں گم ہو جاتے تھے۔ وہاں پر گم ہونے والے لوگوں میں سے اب تک کسی کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کافی وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ جو کہیں سے صحیح سالم کمروں کی شکل میں تھے تو کہیں گری ہوئی دیواریں اور چھتیں۔ وہاں پر ہر وقت موت کا ساسکت چھایا رہتا تھا۔ وہاں پر سانپ پھوؤں اور دیگر حشرات الاراض کی بہتات تھی۔ اس کھنڈر میں کسی ذی روح کا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔

اس کے باوجود اس کھنڈر کے ایک کمرے میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ پانچ انسان تھے وہ جن میں سے دو عورتیں اور تین مرد پانچوں کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ مرد لٹے لٹکے ہوئے تھے اور ان کے سروں کے عین نیچے کلڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا جبکہ دونوں لڑکیاں ٹائیلوں کی رسیوں سے بندھی سیدھی کھڑی تھیں۔ پانچوں اس وقت بے ہوش تھے۔ پہلے تینوں لڑکوں کو ہوش آیا پھر دو تھے وقفے سے وہ لڑکیاں بھی



کراہتے ہوئے منہ کو پورا کھولا زبان باہر نکالنے کی کوشش کی۔ انہیں یہاں قید کرنے والے کسی بھی وقت آسکتے تھے۔ یہی موقع غنیمت تھا۔ اس نے تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گانٹھ کھولنا شروع کر دی۔ جیسے جیسے گانٹھ کھل رہی تھی۔ اس کے منہ سے خون کی روانی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ مگر اس کے ارادوں سے لگتا تھا وہ ہر قیمت پر یہ رسیاں کھول کر خود کو آزاد کرنا چاہتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ اس نے اپنے پاؤں کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ ابھی وہ ایک گانٹھ ہی کھول رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو خوف سے اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اس نے اپنی ساری توجہ پاؤں میں بندھی رسیوں پر مرکوز کر دی۔ وہ اور زیادہ تیزی سے انہیں کھولنے لگا۔ مگر تینوں لڑکوں کے نیچے پڑے لکڑیوں کے انبار میں یکدم آگ بھڑک اٹھی۔

بال جلنے کی بو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ وہ تینوں تکلیف سے بچ رہے تھے لڑکیاں بھی یہ منظر دیکھ کر چیختے جا رہی تھیں۔ اندر آنے والوں کی توجہ لڑکیوں کی طرف ہوئی تو انہوں نے اپنے ہاتھوں کا رخ تبدیل کیا ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ آگ اگلنے لگے۔ لڑکیوں کے جسموں کو بھی آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ان کے لرزہ خیز چیخوں سے پورا کھنڈر لرز اٹھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوا تھا جو آگ اور پتھر کی پرستش کرتا تھا۔ اسے بھی اپنے والدین سے یہی تربیت ملی تھی کہ وہ ان پتھروں اور آگ کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ وہ یہ کام کرتا تھا مگر اس کا دل اس بات پر مطمئن نہ تھا کہ یہ بے جان چیزیں اس کی کوئی مشکل حل کر سکتی ہیں۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں پر چل تو رہا تھا مگر صرف حالات کے پیش نظر۔ اس کی سوچ اپنے بڑوں سے بہت مختلف تھی۔ کبھی کبھی وہ آسمان پر چھائے ستاروں کو دیکھتا تو سوچتا کہ یہ خوبصورت کہکشائیں یہ پہاڑ، چاند، سورج اور طرح طرح کی

نعمتیں کیا اس آگ کی مہربان منت ہیں؟ اور اس کا دماغ جواب دیتا۔ ”نہیں بالکل نہیں۔“

اسی سوچ میں پڑے اسے گھنٹوں گزر جاتے اور پھر دل کو منور کرتی ایک نورانی روشنی ہر طرف پھیل جاتی تو وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔

وہ اپنے قبیلے والوں کو چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ یہ جنہیں تم پوجتے ہو یہ اس لائق نہیں مگر پھر بہت سے وہم اسے ایسا کرنے سے روک دیتے۔

انہی دنوں اسے ایک اہم کام سونپا گیا تب اسے پتہ چلا کہ وہ 22 سال کا ہو چکا ہے۔ ان کے قبیلے کا یہ رواج صدیوں سے چلتا آ رہا تھا کہ جو بچہ 22 سال کی عمر کو پہنچتا اس کو وہاں کی فوج میں شامل کر لیا جاتا۔ دنیا میں پھیلے ایسے لوگ جن کو وہ جادو گروں یا ساحروں کے نام سے جانتے تھے ان کا خاتمہ ان کا مشن تھا۔ اس وقت بھی وہ مراقبہ کی حالت میں تھا جب اسے سردار کے سامنے پیش ہونے کا بلاوا آیا۔

تھوڑی دیر میں وہ سردار کے روبرو کھڑا تھا۔ ”تم جانتے ہو کہ تم بائیس سال کے ہو چکے ہو۔ ہم تمہیں مشن پر بھیجا جاتے ہیں، لیکن تمہارے ذہن میں کوئی سوال ہے یا پھر تم تیار ہو؟“ سردار نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔

”میں تیار ہوں جناب۔“ اس نے اپنا سر خم کیا۔

”شاباش، میناش مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ سردار نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کمرے کے درمیان میں ایک ڈھانکی فٹ کا گول چبوترہ تھا جس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ سردار نے اپنے ہاتھ مخصوص اعداد میں چبوترے کے گرد لہرائے تو اس شیشہ پر ایک دم دھواں چھانا شروع ہو گیا۔ دھواں چھٹنے کے بعد شیشہ کے اندر ایک منظر ابھرا۔

”ادھر آؤ میناش۔“

میناش چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شیشے کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ شہک گیا۔ وہ ایک لمبی سفید داڑھی والا شخص تھا۔ جو شیشہ ہاتھ میں لے کر آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے

سے نور ہی نور پھوٹ رہا تھا جس کی روشنی وہ کبھی کبھی اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔

پھر منظر بدلا ایک سولہ سترہ سال لڑکی اپنے آگے کوئی کتاب رکھے منہ ہلاتی تھی اس کی آواز وہاں سنائی نہیں دے رہی تھی۔

”یہ دونوں افراد تمہارا مشن ہیں۔ ان کو اٹھا کر یہاں لانا ہی تمہارے ذمہ ہے۔ ان کو یہاں کیسے لانا ہے یہ تمہاری اپنی ذہانت پر منحصر ہے۔ ایک بات یاد رکھنا یہ لوگ کمال کے ساحر ہوتے ہیں۔ بے شک ہماری طاقتیں ان سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں مگر یہ لوگ اپنے پھوٹے سے جادو سے تمہیں بے بس کر سکتے ہیں۔ پھر ہم بھی تمہاری مدد نہیں کر سکیں گے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟“ سردار نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ جی۔

”اب جاؤ اپنی تمام طاقتیں اس مشن پر لگا دو۔ اور ایک بات ذہن میں رکھنا اگر تم ناکام لوٹے تو موت تمہارا مقدر رہے گی۔“ سردار نے انتہائی سربلجھ میں کہا۔

میناش لمبے لمبے گھرنا کمرے سے نکل گیا۔

”یہ کیا حماقت ہے لاماش اپنے بیٹے سے تم اس طرح پیش آ رہے ہو؟“ میناش کے جاتے ہی ساتھ بیٹھی عورت نے زبان کھولی۔

”بے شک وہ ہمارا بیٹا ہے۔ مگر اسے بھی تو یہ علم ہونا چاہئے کہ قانون سب کے لئے ایک جیسا ہے۔ اور میں اپنے مشن کو پورا کرنے کے لئے یہ نہیں دیکھوں گا کہ کون میرا شہید دار ہے، میرا مقصد صرف اور صرف ان علاقوں سے درس دینے والے مسلمانوں کا خاتمہ ہے جب تک اس علاقے میں ایک بھی ایسا مسلمان ہے میرا مشن جاری رہے گا۔“ اتنا کہہ کر سردار اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

طلعت شاہ اس شہر میں بہت مشہور و معروف تھے۔ یہ شہر انہیں اونچے اونچے پوسٹرز یا ٹی وی پر شائع کردہ اشتہار سے نہیں ملی تھی بلکہ یہ تو ان کی خوشبو تھی جو اس شہر سے نکل کر دوسرے شہروں میں بھی

پہنچ رہی تھی۔ وہ پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ جمعہ کے جمعہ وہ اپنے گھر میں درس دیا کرتے تھے جس میں محفل مراقبہ اور تحلیل نفسی پر پریکٹیکل بھی کئے جاتے۔ اسم ذات اللہ کا ذکر کیا جاتا۔ اس روحانی اور وجدانی محفل میں شرکت کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔

”انسان کا کوئی فرقہ نہیں انسان انسان ایک سچا مسلمان ہونا چاہئے۔ فرقہ داریت سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور انسان اپنے اصل مقصد کو بھول بیٹھتا ہے۔“

وہ مغرب کی نماز پڑھ کر آ رہے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے کسی کے چلنے کا احساس ہوا انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ شام کا دھندلا آہستہ آہستہ سیاہ چادر اوڑھ رہا تھا۔ ایک موٹے سے مڑتے ہی سامنے کچھڑ تھا۔ یہاں پر اکثر ناہن سیورتج سٹم ہونے کی وجہ سے پانی کھڑا رہتا تھا۔

شاہ صاحب نے شلوار کو اوپر کیا اور کچھڑ سے بچتے ہوئے گزرنا چاہتے تھے کہ جانے کہاں سے ایک وزنی پتھر اس کچھڑ میں آگرا۔ شاہ صاحب کے سارے کپڑے کچھڑ سے لت پت ہو گئے۔ بیٹھی ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کے جسم میں انگارے سے بھر گئے ہیں کوئی ان کے وجود پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاہ صاحب نے بہت جدوجہد کی مگر آخر کار ان کا ذہن اندھیروں میں ڈوبنا چلا گیا۔

جب انہیں ہوش آیا تو ان کے جسم پر لباس برائے نام تھا اور سارا جسم گندگی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ایک کرسی پر بندھے پڑے تھے۔ اور ان کی زبان میں سوئی پیوست تھی۔

میناش سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور سردار اندر داخل ہوا۔ ”شاباش بیٹا شاباش! تم نے کمال کر دیا۔“ سردار لاماش نے بیٹے کو سراہتے ہوئے کہا۔

”مگر اس کے جسم پر گندگی کیوں مل دی تم نے؟“ سردار نے حیرانگی سے پوچھا۔



”میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ جب اس شخص کے کپڑوں یا جسم پر گندگی ہوگی ہماری خفیہ طاقتیں اس پر اثر کریں گی۔ دوسری صورت میں ہم لوگ اس کے نزدیک بھی نہیں جاسکتے ہیں، میں نے راستے میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکا۔ اس لئے میں نے اس کے سارے جسم پر گندگی مل دی ہے۔“ میناش نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

”بہت خوب، بیٹا! یہ ہی تو ہوتا ہے ان کا جادو کہ اتنے طاقتور ہونے کے باوجود ہم ان کا کچھ نہیں لگاڑ سکتے۔“ اب تم جاؤ کوئی کام ہوا تو ہمیں بلوایا جائے گا۔“ سردار نے نہایت خوشی سے کہا۔

میناش کے جانے کے بعد سردار نے ایک طرف پڑا چمکدار خنجر اٹھایا اور شاہ صاحب کی گردن پر پھیر دیا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ گرم گرم خون کے چھینٹے لاماش کے منہ پر پڑے تو اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں شاہ صاحب کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔

طلعت شاہ گوگم ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا ان کے چاہنے والوں میں کافی دولت مند لوگ بھی تھے جنہوں نے شاہ صاحب کی تلاش پر کافی خطرہ نہیں خرچ کیا مگر ان کا نشان کہیں نہ ملا۔ رووہوکر ان کے گھر والوں نے بھی صبر کر لیا۔ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ مریم، گل سے چھوٹی تھی اور ایم اے اسلامیات کر رہی تھی۔ جبکہ گل ایک معمار تھا اس کا شروع سے پڑھنے کا دل نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ صرف مڈل کرسک اور پھر کام میں مصروف ہو گیا۔

مریم بالکل باپ پر گئی تھی یا بچوں وقت کی نماز پڑھتی تلاوت کرتا اسے بہت اچھا لگتا تھا اس کی قرأت اور شہد جیسی آواز سن کر خود گل اس کے پاس بیٹھ جاتا اور جب تک وہ تلاوت کرتی اسے ستنا رہتا تھا ہی باروہ بھائی سے کہتی ”بھیا! تم خود بھی تلاوت کیا کرو بہت سکون ملتا ہے۔“

تو وہ کہتا۔ ”ابھی بہت زندگی پڑی ہے، میں اس

راستے پر ضرور آؤں گا مگر اس طرح کہ پھر واپس نہ ہو سکوں۔ میں بندھنا نہیں چاہتا۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ میں پہلے اچھی طرح سے عیش کرنا چاہتا ہوں اور پھر جب میں اسکا جاؤں گا تو میں خود ہی دین کی طرف لوٹ آؤں گا۔“

مریم اس کی سوچ پر بہت ہیچ و تاب کھاتی اور اس کے جانے کے بعد خدا کے حضور دعا مانگتی کہ ”اے خدا اس کو صراطِ مستقیم پر چلا۔“

گل باپ کی طرح نمازی پر پڑھنا بے شک نہیں تھا مگر اسلامی انداز کی بے حرمتی بھی نہیں کرتا تھا نہ اس کو کوئی برا شوق تھا۔ اس کے تین دوست تھے۔ ناصر جو ایک منٹ کی بات کھنے میں ختم کرنا تھا۔ گلو جو خود گلوکار نماز پڑھتا تھا اور تیسرا مرزا جو اپنے بے شک محاوروں کی وجہ سے مرزا محادری کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔

”شہر ہو بھیا!“ گل ناشتہ کر چکا تھا اور کام پر نکلنے ہی والا تھا کہ مریم کی آواز پر پلپلا۔ ”مجھے رات سے کافی ڈراؤنے خواب آرہے ہیں۔ آپ یہ نقش قرآنی گلے میں پہن لیں۔“ مریم نے ڈوری میں بندھا ایک نقش گل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اوہ کیا مصیبت ہے مریم تم بھی نا؟“ اب کیا اس نقش سے میری آنے والی موت مل.....“ گل کی بات پوری ہونے سے پہلے مریم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسا تم کو گل، بابا کے لایہ ہونے کے بعد تم ہی تو ہمارا سہارا ہو۔“ مریم کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور گل سب کچھ دیکھ سکتا تھا مگر مریم کی آنکھوں میں آنسو نہیں۔ اس لئے اس نے نقش لے کر گلے میں ڈال لیا اور مریم کی آنکھوں سے نکلنے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر دیئے۔

وہ گھر سے نکلا تو تینوں دوست اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ”میاں آپ تو گلے میں تعویذ ڈال کے نکلے ہو کوئی آندھی طوفان تو نہیں آنے والا۔“ مرزا کی

نظر اس کے گلے میں پڑے تعویذ پر پڑی۔ وہ بولا۔ ”نہیں مرزا یہ چھوٹی نے دیا ہے کہتی ہے اسے پہن لو آفات مل جاتی ہیں۔“

گل کو ایک پلازہ کا ٹھیکہ ملا تھا اور اس نے وہاں مزدور مستری لگائے ہوئے تھے یہ تینوں اس کے گھر سے دوست تھے اور اس کے ساتھ مزدوری کرتے تھے۔ آج کام ختم کرتے کرتے گیارہ بج گئے جس راستے سے وہ کام پر آتے تھے وہ کافی لمبا تھا۔ اور اس وقت کوئی آٹو یا ٹیکسی بھی نہیں مل سکتی تھی سو گل نے شارٹ کٹ اختیار کیا۔ یہ راستہ ایک چھوٹے سے قبرستان سے ہو کر گزرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ قبرستان کافی بھاری ہے۔ آسب بھوت پریت کا مسکن ہے۔ یہاں لوگ صبح کے وقت بھی آنے سے کتراتے تھے۔ گل نے آسب وغیرہ کو کبھی حقیقی نہیں مانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے دھڑک قبرستان کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ ”بھسمہ.....

بھائی..... گل..... آ..... آپ..... کک..... کدھر جارہے ہیں؟“ ناصر اپنے مخصوص اسٹائل میں بولا۔ ”اپنے گھر جارہے ہیں اور کدھر جانا ہے۔“ گل نے لا پرواہ کے انداز میں کہا۔

”مگر یہ قبرستان تو آسب زدہ ہے۔“ اب کی بار گلو نے معلومات بڑھائی۔

”مجھے معلوم ہے جس کو ڈر لگتا ہے وہ واپس جاسکتا ہے۔“ گل اب قبرستان کے داخلی راستے پر پہنچ چکا تھا۔ ”میاں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی چیز ہمارے راستے میں آئی تو خنجر ہے میرے پاس۔“ مرزا نے پان کی پیک چھینکی اور شلوار کے نیچے کوچھپھپایا اور پھر وہ چاروں قبرستان میں داخل ہوئے۔

ابھی وہ قبرستان کے وسط میں تھے کہ انہیں اپنے پیچھے سے ”چمن چمن“ کی آواز آنے لگی ایسا لگتا تھا کہ کوئی ان سے چار قدم پیچھے چل رہا ہے۔ پہلی بار گل، کو بھی پسینے آنے لگے۔ پھر وہ آواز قریب آئی اور ان کے پہلوؤں سے ہوتی ہوئی گزرتی۔ چاند کی مدھم روشنی میں بھی اس کا اجلا سراپا صاف نظر آرہا تھا، زرق برق

لباس میں ملبوس وہ ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے کافی خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں میں پائلیں تھیں جس کی وجہ سے چمن چمن کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ لڑکی ان کے آگے چلتی ہوئی ایک دم پلٹی ایک اداسے ان چاروں کو دیکھا اور پھر منک منک کر چلنے لگی۔ ”چودھویں کا چاند ہوا یا آفتاب ہو۔“ گلو نے اپنی بے سری آواز سے ”رفیع صاحب“ کو شکست دینے کی کوشش کی۔

لڑکی کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی بھی اس کی طرح خوبصورت تھی۔ اچانک پان کی پیک چھینکتے ہوئے مرزا کی نظر لڑکی کے پاؤں پر پڑی تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ”گل میاں! تم نے بھی ”بھاگے پاؤں اٹنے والا محاورہ سنا ہے۔“ مرزا نے گل کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

گل اس لڑکی کے حسن میں محو تھا مرزا کی بات سنی ان سنی ہو گئی۔ کبھی تو سیدھا بول لیا کہ مرزا جی ”اٹلے پاؤں بھاگنا ہوتا ہے۔“ ”بھاگتے پاؤں اٹلنا نہیں۔“ گلو نے صبح کی۔

”آرے ذرا اس لڑکی کے پیروں دیکھو۔“ مرزا گلو سے مخاطب تھا گل بھی ان کی بات سن کر لاشعوری طور پر اس لڑکی کے پیروں دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا ہے پیروں کو؟“ گلو نے اس کے پاؤں گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ تیرمہ نیچے سے اٹتی ہیں مطلب پاؤں اٹلے ہیں اب سمجھ آئی؟“ مرزا نے ڈرامائی انداز میں سرگوشی کی۔

ناصر جو مرزا کی باتیں سمجھ نہیں پا رہا تھا اچانک اونچی آواز میں بولا۔ ”بب..... بب..... چاری..... کک..... کو..... پ..... پ..... پ..... اس کا جواب سن کر تینوں نے اپنی ہنسی کو بمشکل کنٹرول کیا۔

وہ لڑکی یکدم پلٹی تو اس کی شکل کافی خوفناک ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ان چاروں کے قریب ہوتی



جاری تھی۔ ”گلتا ہے باتوں کے بھوت لاقوں سے نہیں مانیں گے۔“ مرزا اس موقع پر بھی محاورے کی ٹانگ توڑنا نہ بھولا تھا۔

”مم مجھے سمجھ نہیں آرہی..... کک..... کک..... تیت..... تم اتنا..... ڈو..... ڈو..... کیوں رہے ہو۔“ ناصر نے حیرانگی سے سوال پوچھا۔

”ابے گھامڑا اس کے پاؤں اٹے ہیں مطلب یہ چڑیل ہے۔“ گلو نے اس کی گدی میں چیت رسد کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ج..... چڑیل۔“ ناصر کی گھٹکی بندھ گئی۔

چڑیل سید حامد زکی طرف آ رہی تھی اب ناصر کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی اور اس کی خوفناک شکل دیکھ کر وہ خوف سے جھنجھٹا جا رہا تھا۔ ”قبرستان کے خارجی راستے کی طرف بھاگتو۔“ گل نے چلا کر کہا اور خود چڑیل کی طرف بڑھا جو مرزا کی گردن قابو کر چکی تھی۔ گل نے جانتے ہی اس کے بال پکڑے اور ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا۔ چڑیل نے درد سے چیخنے ہوئے مرزا کی گردن چھوڑ دی۔ مرزا نے موقع غنیمت جانا اور شلوار کے نیچے میں آڑے خنجر پراپنی گرفت مضبوط کی۔ ایک جھٹکے سے خنجر باہر نکالا اور بہادر بننے کی جتو میں اپنا ازار بند کاٹ بیٹھا۔ پتہ تب چلا جب شلوار تر کر پاؤں پر جا گری۔

چڑیل نے ایک زبردست جھٹکا اپنے بالوں کو دیا تو گل اڑتا ہوا اس کے سر سے ہوتا سامنے جا گرا۔ چڑیل کے دونوں ہاتھ لمبے ہونے لگے۔ ایک مرزا کی طرف اور دوسرا گل کی طرف۔

مرزا اپنا ٹوٹا ازار بند جوڑنے میں مگن تھا جب چڑیل کا ہاتھ قریب آیا تو جان بچانے کے لئے بھاگا۔ مگر اس کا ہاتھ مرزا کی شلوار پر پڑ چکا تھا۔ مرزا نے عزت پر جان کو ترجیح دی اور شلوار وہیں چھوڑ کر قبرستان کے خارجی راستے کی طرف بھاگا۔ چڑیل کا دوسرا ہاتھ گل کی گردن پر پڑ چکا تھا اور وہ اسے اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ گل اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت جدوجہد کر رہا تھا۔ اسی کھینچنا ثانی میں جانے کب گلے

میں پڑا نقش باہر آیا اور اس سے منعکس ہوتی سنہری کریمیں چڑیل کی طرف بروہیں گل کو واضح نظر آ رہا تھا کہ قرآنی نقش کے حروف سنہرے ہو کر چڑیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جیسے ہی یہ حروف چڑیل کے جسم سے بچے ہوئے اسے آگ نے پکڑ لیا، چڑیل کی چیخیں اتنی بھیاں تک تھیں کہ مجبوراً گل کو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنی پڑیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ گل نے تعویذ کو چوما۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ اب ہم آئندہ ادھر سے نہیں گزریں گے۔“ گلو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”نہیں اب وہ ختم ہو چکی ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں میری آنکھوں کے سامنے اسے آگ لگ گئی تھی اور یہ سب اس نقش کی بدولت ہوا ہے۔“ گل نے انہیں خوف زدہ دیکھا تو تسلی دی۔

چلو اچھا ہوا۔ ”خس کم جہاں پاک“ مرزا بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

”تت تم بھی..... بہت سر..... نکال رہے تھے کہ.....“ چچ..... چودھویں کا..... چاند..... ہو..... یا..... آف..... آفتاب..... ہو..... اب..... گ..... گاؤ..... سب..... ب..... بولتی بند ہو گئی کیا؟“ ناصر نے گلو سے کہا جو ابھی تک کانپ رہا تھا۔

اس دن سے گل پانچ وقت کا نمازی ہو گیا، وہ فارغ وقت میں اپنی بہن مریم سے قرآن کی تعلیم بھی لینے لگا۔ مریم کے پاس بہت وسیع علم تھا، وہ ہر آیت کا ترجمہ اور تفسیر کافی تفصیل سے بتاتی۔ اس کی باتیں سن کر گل کے اندر چھوٹی ایمان کی نازک سی کوئیل کو خدا ملتی اور وہ آہستہ آہستہ ایک بڑے پودے کی شکل اختیار کرنے لگی۔

آج مریم کافی پریشان نظر آ رہی تھی اس کی ماں سکیڑنے اس سے بہت پوچھا مگر وہ سر درد کا بہانہ کر کے ٹال گئی۔ گل بھی دو تین مہینے کے لئے فارغ تھا۔ جب وہ بہن سے قرآن کا درس لینے بیٹھا تو اسے پریشان

اور بے چین پایا۔ ”کیا بات ہے مریم تم مجھے کافی پریشان لگ رہی ہو؟“ گل نے استفسار کیا۔ تو مریم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ گل بھی اس کی حالت دیکھ کے کافی گھبرا گیا تھا۔

”بھیا میں تعلیم چھوڑنا نہیں چاہتی میرے امتحانات میں دو ماہ رہ گئے ہیں مگر میرا کالج جانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔“ مریم نے روتے ہوئے مہم سے انداز میں بتایا۔

”ارے پلگ روتی کیوں ہے مجھے صاف صاف بتا۔“ گل نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

”وہ لڑکا شہر کے بہت بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔ وہ مجھے کالج میں داخلے کے دن سے پریشان کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ کل دوپہر کے بعد فلاں ہوٹل میں اگر تم نہ آئیں تو میں سب کے سامنے تمہاری عزت.....“ اتنا کہہ کر مریم پھر سے رونے لگی۔ یہ سب سن کر گل کا خون کھولنے لگا۔ ”فکر نہ کرو تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔ میں کل خود تمہارے ساتھ کالج جاؤں گا تم مجھے وہ لڑکا دکھانا۔“ گل نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو وہ گل کے سینے میں چھپ گئی۔

اگلے دن گل اسے چھوڑنے کالج گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی چار پانچ لڑکے ان کی طرف بڑھے۔ ان کا پہناوا اور ٹیکٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ یہاں پڑھنے کے بجائے لوفری کرنے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شرٹس کے بٹن کھول رکھے تھے۔ چروں پر طرح طرح کی کریمیں لگائی ہوئی تھیں اور بال عورتوں کی طرح بڑھے ہوئے۔ ”کیا بات ہے بلبل! ہم میں کون سی کمی دیکھی جو اپنے اس عاشق کو ساتھ لے آئی ہو۔“ ان میں سے لمبے قد کے لڑکے نے انتہائی بے ہودہ انداز میں کہا۔

مریم نے بھائی کے بازو پر گرفت مضبوط کر لی۔ گل اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ”ارے عزت! دیکھو تمہیں کیسے گھور رہا ہے

جیسے کھا جائے گا۔“ لمبے لڑکے کے ساتھ کھڑے ایک نے کہا۔

گل ان کی سائیڈ سے ہوتا ایک طرف بڑھ گیا مریم کو کلاس میں چھوڑ کر وہ واپس آیا تو سیدھا ان پانچوں کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنی ٹھٹھیاں زور سے جھینچ رکھی تھیں۔ لمبے قد والے کے سامنے جا کر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا ہو گیا۔

”اے گھونچو! اگر تیرا دل اس پر آ گیا ہے تو تجھے بھی اس کا ٹیٹ کرادوں گا۔ مل کر کھانے سے اتفاق بڑھتا ہے۔“ لمبے قد والے نے اتنی ہی بات کی تھی کہ جیسے گل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گل کا مڑا ہوا گھٹنا اس کی ٹانگوں کے درمیان پڑا تو وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔ گل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اس نے اچھل کر پانی کہنی اس کی کمر میں رسید کی تو وہ زمین پر دھول چاٹنے لگا۔ دوسرے نے یہ دیکھا تو اپنی ہیٹ نکالی اور گل کی کمر پر مارنا چاہتا تھا کہ گل جو اس طرف سے غافل نہیں تھا مڑا اور اس کا وار اپنے ہاتھ پر روکا ایک جھٹکے سے ہیٹ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس لمبے لڑکے کے باقی دوست بھی آگے بڑھے مگر اس کے بعد گل نے انہیں کوئی حملہ کرنے کا موقع نہ دیا اور بیٹوں گھونٹوں اور ٹکڑوں سے انہیں ادھ موا کر دیا۔ پانچوں لڑکے تھوڑی ہی دیر میں زمین پر پڑے کر رہے تھے۔

گل نے لمبے قد والے کو گریبان سے پکڑا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا۔ ”وہ لڑکی میری بہن ہے، آئندہ اگر اس کی طرف دیکھا بھی تو آنکھیں نوچ لوں گا۔“ پھر وہ اسے آخری ٹھٹھا مار کر کالج سے نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

”تمہارا دوسرا نشانہ ہے لڑکی ہے غور سے دیکھ لو اسے اور اٹھا کر یہاں لے آؤ۔“ سردار لاماش نے میناش کو بلایا اور شیشے میں اسے مریم کا عکس دکھایا۔ میناش کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ اس نے سردار سے اجازت لی اور پلک جھپکتے ہی مریم کے گھر آ موجود ہوا۔



مریم اس وقت گل کو پڑھانے میں مگن تھی۔

میناش ان دونوں کی نظروں سے اوجھل ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس لڑکی کے چہرے سے وہی روشنی پھوٹ رہی تھی جو کبھی کبھار میناش کے اندر کے اندھیروں کو چھوڑ ڈالتی تھی، وہ چند منٹ کے لئے اس کے چہرے کو نکلتا رہا۔ قرآن پاک کے مقدس الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرانے لگے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جس سچائی کو وہ تلاش کرتا رہا ہے وہ اسے یہیں ملے گی۔ مریم کی آواز اس کے اندر بھونچال پیدا کر رہی تھی۔

”خدا نے یہ آسمان اور زمین بنائے۔ پھر اس آسمان میں برج مقرر کئے دن اور رات کا بنانے والا وہی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اور ہدایت دنیا بھی اللہ کے اختیار میں ہے، وہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔

یوم حساب کو جب کافروں کے سامنے ان کا اعمال نامہ رکھا جائے گا اور انہیں اللہ کی طرف سے دکھ دینے والا عذاب ہوگا تو وہ کہیں گے کہ ہائے شامت ہمیں ہمارے بڑوں نے کہاں پھنسا دیا تھا۔ کاش ہم بھی ہدایت پانے والوں میں ہوتے۔“

مریم بولے جارہی تھی اور میناش کی اندر کی دنیا بدلتی جارہی تھی۔ یہی کچھ تو وہ سوچتا رہا تھا۔ ان سوالوں کی ہی تو کھوج تھی اسے۔ ابھی تو نور کی ایک کرن اس کے اندر پھوٹی تھی وہ پورا نور اپنے سینے میں سیٹھنے کے لئے بے چین تھا۔ مگر اس لڑکی نے وہ مقدس کتاب بند کر دی۔

مسجد سے مغرب کی نماز کا بلا وہ آ رہا تھا گل وہاں سے اٹھا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ مریم نے جائے نماز بچھائی اس کی ماں سیکھنے بھی نماز پڑھ رہی تھی۔

وہ حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھنے جا رہا تھا وہ آج تک آگ کو بوجہ کرتا رہا تھا مگر یہ لوگ کسی ان دیکھی ہستی کو بوجہ کر رہے تھے وہ اس سب کو جان لیتا چاہتا تھا۔ جو طہانیت ان لوگوں کے چہرے سے ظاہر ہوئی تھی وہ خود محسوس کرنے کے لئے بے چین

تھا۔ مگر اس کے لئے اسے خود کو ظاہر کرنا پڑتا۔ اس نے چند روز کے لئے وہیں رہنے کا پروگرام بنایا۔ اور اس گھر کے صحن میں لگے۔ ایک درخت پر اپنا بیسرا کر لیا۔

وہ روزانہ فجر کے وقت اور عصر کے بعد اس لڑکی کی میٹھی آواز سنتا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل کے اندھیرے اجالے میں بدلنے لگے۔ وہ خود ان لوگوں جیسا بنانا چاہتا تھا مگر اسے علم نہیں تھا کہ ان جیسا بننے کے لئے اسے کیا کرنا پڑے گا۔ اس لئے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ کب ان لوگوں پر اپنا آپ ظاہر کرے پھر قدرت نے اسے یہ موقع دے ہی دیا۔

گل اس دن فارغ تھا اور جہاں راج مستری بیٹھتے تھے وہاں صبح صبح بیٹھا تھا جن لوگوں نے معاری کا کام کروانا ہوتا تھا وہ یہیں سے راج مستریوں کو لے جاتے تھے۔ ایک چچھائی کا آ کر گل کے عین سامنے رکی، اس میں سے ریسائے لباس میں ملبوس ایک شخص اترا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہارا نام گل ہے۔“

”جی میرا ہی نام گل ہے۔“ گل نے جواب دیا۔ ”آؤ تم سے کام ہے۔“ تو وارو نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ گل اس کے ساتھ فرٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ابھی گاڑی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ بے ہوش کے اندھے کونوئیں میں گرنا چلا گیا۔ اس کو ہوش آیا تو اس کے ہاتھ پاؤں پشت پر بندھے تھے اور وہ ایک گھڑی کی صورت کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ ہوش آنے کے کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی شخص منہ میں سگار دبائے اندر داخل ہوا ایک طرف پڑی کرسی بھیج کر وہ اس پر بیٹھ گیا۔ لگتا تو نہیں کہ تم نے اکیلے پانچ جوان لڑکوں کی دھلائی کی ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا ہوتا تو اتنی آسانی سے ہمارے قابو میں نہ آتے۔“ سگار کو اپنے پاؤں تلے ملتے ہوئے وہ شخص گویا ہوا۔

”دھوکے سے وار کر کے کہتا ہے کہ میں آسانی سے قابو آ گیا، ایک بار مجھے کھول پھر دیکھ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔“ گل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”بہت خوب رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ جن لڑکوں کو تم نے پٹیا ان میں سے ایک میرا بیٹا تھا۔ تم نے عظمت بیک کے بیٹے پر ہاتھ اٹھایا ہے پورا شہر میرے نام سے کانپتا ہے۔ تجھے تیرے کئے کی سزا ملے گی اور وہ ہے موت، ایسی موت کہ تیری روح بھی کانپ اٹھے گی۔ ڈال دو اسے پراس میں۔“ اس شخص نے کہا۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ کھلا، دس بارہ افراد اندر داخل ہوئے جو چہروں سے چھپے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور کمرے سے باہر آئے۔ گل نے دیکھا یہ کوئی اسپنگ فیکٹری تھی جس میں دھواں گنا تھا۔ کپاس کو پی پراس سے گزار کر مشینیں دھانے میں تبدیل کرتی تھیں۔

اچانک ہی مشین چلنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ان لوگوں نے اسے اٹھایا اور مشین کے پاس لائے۔ گل نے بہت جدوجہد کی مگر ہاتھ پیر بندھے ہونے کی وجہ سے خود کو بچانہ نہکا اور روئی دھنکنے والی اس مشین میں داخل کر دیا گیا بے اختیار اس کے منہ سے کلمہ طیبہ کا ورد شروع ہو گیا۔

گل کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر رونما ہوا۔ ایک حسین و جمیل نوجوان کہ ایسا نوجوان اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا اس کے پاس کھڑا تھا۔ یہ ایک وسیع میدان تھا عصر کے وقت کی ڈوبتی روشنی سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان شہزادوں جیسا لباس زیب تن کئے اس کے سر ہانے بیٹھا ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھا۔ اسے جان کنی کی تکلیف محسوس ہوئی تو اس کو بصورت نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس جوان کی مسکراہٹ میں وہ اپنی تکلیف بھول گیا اور خود بھی مسکرا کر اس کے چہرے کو مسکنے لگا۔ پھر ایک دم ہی اس کے تمام احساسات پر تاریکی چھائی چلی گئی۔ گل کی ہڈیوں اور گوشت کا خون سے بھرا مٹخو بہ مشین کی دوسری طرف گر رہا تھا۔

گل کو گھر سے نکلے آج دوسرا دن تھا اور وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ ماں اور بہن کافی پریشان تھیں۔

”بیٹا مریم! میرے دل میں ہول اٹھ رہے ہیں پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گل نے کوئی رات باہر گزاری ہو۔ تم جانتی ہو تمہارے بابا بھی اسی طرح تم ہو گئے تھے مگر میں اپنے بیٹے کو کونسا نہیں چاہتی گل کے ہنا میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“ سیکھنے نے روتے ہوئے اپنا دھڑکا بیٹی کو بتایا۔

”ماں وہ میرا بھائی ہے اس کے ہنا میں بھی کیسے جی سکتی ہوں؟ خدا خیر کرے اور اسے واپس لے آئے۔“ مریم بھی رو رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور گل اندر داخل ہوا۔ ”خیر تو ہے یہ ماں بیٹی آج کس خوشی میں گلے مل رہی ہیں۔“ گل نے دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

”بھیا۔“ اتنا کہہ کر مریم دوڑ کر گل سے لپٹ گئی۔ ”ارے کیا ہوا تم لوگوں کو روکیوں رہے ہو۔ وہ تو مجھے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا اور میں بتا نہیں سکا۔“ گل نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا گل، میں تم دونوں کو دیکھ کر زندہ ہوں۔ اگر تم میں سے کسی کو کچھ ہو گیا تو میں مرجاؤں گی۔“ سیکھنے نے لاڈ بھرے لہجے میں سرزنش کی۔

”آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا ماں۔“ گل نے ماں کے آنسو صاف کئے مریم بھی چپ ہو چکی تھی۔

عصر کے بعد دونوں بہن بھائی قرآن پاک لے کر بیٹھ گئے۔ مریم نے اسے پڑھانا شروع کیا۔ وہ آیت کی تلاوت کرتی اور پھر اس کا ترجمہ کر دیتی۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 49 سے 52 کا ترجمہ و تفسیر بیان ہو رہی تھی۔ گل سر جھکائے بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ مریم کی شہد بھری آواز تلاوت اور ترجمے سے اس کے اندر چھائے غفلت کے پردوں کو چاک کر رہی تھی۔

”اور کہتے ہیں کہ جب ہڈیاں بوسیدہ اور چور چور ہو جائیں گی تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے۔ کہہ دو کہ خواہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک پتھر اور لوہے سے بھی زیادہ سخت ہو۔ جھٹ کہیں



گے کہ بھلا ہمیں دوبارہ کون جلائے گا؟ کہہ دو کہ وہی تم کو جس نے پہلی بار پیدا کیا۔ تو تعجب سے سر ہلانے لگے اور پوچھیں گے کہ ایسا کیا ہوگا کہ وہ زندہ امین ہے کہ جلد ہوگا۔“

مریم ابھی اتنا ہی ترجمہ کر سکی تھی کہ گل کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”کیا ہوا ہے بھیا! روتے کیوں ہو؟“ مریم نے حیرانگی سے کہا۔

”اپنی اور ان لوگوں کی قسمت پر رور ہا ہوں جو حق سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔“ گل نے خود کو سنبالتے ہوئے کہا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ گل نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

”پوچھو۔“

”میرا ایک دوست ہے وہ بے دین ہے مگر اسے ہمارا دین پسند آ گیا ہے وہ ہمارے دین میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ کیا کرے؟“ گل نے ٹھہر ٹھہر کر سوال کیا۔

”جزاک اللہ۔ اسلام ایسا مذہب ہے جو اتنا مشکل نہیں اسے کہو کہ کلمہ طیبہ سچے دل سے پڑھے اور جن کاموں سے ہمارا مذہب روکتا ہے وہ چھوڑ دے بس۔“ مریم نے اسے مسلمان ہونے کا ذریعہ بتایا۔

”کلمہ طیبہ کیسے پڑھے گا وہ؟“ گل نے بے چینی سے پوچھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں گل، کلمہ طیبہ بھلا کیسے پڑھا جاتا ہے اتنا بھی نہیں معلوم۔“ مریم نے حیرانگی سے گل کو دیکھا۔

”وہ تو مجھے معلوم ہے مگر میں یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا سر ڈھانپنا ہونا چاہئے یا نہیں۔“ گل ٹھہرا گیا تھا اور گھبراہٹ میں اس نے بات بنادی۔ مریم ہنس پڑی۔

”بہت بدھو ہوتے جا رہے ہو۔ نماز کے لئے یا تلاوت کے لئے سر کو ڈھانپنا ضروری ہے۔ کلمہ طیبہ ایسا کلمہ ہے جس میں ہم دل سے اقرار کرتے ہیں کہ ”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔“

سر ڈھانپنا جائے یا نہ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں صرف کوئی غیر مذہب سچے دل سے کہہ دے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔“ مریم نے اسے بچوں کی طرح سمجھایا۔

گل جو اصل میں میناش تھا یہی جانتا چاہتا تھا۔ اس نے دو دن پہلے جب مریم اور اس کی ماں کو گل کے لئے پریشان دیکھا تھا تو وہ گل کی تلاش میں نکل گیا تھا اور پھر اسے پتہ چلا کہ گل اب دنیا میں نہیں رہا تو وہ خود اس کی صورت لے کر یہاں چلا آیا تھا۔ اور اب جب تک اس کی زندگی تھی وہ یہیں رہنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اسلام کی ہر ادھونچ سے واقف ہوتا گیا۔ وہ اس ذات کا بہت شکر گزار تھا جس نے اسے ہدایت کا راستہ دکھایا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ قوتوں کا استعمال بھی چھوڑ دیا تھا تاکہ مریم یا اس کی ماں کو کوئی شک نہ ہو سکے۔

مگر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے مریم کے ایم اے اسلامیات کے فاضل انگریز ہو رہے تھے آج اس کا تیسرا بیچہ تھا۔ میر نے دو سال اس کے ساتھ کلاس اینڈ کرتے ہوئے گزارے تھے۔ میر کافی رئیس خاندان کا اکلوتا چراغ تھا۔ مگر کافی سلجھا ہوا اور بات مذہب لڑکا تھا۔ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا یا عشق ٹائپ کا کوئی بھی مرض، فلرٹ وغیرہ سے اسے نفرت تھی مگر یہ لڑکی اسے کالج میں داخلے کے دن سے ہی بے چین کئے ہوئے تھی۔ ننھی نگاہ، میک اپ سے عاری چہرہ اور اس کی پاکیزہ معصومیت نے میر کا دل موہ لیا تھا۔ پورے دو سالوں میں صرف تین مرتبہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکا تھا۔ وہ مکمل پردے میں ہوتی تھی۔

میر نے کافی دفعہ ہمت کی مگر اس کے سامنے کچھ بول نہ سکا۔ میر اپنا پیپر مکمل کر کے امتحانی کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ اس کو دیکھ کر گھر جانا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی نکلی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ میر نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ جانے کے لئے مڑنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر تین لڑکوں پر پڑی جو تیزی سے واش روم کی طرف جا رہے تھے یہ کالج کے انتہائی

لوفر اور بد معاش قسم کے لڑکے تھے۔ ان میں ایک لمبا لڑکا عزت بیگ جو شہر کے مافیا ڈون کا بیٹا تھا سب سے آگے تھا۔ میر کو خطرے کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔ وہ تیزی سے واش روم کے دروازے پر پہنچا وہ تینوں وہاں نہیں تھے اور لیڈر واش روم سے مریم کی گھٹی گھٹی چھین سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ انہیں شاید یقین تھا کہ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ اندر کی صورت حال دیکھ کر میر کا خون جوش مارنے لگا۔ مریم کے ساتھ وہ تینوں زبردستی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میر نے قدم آگے بڑھایا تو لمبے قد والے نے ریو اور نکال لیا۔ اس لڑکی کے چہرے پر تھوڑوں کے نشان دیکھ کر میر کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریو اور کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ ”رک جاؤ وہیں ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ عزت بیگ نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا مگر میر اس کی دھمکی کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میر سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف لڑکھا گیا۔

اسی وقت باہر سے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی ہیں تو وہ تینوں وہاں سے بھاگ نکلے تھوڑی ہی دیر میں وہاں اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز کا مجمع سا لگ گیا۔ ”کوئی اسے اسپتال پہنچاؤ خدا کیلئے۔“ مریم نے جب دیکھا کہ سبھی تماشا دیکھ رہے ہیں تو رو ہنسی آواز میں کہا۔ ان میں سے چار لڑکے آگے بڑھے میر کو اٹھایا۔ انہی میں سے ایک لڑکے کی گاڑی میں اسے ڈالا۔ مریم بھی ساتھ بیٹھی اور یہ سب اسپتال کی طرف چل پڑے۔

مریم اور میر کے گھر اس حادثہ کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور اب گل سیکنڈ اور میر کی فیملی اسپتال میں موجود تھے۔ میر کی حالت خطرے میں تھی گولی دل کے قریب لگی تھی جو نکال لی گئی تھی مگر خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ڈاکٹر حضرات ناامید تھے۔ ایک نرس آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی اور ایک پرچی میر کے والد

کو تھمائی۔ ”کہیں سے بھی اس بلڈ کا بندوبست کریں جلد سے جلد۔“ نرس نے اتنا کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میر کے والد نے بیل فون نکالا اور میر ملانے لگے مگر کافی جگہ رابطہ کرنے پر بھی بلڈ نہیں مل رہا تھا۔

اتنے میں گلو، ناصر وغیرہ بھی آگے ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے نکلا تو میر کے والد نے پرامید نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ جب تک خون کا بندوبست نہیں ہوگا۔ مریم کی جان کو خطرہ رہے گا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”آپ ہی کہیں سے بندوبست کر لیں نا، میں نے تو بہت کوشش کی مگر۔“ ”O“ اونٹیلو بلڈ کہیں سے نہیں ملا۔“ میر کے والد نے کہا۔

”کیا کہا“ ”اونٹیلو“ چاہئے وہ گروپ تو گل کا بھی ہے۔“ مریم نے سنا تو خوشی سے جیسے چیخ کر کہا۔ ”کون ہے گل؟“ ڈاکٹر نے تیزی سے پوچھا۔ ”میرا بھائی، یہ کھڑا ہے۔“ مریم نے ایک طرف کھڑے گل کی طرف اشارہ کیا۔ گل کافی تذبذب میں پڑا ہوا تھا۔

”جلدی کرو بیٹا! جس لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر تمہاری بہن کی عزت کی حفاظت کی، کیا اس کے لئے تم خون نہیں دے سکتے؟“ سیکنڈ نے گل کو تذبذب کے عالم میں دیکھا تو بولی۔

”نہیں ماں میں خون نہیں دوں گا۔“ گل کے یہ الفاظ سب پر قیامت بن کر ٹوٹے۔ ”میں کہیں اور سے خون کا بندوبست کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر گل اسپتال سے باہر جانے لگا۔ گلو وغیرہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا گل جب کہ تمہارا بلڈ گروپ اس سے ملتا تھا؟“ گلو نے اسپتال سے باہر نکلتے ہی سوال کیا۔

”یہ سب میں تمہیں نہیں بتا سکتا، اس وقت جلد سے جلد مجھے خون کی ضرورت ہے، تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ گل نے کافی غصیلے لہجے میں کہا۔ ”گل بھائی! اگر ہم آپ کے کسی کام آ سکتے



ہوں تو ضرور بتانا۔“ مرزا نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ گل اس کی بات سن کر چونکا۔ ”تم نے کبھی اپنا خون ٹیٹ کر دیا ہے؟“ گل نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں تو“ مرزا نے مختصر جواب دیا۔

گل کی خفیہ طاقتیں اس کی آنکھوں میں سمٹ آئیں اور وہ تینوں کا ٹیٹ کرنے لگا۔ آخر اس کی سرخ دہشت زدہ کر دینے والی آنکھیں ناصر پر آ کر گئیں۔ ”مل گیا۔ اڈنکلیو، ناصر مجھے تیرا خون چاہئے۔“ گل کی آواز بھی اس وقت کافی وحشت سے بھری ہوئی تھی۔

”گلگ..... گل..... بھائی..... ایسی..... دو..... درندگی..... اچھی..... نہن..... نہیں..... ہوتی۔“ ناصر نے مرزا کے پیچھے پیچھے ہوئے کہا۔

گل کا تہقہ بلند ہوا اور پھر وہ اپنی اصلی جون میں آ گیا۔ ”ارے گل بھائی مریض کے لئے خون مانگ رہے ہیں تمہارا ہر یلا خون فی کرسی نے مرنا ہے کیا۔“ گلو نے اسے جھپٹا پھر وہ واپس اسپتال آ گئے۔ ناصر کا بلڈ ٹیٹ اوکے تھا ان کی دعاؤں اور خدا کے فضل سے سیر کی جان بچ گئی۔

مگر گل کا گھریلو ماحول کافی سرد ہو گیا۔ مریم اور سکیٹ اس سے بات نہیں کرتی تھیں۔ کھانے کے وقت بھی تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے، گل اس وقت کافی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے آخر اسکا کردہ بول ہی پڑا۔ ”آپ دونوں مجھ سے ایسا سلوک کیوں کر رہی ہیں؟“

مریم کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی جبکہ سکیٹ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”یہ سوال تو تم تب کر دو جب تمہیں اپنی غلطی کا پتہ نہ ہو۔“

”کیا کیا ہے میں نے؟“ گل نے آواز نیچی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کیا۔

”جس لڑکے نے تمہاری بہن کی عزت اپنی جان پر کھیل کر بیچا تم نے اس کو ہی خون دینے سے انکار کر دیا۔“ سکیٹ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

”تم تو میرے بیٹے لگتے ہی نہیں۔“

”نہیں ایسا تم کو ماں میں تمہارا بیٹا ہوں۔“ گل باقاعدہ سکیٹ کے قدموں میں جا گرا تھا۔

”تو پھر تم نے میرے کہنے پر اسے خون کیوں نہیں دیا؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ گل نے سکیٹ کے قدموں سے اٹھتے ہوئے افسردہ انداز میں کہا۔

”تو پھر میری بھی ضد ہے جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں مجھ پر پانی کا ایک قطرہ اور اناج کا ایک دانہ تک حرام ہے۔“ سکیٹ نے کہا اور گل کے روکنے کے باوجود وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مریم کا آخری پیچہ تھا گل گھر بیٹھا قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور مریم اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازے کا کی کنڈی اور لمبے لمبے سانس لیتی دروازے سے ٹیک لگائی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گل اس کی حالت دیکھ کر اٹھا قرآن مجید کو ایک طرف مخصوص جگہ پر رکھا اور جلدی سے مریم کے پاس پہنچا۔ وہ کافی خوف زدہ تھی۔

اچانک زور زور سے دروازہ پٹا گیا۔ مریم نے خود کو دروازے پر ایسے جمالیا جیسے اس کے ایسا کرنے سے دروازہ کھٹکھٹانے والے رک جائیں گے۔ مگر اب دروازے کو دھکے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ گل یہ سب حیرانگی سے دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک ایک زوردار دھکا لگنے سے مریم گل کے قدموں میں جا گیری۔ دروازے کا ایک کواڑا کھڑکڑ زمین پر گر چکا تھا۔ گل کی نظر سامنے کھڑے بدمعاش پر جڑی جو اسلحہ ہاتھ میں لئے کھر کے اندر داخل ہو چکا تھا اس کے پیچھے پانچ مشنڈے اور تھے۔ انہی میں سے ایک چھوٹے قد والا بولا۔ ”عزت بھائی! تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے پاپا نے اس لڑکے کا کائنا نکال دیا ہے مگر یہ تو زندہ ہے۔“

”میں بھی حیران ہوں میرے پاپا جھوٹ کیوں بولیں گے پھر بھی اگر یہ اس وقت فحش کیا تھا تو اب نہیں بچے گا۔“ لمبے قد والے نے پستول کا رخ گل کی طرف کیا۔

گل نے مریم کو اٹھایا اور بولا۔ ”اماں کو لے کر اندر جاؤ۔“

مگر بھیا؟“ مریم نے اتنا کہا مگر گل نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں جانے کیا کہا تھا کہ مریم چپ چاپ اندر والے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں ماں بی بی بہت ڈری ہوئی تھیں۔ لمبے قد والے نے ٹریگر دبا دیا گل نے چپ لیا اور اس کے اوپر سے اڑتا ہوا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ عزت بیک نے مڑ جانا جا ہا مگر گل نے اسے کار سے پکڑتے ہوئے کسی کھلونے کی طرح اٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ باقی پانچ لڑکوں کے پاس رائفلیں تھیں انہوں نے جب سچویشن دیکھی تو رائفلیں سیڑھی کر کے فائرنگ شروع کر دی۔ تڑتڑکی آواز سے پورا گھر گونج اٹھا۔

گولیاں گل کے جسم کو چھید کرتی دوسری طرف نکل رہی تھیں۔ کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی مریم اور سکیٹ کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ مگر اگلا منظر کافی حیران کن تھا۔ گل نے ایک لمبا سانس کھینچ کر منہ کھولا تو اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکلنے شروع ہو گئے اس آگ نے ان پانچوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ پانچوں آگ میں جلتے ہوئے چیخے جارہے تھے۔ چیخے چیخے وہ ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکلے۔ گل بھی ان کے پیچھے تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو چھ عجیب شکلوں کے جانور نیچے اترے اور ان بدمعاشوں کو اٹھا کر اوپر جا کر غائب ہو گئے۔

گل ہاتھوں کو جھاڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو سکیٹ اور مریم اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ”کون ہو تم؟“ سکیٹ نے غصے اور ڈر کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

”میں گل ہوں آپ کا بیٹا۔“ گل نے نظریں

چراتے ہوئے کہا۔

”نہیں تم میرے بیٹے ہو ہی نہیں سکتے۔ جس طرح تم نے ان لوگوں کو جلایا ہے مجھے شک ہے کہ تم انسان نہیں ہو۔“ گل کے کندھے ڈھیلے پڑ چکے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ سچائی بتانے کا وقت آ گیا ہے۔ ”بتاؤ جلدی کون ہو تم؟“ سکیٹ نے چلا کر کہا۔

”میں ایک جن ہوں۔“ گل کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔ ”میرا نام میناش ہے۔“ اور پھر گل نے کوئی بات چھپائے بغیر سب کچھ بتا دیا۔

”کیا تمہا نے؟“ میرے شوہر کو تم اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب تو مجھے شک ہو رہا ہے کہ میرے بیٹے گل کو بھی تم نے ہی قتل کیا ہے، نام کسی دوسرے کا لگا رہے ہو۔“ سکیٹ نے اس کی تمام بات سننے کے بعد کہا۔

”نہیں ماں میں نے آپ کو ماں کہا ہے ایک غلطی مجھ سے اچانے میں ہوئی جب میں نے گل کے ابا کو اغوا کیا، میں تو اسی پر پچھتا رہا ہوں۔ گل کا قتل میں نے نہیں کیا۔“ میناش کا لہجہ کلو گیر ہو چکا تھا۔ ”جو بھی ہے تم نے میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔ ایک مہربانی کرو اس گھر کو چھوڑ دو۔ دفع ہو جاؤ ہماری نظروں کے سامنے سے۔“

”میناش نے اس وقت وہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ صحن میں کھڑے انار کے درخت پر آ بیٹھا۔ آدھی رات کو اسے لگا جیسے کچھ غلط ہو رہا ہے۔ اس نے اوپر نگاہ اٹھائی تو کالی دھند سی پورے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ وہ اس دھند کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے وہاں سے اٹھنے میں دیر نہ کی، وہ اڑتا ہوا چھت پر پہنچا۔ اس دھند میں سے ڈراؤنی شکلوں کے جن چھت پر کود رہے تھے۔

اچانک اس دھند میں لاماش کا چہرہ نمودار ہوا۔ ”تم پر بھی ان لوگوں نے اپنا جادو کر دیا میناش مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ تمہارا بھی وقت ختم ہو چکا ہے۔“ اتنا کہہ لاماش نے اپنا منہ کھولا تو آگ کا بڑا سا گولہ میناش کی طرف



بڑھا۔ مگر میناش اپنی جگہ سے چلا نکل لگا کر منڈیر پر جا کھڑا ہوا۔ ”نمبر جانیں میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ میناش نے ہاتھ کو تنبیہی انداز میں آگے کرتے ہوئے کہا۔ لاماش کے منہ سے نکلنے والا گولا چھت میں بڑا سا سوراخ کر چکا تھا۔ اسی دھماکے سے سیکینہ اور مریم کی آنکھ لگی تھی اور وہ بھی چھت پر آچکی تھیں۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو جلدی بولو۔“ لاماش کی آواز میں بجلیوں کی کڑک تھی۔ دھند میں سے بیوں کے رونے جیسی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

”آپ میرے والد ہیں میں نہیں چاہتا کہ آپ صراطِ مستقیم سے ہٹنے لگیں۔ اب تک آپ لوگ جو کرتے رہے وہ جاہلیت تھی۔ اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھر اور خود جلائی ہوئی آگ کی پوجا کرتے رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اندھروں سے نکل کر روشنی کی طرف آئیں تاکہ قیامت کے روز دوزخ کا ایندھن نہ بنیں۔“ میناش کے لہجے سے خلوص نکل رہا تھا۔

”یکواس بند کرو۔“ میناش کی بات سن کر لاماش طیش میں آ گیا تھا۔

”یہ یکواس نہیں! آپ ایک دفعہ اس مذہب میں داخل تو ہوں اگر آپ کو اس میں کوئی شبہ ہو یا کوئی بات جھوٹی ہو تو بے شک مجھے ختم کر دینا۔ اللہ کا نازل کیا کلام سننے کے بعد آپ کو علم ہو جائے گا کہ ایک سچا مسلمان.....“ میناش کی بات ادھوری رہ گئی۔

”یہ تم نہیں ان مسلمانوں کا جادو تمہارے سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کتنے ہی مسلمانوں کو پتھر کی طرح مسل ڈال۔ ہمارے نزدیک مسلمان بہت حقیر مخلوق ہیں۔“ لاماش نے طنزیہ ہنسی ہستے ہوئے کہا۔

”تو ٹھیک ہے آج میں آپ کو بتاؤں گا کہ مسلمان کیا ہوتا ہے؟“ میناش نے کہا اور منہ ہی منہ میں ”سورۃ الناس“ پڑھنی شروع کر دی مریم نے بھی اسے بتایا تھا اور خود اس کا بھی پختہ یقین تھا کہ یہ سورۃ پڑھنے سے

ہر قسم کی آفات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ لاماش نے اپنی فوج کو حیلے کا حکم دیا۔

میناش نے تین بار سورۃ الناس پڑھ کر جو اپنے اطراف میں پھونکا تو چھت پر چپے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے جو بھی اس فوج میں سے آگے بڑھتا جل کر راکھ بن جاتا۔ سیکینہ اور مریم یہ دیکھ کر سکتے میں آ گئیں۔ لاماش کی فوج آہستہ آہستہ جل کر خاک ہوتی جا رہی تھی۔ منڈیر کے پاس جیسے کوئی حصار سائبندہ گیا تھا۔ لاماش کا ہر حربہ اس حصار کے آگے ناکام ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی لاماش نے تمام فوج کو واپس چلنے کا حکم دیا اور گھر کے آس پاس چھائی دھند دور ہوتی مغرب کی طرف غائب ہو گئی۔

میناش واپس مڑا تو سیکینہ نے سوال پوچھا۔ ”کون تھے یہ لوگ اور یہ سب کیا تماشہ ہے؟“ ”یہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، میں نے آپ کو سب کچھ بتایا ہے۔ یہ جو جن مجھ سے بات کر رہا تھا یہ میرا والد ہے۔ اور یہ مریم کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔“ میناش نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ مریم کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟“

”کیونکہ طلعت شاہ صاحب کے بعد ان کی تعلیمات کو آگے بڑھانے کا فریضہ مریم انجام دے رہی ہے اور جب بھی ان لوگوں کو موقع ملے گا وہ اسے مارنے سے گریز نہیں کریں گے۔ میں بھی پہلے ان جیسا تھا مگر اللہ کی ذات کے بعد آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہدایت کا رستہ دکھایا۔“ میناش ممنون نظروں سے سیکینہ اور مریم کو دیکھ رہا تھا۔

”ماں! کیا ہم اس کو معاف نہیں کر سکتے۔ ہمارے نبی کا فرمان ہے۔ بدلہ لینے سے معاف کر دینے والا بہتر ہے۔“ مریم نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ خود سیکینہ کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ میناش اب بدل چکا ہے۔

”میں جب تک یہاں رہوں گا آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ میں آپ کو ایک بیٹا اور مریم کو بھائی بن کر دکھاؤں گا۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں

تو میں سدا آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔“ میناش نے عاجزانہ انداز میں کہا تو سیکینہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوماد اور اسے گلے لگا لیا۔ ”مجھے تم کو کبھی نہیں غلط ہی ہوتی تھی۔ آج سے تم میرے بیٹے ہو۔“ پھر وہ بیٹیوں چھت سے نیچے اتر آئے۔

تین دن بعد ہی سیکر کے گھر والے مریم کے گھر آ گئے۔ سیکر کے والد بہت اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ مگر سیکر کی ماں ان کے الگ تھی میناش بازار سے ان کے لئے لوازمات لایا تھا جس میں سے سیکر بیگم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، وہ ہر چیز کو منہ بنانا کر دیکھ رہی تھی۔ پھر نیم نے خاوند کے کان میں سرگوشی کی تو انہوں نے کھاجانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ سیکینہ بچن سے لٹی اور ان کے پاس آ بیٹھی۔ ”میرا نام ارشاد ہے اور میرا ایک ہی اکلوتا بیٹا ہے جس کو آپ اسپتال میں دیکھ ہی چکی ہیں۔ اس کا نام سیکر ہے۔“ ارشاد نے ہمید بانڈی۔

”جی میں دیکھ چکی ہوں۔“ سیکینہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بیٹی ہماری بیٹی بن جائے آپ سمجھ تو نہیں ہوں گی ناں؟“ ارشاد نے مدعا بیان کیا۔

سیکینہ کے تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس نے ہاں کر دی اچانک ہی نیم بیگم صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں آپ کو کیا سمجھا کے لائی تھی اور آپ نے کیا کر دیا؟ ذرا ان لوگوں کا اٹیٹش تو دیکھئے یہ تو بیٹی کو ٹھیک ٹھاک جینے بھی نہیں دے سکیں گے۔“ نیم بیگم نے سیکینہ وغیرہ کی پرواہ کئے بغیر اونچا اونچا بولنا شروع کر دیا۔

”میری بات تو سنو نیم بیگم! ارشد داری اٹیٹش اور دولت کی بنیاد پر نہیں ہوتی اس لڑکی سے اچھی بہو نہیں پھر نہیں ملے گی۔“ ارشاد نے نیم کو دھیسے لہجے میں کہا۔

”اس لڑکی کو کون سے سرخاب کے پر لگے

ہوئے ہیں؟“ نیم بیگم اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔ ”ادھر دیکھو! ارشاد نے نیم کی توجہ سامنے لگی طلعت شاہ کی تصویر کی طرف کرائی۔ ”مت بولو کہ یہ اسی خدا کے بندے کی بیٹی ہے جس کی دعا سے تمہیں آٹھ سال بعد اولاد ہوئی تھی۔“

نیم ایک لمحے کو تو کم صم ہو گئی مگر پھر اپنی انا پر قائم ہو گئی۔

میناش یہ سب سن رہا تھا اچانک آگے بڑھا اور بولا۔ ”آپ کو جہیز میں جو جو چیز چاہئے آپ اس کی لسٹ بنالیں۔ جتنا دل کرے لسٹ کو لمبا کر لیں کہیں بعد میں یہ نہ کہنا کہ ہم کچھ بھول گئے تھے، میں آپ کی ہر شرط پوری کر دوں گا۔“

”اے ہے! کوئی ڈاکہ مارو گے کیا؟“ نیم بیگم نے ہاتھ نہ چائے۔

”چپ کرو نیم بیگم! ارشاد صاحب کی آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے ایک ماہ کے اندر میری بنائی ہوئی لسٹ کی تمام چیزیں پوری کر لینا، فہرست تمہیں کل مل جائے گی۔ میں بھی تو دیکھوں اس دڑے میں رہنے والے لوگ ہمارے اٹیٹش کا مقابلہ کیسے کرتے ہیں؟“ نیم بیگم نے زہریلے انداز میں کہا اور دونوں میاں بیوی وہاں سے چلے گئے۔

”یہ تم نے کیا کیا بیٹا! اگر تم یہ چیزیں اکٹھی کر بھی لو گے تو ان کو مریم برتنے سے تو رہی۔“ سیکینہ نے مبہم انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم اپنی جادوئی طاقتوں سے کسی اور کی دولت اٹھاؤ گے اور ان سے جہیز خریدو گے۔ مگر ہم لوگ حلال کی کمائی پر گزارا کرتے ہیں خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔“

”تو میرا بھی آپ سے وعدہ رہا کہ میں محنت کر کے ایک ماہ میں بہن کے لئے مطلوبہ جہیز بناؤں گا جس میں ایک ایک چیز میری حلال کی کمائی گئی رقم کی



ہوگی۔“ میناش کا عزم اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔ دوسرے دن ہی چیزوں کی فہرست آ گئی۔ کافی بیش قیمت چیزیں تھیں۔ جن میں سونا ہی اتنی مالیت کا تھا کہ کوئی عام انسان اپنی عمر کا آدھا حصہ محنت مزدوری کرتا رہے تو تب خرید سکے۔ چیزوں کی لسٹ دیکھ کر میناش کافی پریشان ہو گیا تھا۔

میناش کے لئے دو کروڑ اکٹھا کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے چوری ذمہ داری یا اس طرح کا کوئی اور طریقہ استعمال نہیں کرنا تھا۔ یہ رقم اس کی اپنی محنت مشقت کی ہونی چاہئے تھی۔ اسی پریشانی میں وہ ٹھٹھا ہوا بہت دور نکل آیا اور بھی اس کی نظر دیوار پر لگے ایک اشتہار پر پڑی۔ یہ اشتہار ریسلنگ کے ایک انٹرنیشنل مقابلے کا دعوت نامہ تھا۔ جیتنے والے کو پچیس ہین شیلڈ اور ڈھائی کروڑ نقد ملتے۔ اس نے جیتنے میں شپ میں نام درج کروانے میں دیر نہ کی۔

ٹھیک دو دن بعد وہ رنگ میں کھڑا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنی خفیہ طاقتوں کے ذریعے بھی یہ لڑائی جیت سکتا تھا مگر اس نے صرف اپنی جسمانی طاقت کو ہی استعمال کیا۔ تیسرے حملے میں ہی حریف چاروں شانے چت ہو گیا۔ میناش رنگ سے ٹکنا چاہتا تھا کہ ریفری نے اسے کہا۔ ”اگر تم دو پہلو انوں کے ساتھ اور لڑو تو یہ انعام بڑھ سکتا ہے۔“

میناش نے ہامی بھری۔ جن کے آگے کوئی انسان کہاں تک سکتا تھا۔ اور وہ دونوں پہلو ان بھی ڈھیر ہو گئے۔ واپسی پر میناش کے بیک میں چار کروڑ تھے۔ اس نے فہرست کے مطابق چیزوں کا آرڈر دے دیا۔

میناش چھت پر موجود تھا کہ اچانک کالی دھند کا ایک گلو اس کے سامنے اتر اور ایک خوفناک جن کی شکل اختیار کر گیا۔ ”سردار نے تمہارے لئے انعام بھیجا ہے۔ اگر اس لڑکی کو لے کر تم نہ پہنچے تو تمہارے تینوں دوست جو سردار کے قبضے میں آ چکے ہیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے، ایک کو بچاتے یا تین زندہ کیوں۔“ خوفناک شکل

والے جن نے تمہارا نہ لے لے میں کہا۔

میناش کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور کان لمبے ہو کر اوپر کوڑھ چکے تھے۔ بھنوں پورے ماتھے پر پھیل گئی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وہ لمبا ہوتا ہوا اس جن کی گردن پر جا پڑا۔ پھر میناش نے اسے ایسے پٹختا شروع کیا جیسے دھوبی کپڑے کو پٹختا ہے۔ کچھ ہی دیر میں اس خوفناک جن کے حصے بخرے ہو چکے تھے۔ میناش اس وقت کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ وہ گول دائرے میں گھوما اور وہاں سے غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

مرزا وغیرہ جنگل میں راستہ ڈھونڈ رہے تھے کہ اچانک ہر طرف کالی دھند سی چھا گئی۔ ان کے حواس پر تار بکی چھاتی چلی گئی۔ سب سے پہلے گلو ہوش آیا۔ وہ تینوں ایک بوسیدہ سے بدبودار کمرے میں بند تھے ان کے ہاتھ پیچھے کر کے ستون سے باندھے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ باقی دونوں کو بھی ہوش آ گیا۔ ”یہ ہم..... کھ..... کہاں ہیں؟“ ناصر نے سامنے ستون کے ساتھ بندھے گلو کو مخاطب کیا۔

”لگتا ہے ہم پکڑے گئے ہیں۔“ گلو نے اندازہ لگایا۔

”مطلب۔“ ناصر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور خوفناک شکلوں والے دو جن اندر داخل ہوئے۔ وہ تینوں ان کی شکلیں دیکھ کر کانپنے لگے۔ ان میں سے ایک جن کے ہاتھ میں ایک ڈیپچاسی اس نے ڈیپچاسی کو اس میں ڈھیر ساری سونیاں تھیں اس نے ایک سوئی اٹھائی اور ناصری طرف بڑھا۔ ”نظر جاؤ زلتاش ان کو سوئی لگانے کی ضرورت نہیں یہ تینوں ان پڑھ ہیں یہ کوئی ایسا کلام نہیں پڑھیں گے جس سے ہمیں کوئی نقصان ہو۔“ لاماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”میں نے میناش کو کھلوا دیا ہے کہ اگر تم ان تینوں کی زندگی چاہتے ہو تو اس لڑکی کو ہمارے پاس لے آؤ اور جب وہ آئے گا..... پھر ان سب کی موت ہوگی۔“ لاماں کی

مکروہ ہنسی ان تینوں کے کان بھاڑ رہی تھی۔

رات ہو چکی تھی روشندان سے آتی چاند کی مدہم روشنی میں انہوں نے پہریدار جن کا جائزہ لیا۔ وہ دو در دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔

”گلو آئے گلو۔“ مرزا نے گلو کو مخاطب کیا۔

”کیا ہے؟“ گلو نے سرگوشیاں انداز میں کہا۔

”اگر تم اپنا جوتا تار کر میرے ہاتھ اپنے پاؤں سے کھولو تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“

”اوہ ہو۔ یہ بات تو میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔“ گلو نے جلدی سے جوتا تار اور پھر جیسے تیسے کر کے جرابیں بھی اتار لیں۔ دونوں ستون کا فاصلہ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ مرزا گھوم گیا اس کے ہاتھ اب گلو کے سامنے تھے جو رسی سے بندھے ہوئے تھے گلو نے اپنے جسم کو زور لگا کر دونوں پاؤں سے سامنے ستون کے ساتھ جمائے اور پیر کی انگلیوں اور انگوٹھے سے رسی کی کانٹھ کھولنا شروع کر دی۔

پہریدار جن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس کھڑا تھا اور اسے قہر با نظروں سے گھور رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی تینوں زنجیروں میں بندھے لٹے لٹک رہے تھے۔

”کھجور سے گرے اور آسمان میں اٹکے اب تو خدا ہی ہمیں ان بھوتوں سے بچا سکتا ہے۔“ مرزا آنے بے بسی سے کہا۔

ناصر کچھ کہنے والا تھا کہ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور میناش وہاں داخل ہوا اس نے تینوں کو کھولا اور کمرے سے ٹکنا چاہتا تھا کہ لاماں وہاں داخل ہوا۔ ”تو تم نے ہماری پیشکش قبول نہیں کی۔ کوئی بات نہیں وہ لڑکی بھی ہمیں آ رہی ہے ان دونوں ماں بیٹی کو میں نے اٹھوایا ہے انتظار کرو تمہاری موت آنے ہی ہوگی۔“ لاماں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ یہ واہیات چھوڑ کر حقیقت کی طرف لوٹ آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان اور ہر جاندار بے جان کا مالک وہ رب العالمین ہے۔ میری بات مانیں اور شرک چھوڑ دیں۔“

ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو بچھٹانا پڑے۔“ میناش نے باپ کو خبردار کیا۔

”بکواس بند کرو۔“ لاماں نے چیخ کر کہا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور دو جن مریم اور سیکینہ کو اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ ”سب کے جسموں پر نجاست مل دو اور منہ میں سونیاں پیوست کر دو تا کہ یہ کوئی جادو وغیرہ نہ کر سکیں۔“ لاماں نے کہا اور میناش کی طرف تھوک دیا اس کے منہ سے الٹی سی نکلی اور میناش کے سارے کپڑے گندے ہو گئے۔ جبکہ مریم اور سیکینہ کو بے ہوشی میں ہی ان کے جسم پلید کر دیا گیا اور منہ میں سونیاں لگا دیں۔

لاماں نے میناش کی طرف پھونک ماری تو میناش کے گرد فولادی چبوترے سا بن گیا۔ جس میں وہ گردن تک جکڑا ہوا تھا۔

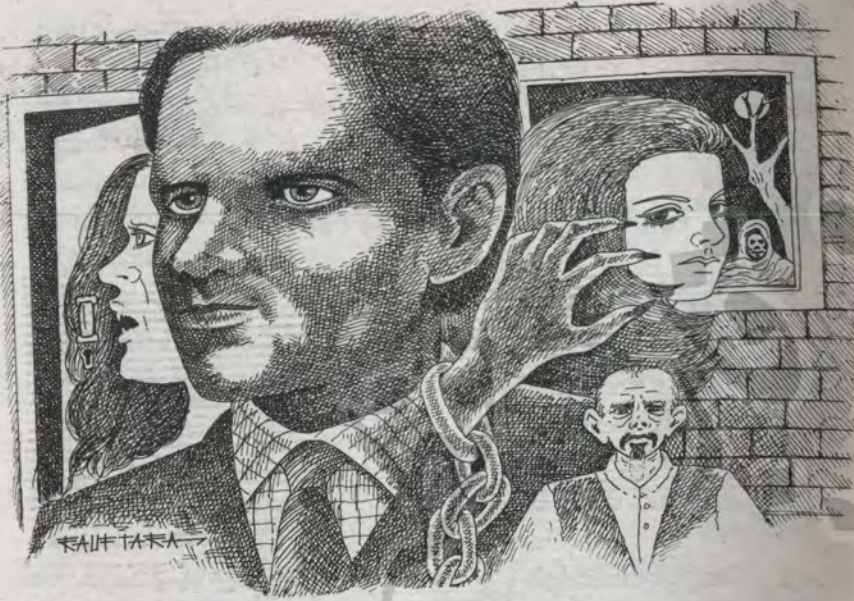
مریم اور سیکینہ کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو وہاں دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ میناش پر نظر پڑتے ہی مریم نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان میں لگی سوئی کی وجہ سے کچھ نہ نہ سکی۔

میناش نے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ چاروں طرف سے جکڑا ہوا تھا۔ لاماں خنجر ہاتھ میں پکڑے مریم کی طرف بڑھا خنجر کی نوک اس کے پیٹ پر رکھی اور ہلکے سے دباؤ کے ساتھ پھیرتا ہوا نیچے لایا تو مریم کی چیخ کے ساتھ خون کی باریک لکیر نیچے کی طرف آنے لگی۔ مریم کے منہ سے بھی خون جاری ہو گیا تھا۔ لاماں نے اپنی لمبی کھردری زبان باہر نکالی اور چاہتا تھا کہ رستا ہوا خون چاٹ لے کہ اسی وقت ایک نورانی سایہ بولہ مریم اور لاماں کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ لاماں کو ایک جھٹکا لگا تو اس جھٹکے سے دیوار میں جا لگا۔ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ دیوار میں دراڑیں پڑ گئیں پھر مریم اور سیکینہ کے پاؤں اور وجود کو زنجیریں آزاد کر چکی تھیں۔

وہ روشنی کا بھولہ آہستہ آہستہ ایک شکل اختیار کر گیا۔ ”ابو آپ!“

”شاہ صاحب آپ۔“ دونوں ماں بیٹی کے منہ





## کلون

ناصر محمود فراہ فیصل آباد

خوبو حسینہ کو نوجوان نے پانی میں اس وقت تک ڈبوئے رکھا جب تک کہ حسینہ بے جان نہ ہوگئی، نوجوان اپنے منصوبے پر بہت خوش تھا کہ اچانک وہ حسینہ دوسرے دن اسی نوجوان کے سامنے مجسم زندہ کھڑی تھی۔

مقاد پرست اور دھوکے باز اکثر گھائے میں رہتے ہیں۔ جس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

**جیک ڈنکن** بڑے بڑے ہوئے اپنے بستر سے اٹھا اور سلیپنگ گاؤن کی ڈوری کتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ تعزیت کرنے والوں کی آئے روز دستک سے اکتا چکا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی دوست یا رشتہ دار اس کے پاس اس کی تنہائی کا مداوا کرنے چلے آتے۔ حالانکہ چند ہی روز پہلے تو یہ سارے جانے پہچانے چہرے اس کو یہ بتانے آئے تھے کہ اس کی بیوی کا مرنا اس کے لئے کیسا بڑا سانحہ ہے، اس کی جواں سال بیوی میرین کتنی اچھی تھی اور وہ اس کو کتنا یاد کرتے ہیں، اس کا یوں ایک دم دنیا سے چلے جانا جیک کے لئے کتنا بڑا نقصان ہے۔ وہ اس کو میرین کی باتیں سناتے اور اس سے اس حادثے کے متعلق بار بار شروع سے آخر تک پوچھتے جس میں میرین کی موت واضح ہوئی تھی۔ جیک ان سب باتوں سے اکتا چکا تھا اور

دوپہر سے شام تک لاماش کی ساری فوج اس کی بیوی سمیت اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ پھر وہ سب گھر آ گئے۔ مریم نے بتایا کہ عظمت بیک کو اس کے بیٹے کی قتل کی خبر ملی تو وہ یہاں پر آیا تھا۔ اس نے سکیڑ اور مریم کو اٹھایا اور جیسے ہی گھر سے باہر نکلا کالی دھند نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عظمت بیک اور اس کے کارندوں کو مار کر وہ دونوں ماں بیٹی کو ان کھنڈروں میں لے آئے تھے۔

میناش کے ریسٹنگ میں جیتے روپوں کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ شاہ صاحب نے مکان میں بنے ایک تہہ خانے کی نشاندہی کی جہاں وہ اپنی جمع پونجی رکھتے تھے انہوں نے وہ رقم ایک درس گاہ کے لئے رکھی تھی مگر بیٹی کا فرض ادا کرنے سے بڑا کام اور کیا ہوتا، انہوں نے تمام رقم میناش کے حوالے کی۔ اور خود اپنے اصل مقام کی طرف پرواز کر گئے۔

مریم کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میناش نے اس کی ساس کو اکیلے میں اپنا اصلی روپ دکھایا اور کہا کہ اگر میری بہن کو کوئی تکلیف دی تو تمہاری خیر نہیں۔

مریم کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ مریم کافی بوڑھی اور نواسے نواسیوں والی ہو گئی ہے جبکہ گل محمد اب ایک مدرسے میں تعلیم دے رہا ہے۔ میناش نے اپنا نام گل محمد رکھ لیا تھا۔ لوگوں کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کر رہا ہے۔

مریم کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ مریم کافی بوڑھی اور نواسے نواسیوں والی ہو گئی ہے جبکہ گل محمد اب ایک مدرسے میں تعلیم دے رہا ہے۔ میناش نے اپنا نام گل محمد رکھ لیا تھا۔ لوگوں کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کر رہا ہے۔

وہ اپنے ہر طالب علم کو یہی درس دیتا ہے کہ ”قرون اولیٰ کا مسلمان کسی مسلک سے تعلق نہیں رکھتا تھا، نہ وہ شیعہ تھا، نہ سنی، نہ وہابی، نہ بریلوی، نہ دیوبندی، نہ اہل حدیث بلکہ وہ صرف ایک مسلمان تھا، فرقہ واریت میں پڑنے کی بجائے نبی اکرم کی سیرت کو اپنے لئے اسوۂ حسنہ بناؤ اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ مبراؤ۔

”جملہ کرو“ شاہ صاحب کا عزم اور ان کے لفظوں سے بھوتی ایمان کی مضبوطی نے سب میں نئی روح پھونک دی۔ پھر واقعی تلواریں چلیں تو کافر جن گاجر مولیٰ کی طرح کتے چلے گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت ہے جو ان کے ساتھ ہے۔ کیونکہ کافر جن جیج ویکار کرتے ہوئے قتل ہو رہے تھے۔ کئی جن بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے مگر واپس جانے والا ہرجن آسمان سے آنے والے انگارے کا نشانہ بن جاتا





اب وہ صرف بیمہ کمپنی کے چیک کا انتظار کر رہا تھا۔  
دروازے پر ایک انہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ  
اوسط قد، درمیانی عمر، برگشت چہرے اور گھنگھریالے  
بالوں والا ایک عام شخص تھا جس نے نیلے رنگ کا  
سوٹ پہن رکھا تھا۔ سرخ ٹائی، سیاہ جک دار جوتے  
اور اسی رنگ کا بریف کیس ہاتھ میں لئے وہ ایک مکمل  
بیلزین نظر آتا تھا۔

”جی فرمائیے..... کیا کام ہے.....؟“  
دروازے کو تھوڑا سا کھولتے ہوئے جیک نے پوچھا۔  
وہ آدمی دھیرے سے مسکرایا۔ ”مسٹر  
ڈنکن!..... میرا نام ٹوڈا بیورک ہے۔ میں جنینی انشورنس  
کمپنی کی طرف سے آیا ہوں تاکہ آپ سے آپ کی  
بیوی کی بیمہ پالیسی کے متعلق بات کر سکوں..... کیا ہم  
اندرون بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں.....؟“

جیک نے دیکھا اس کے پیچھے گلی میں نیلے رنگ  
کی ایک دین کھڑی ہے جس پر جلی حروف میں ”جنینی“  
لکھا ہوا ہے۔ جیک نے مڑ کر گھر کے اندر دیکھا اور پھر  
بیورک کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”کیا..... میں پہلے  
کپڑے تبدیل کر لوں.....؟“

”یقیناً.....“ بیورک خوش دلی سے بولا۔  
اس سے پہلے کہ بیورک ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے کی  
کوشش کرتا۔ جیک نے فوراً دروازہ بند کر دیا کیونکہ  
ہوسکتا ہے اس کا سوال یہ ہوتا کہ کیا میں گھر کے اندر آپ  
کا انتظار کر سکتا ہوں، مگر جواب دینے سے بہتر تھا کہ  
سوال سننے سے پہلے ہی دروازہ بند کر لیا جاتا اور ”نہ“  
کہنے کا موقع ہی نہ آتا۔ جیک، اپنے بیڈ روم کی طرف  
بھاگا اور کپڑوں کی الماری سے اپنا لباس کھینچتے ہوئے  
اس نے تعریفی نگاہوں سے اپنے بستر کی طرف دیکھا جو  
آدھا چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور اس ریسی چادر کے نیچے  
ایک میٹلک پاؤں پیرے یوں اوندھی لیٹی تھی کہ اس کا  
پورا جسم بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چمکدار بال نیچے پر  
پھیلے ہوئے تھے۔ ریسی چادر کے نیچے اس کے پرکشش  
اور پر شباب جسم کا ایک ایک خط، ایک ایک انگ اور ہر

تشیب و فراز پوری طرح عیاں ہو رہا تھا۔ وہ ہلکے سے  
کسمائی۔  
”اٹھ جاؤ خوب صورت خاتون!.....! باہر بیمہ  
کمپنی کا نمائندہ میرا انتظار کر رہا ہے۔“ جیک نے اسے  
پکارا۔  
”کیا.....؟“ ایملی کی آنکھیں پوری طرح  
کھل گئیں۔

”یہ سوالات کا وقت نہیں ہے ڈارلنگ!.....  
آج مجھے انشورنس کی رقم کا چیک ملے گا اور اگر ان لوگوں  
نے تمہیں یہاں میرے ساتھ دیکھ لیا تو یہ میرے اور  
تمہارے دونوں کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔ تمہیں اب  
جلدی سے یہاں سے کھسک لینا چاہئے۔“  
ایملی ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور پوچھنے لگی۔  
”کیا وقت ہوا ہے.....؟“

”وقت کو چھوڑو اور اپنا لباس پہنو..... باتیں بعد  
میں کر لیتا۔“ جیک نے اپنی پتلون پہنتے ہوئے کہا، پھر  
وہ اپنی پولو شرت میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔  
”کیا تمہیں جلدی رقم مل جائے گی.....؟“  
ایملی نے پھر پوچھا۔

”امید تو یہی ہے.....“ جیک نے بستر کی  
دوسری جانب ایملی کا لباس تلاش کیا اور اسے اس کی گود  
میں پھینک دیا۔ ”اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ  
تم انشورنس ایجنٹ کے اندر آنے سے پہلے یہاں سے  
نکل جاؤ۔ عقیقی طرف سے نکلو اور جا کر پیچھے گیراج میں  
چھپ جاؤ یا عقیقی دروازے سے اپنے گھر کھسک لو۔“  
”مجھے اس طرح کی جلد بازی اچھی نہیں لگتی۔“  
ایملی اپنے کپڑوں میں گھتی ہوئی بولی۔  
”فکر مت کرو..... ایک دفعہ چیک کیش  
ہو جانے دو پھر میں یہ بوسیدہ گھر فروخت کر دوں گا اور  
ہم کسی اچھی اور شاندار جگہ گھر لیں گے، وہاں کوئی مسئلہ  
نہیں ہوگا..... میرا وعدہ.....“  
”لاس ویگاس.....؟“ ایملی نے مشتاق لہجے  
میں پوچھا۔

”ہاں..... کیوں نہیں.....“ جیک نے اسے  
دلاسڈیا۔  
جیک نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک  
اسے عقیقی دروازہ بند ہونے کی ہلکی آواز سنائی نہ دے گی،  
پھر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ انشورنس  
ایجنٹ ابھی تک وہاں کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جیک  
نے دروازہ کھولا تو وہ اندر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔  
پھر اس نے اپنا بریف کیس ٹیبل پر رکھا اور اس میں سے  
کاغذات کا ایک پلندہ نکال لیا۔ اس میں سے اس نے  
چند کاغذات نکالے اور انہیں جیک کے سامنے رکھ دیا۔  
”تمہاری بیوی کے مرنے کا سن کر بہت افسوس  
ہوا.....! اگر میں کچھ زیادہ نہیں پوچھ رہا تو کیا تم بتاؤ گے  
کہ کیا واقعہ ہوا تھا؟“

”اوکے.....“ جیک کی آواز رندھ گئی۔ آنکھیں  
ڈبڈبا گئیں، تاثرات رنجیدہ ہو گئے۔ دانت بچھ گئے۔  
ان سب باتوں کی اس نے پہلے سے ہی بہت اچھی مشق  
کر رکھی تھی اور ہر موقع پر اس نے اس کا احوال دہراندہ  
مظاہرہ بھی کیا تھا۔ پہلے پولیس کے سامنے پھر دوست،  
رشتہ دار اور اب انشورنس کمپنی والے۔ وہ کسی کو شک کا  
موقع دینے کا تحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

”..... ہم تقریب کے لئے نکلے تھے اور سینٹرل  
پارک میں کیمپنگ کر رہے تھے۔ میرین دریا کے  
کنارے پانی میں ڈبکی لگانے چلی گئی، جب کہ میں  
کیپ نصب کر رہا تھا۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا اور میں نے  
اسے خبردار بھی کیا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ وہ بہترین  
بھراک ہے۔ تلاش اور مدد کرنے والوں کو اس کی لاش  
اس جگہ سے آدھ میل دور دریا کے کنارے پر جھاڑیوں  
میں پھنسی ہوئی ملی۔“

”افسوسناک..... بہت افسوسناک.....“  
بیورک کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جیک کی اداکاری  
سوفیستکی۔  
”شاید میں آپ کے دکھ کسی حد تک کم کر سکوں  
اور آپ کو آپ کی کھوئی ہوئی خوشیوں کا کچھ حصہ واپس

دلا سکوں۔“ بیورک نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔  
”کیا میرے لئے آپ کے پاس میری بیوی کی  
انشورنس کی رقم کا چیک ہے.....؟“  
بیورک نے اس کی طرف اتنی حیرت سے دیکھا  
کہ جیک نے سوچا شاید اس سے کوئی چوک ہوگئی ہے اور  
وہ پکڑا گیا ہے، یا پھر اس کا سوال بے موقع اور جلد ہاتھ  
”مسٹر جیک.....“ بیورک نے ایک ایک لفظ چبا  
چبا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی  
ہوئی ہے میرے پاس آپ کے لئے کوئی چیک نہیں  
ہے۔“

پہلے پہل تو بیورک کے الفاظ کو جیک سمجھ نہ پایا،  
مگر چند لمحوں کے بعد یہ الفاظ اس کے کانوں میں کھلے  
سیسے کی مانند اترنے لگے۔

”معاف کیجئے..... آپ شاید مذاق کر رہے  
ہیں مسٹر بیورک..... مگر یہ ذہن میں رکھئے خوشیاں اور  
مذاق اب میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ غلط فہمی شاید  
آپ کو ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی کمپنی سے اپنی اور  
اپنی بیوی کی زندگی کا بیمہ خریدا ہے اور بیمہ کی شرائط کے  
مطابق اگر ہم دونوں میں سے ایک بھی اس دنیا سے چلا  
جائے تو دوسرے کو بیس لاکھ ڈالر ملیں گے۔ یہ میں اچھی  
طرح جانتا ہوں کیونکہ ہم دونوں میاں بیوی نے اس  
بیمہ پالیسی پر دستخط کئے تھے۔ اور میں نے آپ کی کمپنی  
کے نام ہر ماہ پر بیمہ کی رقم کا چیک دستخط کر کے جمع کروایا  
ہے۔“

بیورک جو کاغذات کے پلندے کو بغور پڑھ رہا  
تھا اس کی بات سنی ان ہی کرتے ہوئے بولا۔  
”مسٹر جیک!..... شاید آپ کے علم میں نہیں  
ہے کہ آپ کی بیوی نے اس بیمہ پالیسی کی شرائط کو چند  
ہفتے پہلے بدل دیا تھا۔ یہ دیکھو، یہاں.....“ بیورک ایک  
کاغذ جیک کو تھماتے ہوئے بولا۔ ”..... آپ کی بیوی  
نے نقد ادائیگی کے بدلے ”کلون“ والی تجویز منتخب کی  
تھی۔ یہ دیکھو یہاں اس کے دستخط ہیں جو اس نے اپنے  
مرنے سے چند ہفتے پہلے کئے تھے۔“



## نماز کی قدر.....!

حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ ”نماز کے لئے تین خصوصی عزتیں ہیں پہلی یہ ہے کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سر سے آسمان تک رحمت الہی گھٹا بن کے چھا جاتی ہے اور اس کے اوپر انوار بارش کی طرح برستے ہیں۔ دوسری یہ کہ فرشتے اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں اور اس کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور تیسری یہ کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی اگر تو یہ دیکھ لے کہ تیرے سامنے کون ہے اور تو کس سے بات کر رہا ہے تو خدا کی قسم تو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔“ (ابن اثیر از احمد - کراچی)

داغ تھا نہ کوئی ثبوت، نہ کوئی گواہ..... پھر ان کو کیا اعتراض؟

”ہاں..... ہر چیز مکمل تھی سوائے ایک چیز کے.....“ جب سخت غصے میں آ رہا تھا۔ اس وقت اسکو اپنے غصے پر قابو پانے کی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی۔ اس نے تھوڑا اٹھایا اور غصے سے سامنے دیوار پر دے مارا جو سیدھا کھڑکی پر جا لگا، کھڑکی کا شیشہ ایک چھتا کے سے ٹوٹ گیا اور اس کی کچیاں باہر گھاس پر پھرن گئیں۔ ایسی ایک دم دبک گئی اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس نے اس سے پہلے بھی جبک کو اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ ”کیا معاملہ ہے.....؟“

”اس حراف نے مجھے بتائے بغیر میرے علم میں لائے بغیر یہ پالیسی تبدیل کر دی۔ اب میں رقم حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک پانی بھی مجھے نہیں ملے گی۔ اس کے بجائے مجھے اس کا کلون ملے گا۔ یعنی اس کی فوٹو کاپی..... وہ جالاک لومڑی واپس آ رہی ہے..... یعنی کچھ بھی حاصل نہیں.....“

ایسی جبک کے ساتھ لپٹ گئی۔ ”ہاں میں نے پڑھا ہے کلون کے متعلق..... ہمیں اب کوئی اور راستہ تلاش کرنا ہوگا..... آگ..... یا پھر تیزاب..... اس

کے.....“ جبک بوکھلا گیا۔

”یہ نکتہ اچھا ہے..... نہیں..... اسے یہ یاد نہیں ہوگا۔ اس طرح کی یادیں بہتر نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہم نے اس کلون..... میرا مطلب ہے میرین کے دماغ سے آخری دن کی یادیں محو کر دی ہیں، وہ اس دن کو بالکل بھول چکی ہے۔“ بیورک جبک کی طرف دیکھے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجہ میں دوبارہ بولا۔ ”اس کو بالکل بھی اندازہ نہیں کہ اس دن کیا ہوا تھا۔ مگر اس کے سارے دوستوں اور خاندان کو تو علم ہے۔ ضروری ہے کہ تم ان سب کو بلاؤ، اکٹھا کرو اور انہیں بتاؤ کہ وہ واپس آ چکی ہے اور ان کو خبردار کرو کہ اس کی موت کے متعلق اس کے آس پاس یا اس کے ساتھ کوئی بات نہ کریں۔ تم خود کسی وقت اس کو باور کرا دو کہ وہ دریا میں ڈوب گئی تھی مگر بچا لی گئی۔ اس طرح وہ اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لے گی۔ اس معاملے پر زیادہ تفصیل میں مت جاؤ ورنہ وہ خوف زدہ ہو جائے گی۔ اسے یہ صرف بتاؤ کہ ہم اس کو بچانے میں مشکل سے کامیاب ہوئے ہیں۔ سب دوستوں اور رشتہ داروں کا بھی یہی بیان ہونا چاہئے۔“

بیورک اٹھ کھڑا ہوا اور جبک کو اپنا ڈرائیونگ کار ڈرہیتے ہوئے بولا۔ ”اس پر میرا نمبر لکھا ہے میں صبح، شام ہر وقت اس نمبر پر دستیاب ہوں گا۔ کوئی مسئلہ ہو تو فوراً کال کرو میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا..... اب میں تمہیں کل صبح ملوں گا اور..... تمہاری بیوی میرے ساتھ آئے گی۔“

بیورک کے جانے کے بعد جبک عجبیہ دروازے کی طرف لپکا اور کیراج کی طرف گیا اسے امید تھی کہ ایسی میم نے وہیں رکنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ واپسی وہاں پر رکی مٹی کی ایک بوری پر ٹانگیں لٹکاے بیٹھی تھی۔ جبک کو اندر آتے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ”لگتا ہے کام بن گیا..... کافی وقت لیا تم دونوں نے۔“

”کوئی کام نہیں بنا..... وہ لوگ رقم ادا نہیں کر رہے۔“

”میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ سب کچھ بے

ہیں یعنی وہی بیس لاکھ ڈالر..... اگر یہ جان لیوا حادثہ تمہارے ساتھ ہوتا تو تمہاری بیوی میرین کو پورے بیس لاکھ ڈالر ملتے..... اگر وہ تمہارے متعلق کوئی شرط بدلنے کی کوشش کرتی تو کمپنی کی طرف سے اسے اس کی اجازت نہ دی جاتی کیونکہ اس طرح کسی ایک فریق کو دوسرے کے خلاف آفسنک عمل کی ترغیب ملتی۔

”مگر وہ.....“ جبک کچھ کہتے کہتے ہچکچا گیا۔ ”تم سمجھ رہے ہو..... میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اب اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ یہ ناممکن سا لگتا ہے۔“

بیورک سر ہلاتے ہوئے بولا..... ”میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں اور مجنی کمپنی نے بھی اس چیز کی اہمیت کو سمجھا ہے اسی وجہ سے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں خصوصی تربیت دی گئی ہے۔“

جبک اپنے سامنے دیوار کو گھورتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”کیا وہ تمہارے ساتھ آئی ہے.....؟“

بیورک کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”نہیں..... اس کام کے لئے مزید ایک دن درکار ہے..... ہم کل صبح اس کو یہاں تمہارے پاس لائیں گے۔ تمہیں اس کے ساتھ اور اسے تمہارے ساتھ ایڈجسٹمنٹ میں کچھ وقت لگے گا۔“

جبک نے سکون کی ایک گہری سانس لی مگر اس کی بھنوس ابھی تک تپتی ہوئی تھیں اور متضامین بھیجی ہوئی تھیں۔ ”کیا وہ ٹھیک اسی طرح ہوگی جیسے اصل تھی.....؟“

”بالکل اسی طرح..... بلکہ وہ اصلی ہی ہوگی.....“

”..... اور کیا اسے پہلے کی ہر چیز یاد ہوگی؟.....“

”یقیناً..... کیونکہ کوئی شخص بغیر یادداشت کے نہیں ہو سکتا ہے۔ جنہی کمپنی اس طرح کے ادھورے کام نہیں کرتی۔ میرا یقین رکھو تو کوئی فرق تلاش یا محسوس نہیں کر پاؤ گے۔“ بیورک نے اسے تسلی دی۔

”ہر چیز یاد ہوگی..... بشمول اس کی موت

جبک نے بے تابی سے اس کاغذ کو جھپٹ لیا۔ دستخط واقعی میرین کے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے میرین نے اپنے خوب صورت، نرم ملائم ہاتھوں سے ایک زبردست طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا ہو۔ وہ کوئی جواب نہ دے پایا۔ وہ بے دست و پا ہو گیا تھا۔

”کلون!.....؟“ ”ملا خراس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”آپ کلون کے متعلق نہیں جانتے.....؟“

بیورک کا انداز سخرانہ تھا۔ ”یہ جدید سائنس کی ایک منفرد ٹیکنالوجی ہے۔ اس میں کسی بھی شخص کے جسم سے اس کے DNA کا نمونہ لے کر لیبارٹری میں اس کو اس طرح پرائیس کیا جاتا ہے کہ چند ہی ہفتوں کے اندر اس نمونے سے ایک اور جاندار وجود میں آ جاتا ہے اور ہو بہو اس شخص جیسا ہی ہوتا ہے جس کا DNA لیا جاتا ہے یوں جانو یہ اس شخص کی فوٹو کاپی ہوتی ہے۔ وہی شخص، وہی چال ڈھچال، وہی عادتیں اور وہی یادداشت، فرق نہیں ہوتا۔ عورت کا کلون عورت اور مرد کا کلون مرد۔ پہلے کلوننگ کا یہ عمل کافی سست ہوتا تھا مگر اب سائنس نے وقت کی رفتار پر قابو پا کر اس کو چند ہفتوں تک محدود کر دیا ہے۔ تمہیں وہ ڈولی بھیڑ تو یاد ہوگی جسے 5 جولائی 1996ء کو سائنسدانوں نے کلوننگ کے ذریعے پیدا کیا تھا۔ ہم نے اسی ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ انسانی جان کا بدل کوئی رقم نہیں ہو سکتی اور کوئی رقم، کوئی قیمت، محبت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی، اپنے پیاروں کا بدل نہیں ہو سکتی..... کیا تم اس شرط پر راضی نہیں ہو.....؟“

”یہ غیر قانونی ہے کہ میاں بیوی میں سے ایک دوسرے کی شرائط کو تبدیل کر دے اور دوسرے کو اس کی خبر بھی نہ ہو..... کمپنی نے اس کی اجازت کیسے دے دی؟“

جبک بوکھلا گیا۔

”بالکل ٹھیک کہا تم نے مسٹر جبک..... یہ دیکھو تمہاری بیوی نے شرائط صرف اپنے حوالے سے تبدیل کی ہیں۔ جو شرائط تمہارے متعلق ہیں وہ اسی طرح برقرار



طرح اس کا کلون بھی دوبارہ نہیں بن پائے گا۔“  
جیک اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کو نرمی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”ہم ایسا نہیں کر سکتے، کوئی شخص دودھ کیسے مر سکتا ہے۔ سب کو ہم پر ہی شک ہوگا پھر ہم نہیں بچ پائیں گے۔ اس لومڑی نے ہمیں نہایت صفائی اور آسانی سے چمک دے دیا ہے۔ شرمات بے بی..... کھیل ختم ہو گیا۔“

ایملی نے اس کی طرف پیار سے دیکھا، اس کی موٹی موٹی سبز آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ ”ابھی کھیل ختم نہیں ہوا میری جان..... ہم ضرور کوئی راستہ تلاش کر لیں گے۔ ہم اتنی آسانی سے ہار نہیں مان سکتے..... فرض کرو کلون صحیح کام نہیں کرتا تب وہ بیہوش کیا کرے گی؟“  
”میں نہیں جانتا.....“ جیک کے لہجے میں حیرت تھی۔

ایملی مسکرائی۔ ”آؤ بیہ پالیسی کو دوبارہ غور سے پڑھو، شاید کوئی کنٹریل جائے۔“

جیک مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ایملی!..... تمہارے چالاک دماغ کی داد دینا پڑے گی۔“

ایملی اور جیک دونوں سر جوڑے بیہ کے ان کاغذات پر عرق ریزی کر رہے تھے جو بیورک ان کے لئے نیمبل پر چھوڑ گیا تھا۔ جس طرح ایملی سنجیدگی سے کاغذوں کو کھنگال رہی تھی وہ جیک مفکر نظر آ رہی تھی۔ اس کی ذات کا یہ اندازہ جیک پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ ایملی کاغذ کی عبارت کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس پر انگلی بھی پھیر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں لفظوں پر تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ اچانک وہ بڑبڑائی۔ ”..... نہیں..... نہیں..... نہیں.....“ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں اور انگلی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

”..... یہ دیکھو!..... یہاں لکھا ہے خراب شدہ کلون کی درنگی.....“ اس نے جیک کو مخاطب کیا، مگر اس کی آنکھیں کاغذ پر پوری طرح مرکوز تھیں۔ ”..... یہاں لکھا ہے، اگر کلون میں کچھ خرابی پیدا ہو جائے تو..... تم

انشورنس کی نصف رقم کے حقدار ہو گے۔ اس کے ساتھ سینکڑوں قسم کی خرابیوں کی ایک تفصیل درج ہے..... زیادہ تر خرابیاں ماہر نفسیات کے دائرہ کار میں آتی ہیں..... اور خوش قسمتی سے یہ ناقص پیدا ہو سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے خودکشی کی نوبت بھی آ سکتی ہے..... اور یہ نکتہ اس پالیسی میں نہایت آسان زبان میں صاف لکھا ہے۔“

”نصف.....“ جیک بڑبڑایا۔ ”اس لومڑی نے میرے لئے کوئی چارہ نہیں چھوڑا..... مرنے کے بعد بھی مجھے پوری طرح غفلت میں کسا ہوا ہے۔“  
”کچھ ہونا..... کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔“ ایملی نے اسے حوصلہ دیا۔

واقعی رقم ہی ہر چیز نہیں مگر جیک کو تو صرف رقم ہی چاہئے تھی ایملی تو ایک محنتی فائدہ تھا جس سے کسی بھی وقت چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن ٹھیک دس بجے صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ جیک پہلے ہی کھڑکی میں کھڑا، ان کا منتظر تھا اور ان کو آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بیورک اپنے گزشتہ دن والے لباس میں ہی ملوث تھا اور اس کے پہلو میں جیک کی بیوی میرین تھی..... یا شاید اس کا دوسرا کردار۔ وہ سفید سادہ لباس میں ملوث تھی، اس کے پاؤں میں سلپربتھے، وہ بھی بیورک اور بھی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بے تاب اور بے چین نظر آ رہی تھی۔ جیک نے ایک آنکھ بھری اور آنکھیں بند کر لیں۔

میرین بالکل اصلی نظر آ رہی تھی، اس کا قد بیورک سے چند انچ زیادہ تھا اس کے لہراتے بل کھاتے بال چہرے اور گردن کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دلکش عورت تھی، مگر مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ حسین نہیں تھی، مسئلہ اس کی عادتیں تھیں، اس کا انداز فکر تھا، جو جیک کو پسند نہیں تھا، ان دونوں کے انداز زندگی میں فرق تھا۔ اس کے کئی خواب جو میرین کی وجہ سے تعبیر پائے بغیر مر گئے تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنے

ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ بچائی۔  
جیک نے بیورک کو دیکھ کر اپنا سر ہلایا اور آگے بڑھ کر اپنی بیوی کو گلے لگایا۔ میرین کے انداز میں سرد مہری تھی۔ جیک کو اس کے بازو اور جسم اکڑا ہوا محسوس ہوا۔ جب جیک نے اپنے بازو اس کی کمر کے گرد جامل کیا تو میرین نے اپنا چہرہ موڑ اور اس کے سینے میں چھپایا۔ یہ اس کے پارکا پرانا انداز تھا۔

”جہیں اس گھر میں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہئی!..... اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ وہ پوچھنے لگا۔  
میرین نے گھر کے اندر قدم رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔ ”اب میں بہتر ہوں، لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک اجنبی جگہ پر تھی۔ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟..... کوئی مجھے بتا تا کیوں نہیں.....؟“

جیک نے ایک نظر بیورک کی طرف دیکھا جو میرین کے پیچھے پیچھے تھا۔

”بہتر ہے، ہم بیٹھ کر بات کریں۔“ بیورک نے پیشکش کی۔ جیک نے صوفے پر اپنی بیوی کے پہلو میں بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بیورک ان سے کچھ دور ایک کرسی پر جم گیا۔

”..... تمہیں سب سے آخری کیا بات یاد ہے.....؟“

میرین کی آنکھیں میں سچ گئیں جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”ہوں..... کل ہم پارک میں دریا کے کنارے ٹپک مٹانے گئے تھے۔ میں نے کار میں ہر چیز رکھ دی تھی اور صبح سویرے ہم گھر سے نکل گئے تھے، پھر میری آنکھ ایک سفید کمرے میں کھلی، میں جانتی ہوں اس دوران میرے ساتھ کچھ ہوا ضرور ہے جو کوئی بھی مجھے بتا نہیں رہا۔“

بیورک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی انگلی سے اپنے گھٹنے کو بجاتے ہوئے بڑی خفیف سی آواز میں بولا۔ ”..... تمہیں ایک حادثہ پیش آ گیا تھا..... مگر شکر ہے..... ہم تمہیں بچانے میں کامیاب رہے..... یہی ہے وہ چیز جو تمہیں یاد نہیں.....“

میرین نے اچھے انداز میں بیورک کی طرف دیکھا اور پھر جیک پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”کس قسم کا حادثہ.....؟“

”اس وقت، اس حادثے کی تفصیل اتنی اہم نہیں۔“ بیورک بولا۔ ”اہم یہ ہے کہ تم اپنے گھر میں، اپنے شوہر کے ساتھ ٹپٹی ہو۔ اگر تم جانتا چاہو تو ہم حادثے کی تفصیل تمہیں بعد میں کسی وقت مناسب وقت بتا سکتے ہیں۔“

”میں کتنا عرصہ بے ہوش رہی.....؟“  
”دو ہفتے.....“

میرین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ”دو ہفتے..... کیا میں کو مایوس تھی؟“

جیک ایک دم کھڑا ہو گیا اور بیورک کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میرین سے کہنے لگا۔ ”ہم ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں تم یہیں انتظار کرو۔“

جیک بیورک کو بچن میں لے گیا۔ ”مجھے میرین ٹھیک نہیں لگ رہی.....“ جیک نے سرگوشی کی۔ ”میں اس کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ اپنے اوپر بہت کنٹرول رکھتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ہر چیز جانتا اور سمجھتا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے اس سے کچھ چھپایا تو یہ ہمارے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔“

بیورک نے تسلی دینے کے انداز میں اپنا ایک ہاتھ جیک کے کندھے پر رکھا۔ ”مجھے اس قسم کی صورت حال کا بہت تجربہ ہے۔ میرا اعتبار کرو اور مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں سب سنجال لوں گا۔“

جیک سر ہلا کر رہ گیا۔

”بھروسہ رکھو.....“ بیورک نے دہرایا۔ ”اپنے خاندان کی ایک پارٹی کرو اور سب کو اکٹھا کرو، سب دوستوں کو بھی بتاؤ تاکہ ان کا میرین سے دوبارہ رابطہ ہو سکے، یہ بہت ضروری ہے۔ میرین کی بہترین کی جانب پیش قدمی پر پہلا مثبت نشان یہی پارٹی ہوگی..... سمجھے.....“

جیک نے پھر سر ہلا دیا۔



جیک کے لئے بیورک کباب میں ہڈی کی مانند تھا کیونکہ وہ ہر روز بلا ناغہ اسے فون کرتا یا خود آ جاتا۔ جب بھی چاہتا جیک سے میرین کی دہنی کیفیت کی رپورٹ طلب کر لیتا۔ جیک اس سے تنگ تھا مگر یہ اس کے مستقبل کے پروگرام کے لئے بھی بہت ضروری بھی تھا کیونکہ اس کے منصوبے کے مطابق کچھ دن بعد جب میرین خود کسی کی کوشش کرتی تو بیورک کی یہ رپورٹیں ثبوت پیش کرتیں کہ میرین کی دہنی حالت قابلِ بحورسہ نہیں تھی اور اس کی علامتیں پہلے سے موجود تھیں۔

جیک نے اپنے گھر کے بجائے ایک ایسے ہوٹل میں اس پارٹی کا بندوبست کیا۔ اس دن میرین اپنے سیاہ چمک دار لباس میں نہایت دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کا حسن ہوش رہا تھا۔ شام قدرے گرم تھی۔ میرین ہوٹل کی بالکونی میں کھڑی پرسکون اور خوش محسوس کر رہی تھی۔ دور نیچے سڑک پر ٹریفک کا جھوم تھا اور سامنے بلند و بالا عمارات میں چھلنے اور جملنے والی روشیاں ستاروں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔

جیک مہمانوں کے درمیان بولکھایا اور بھاگتا پھر رہا تھا۔ ایک ایک کو پکڑ کر اپنی بیوی کے متعلق بتا رہا تھا، ہدایات دے رہا تھا۔ ان کو سمجھا رہا تھا کہ اس کی دہنی حالت ابھی سنبھلی نہیں ہے اور وہ افسردہ ہے۔ کسی کو اس سے کوئی دل آزاری والی بات نہیں کرنا چاہئے۔

جیک کے لحاظ سے یہ شام ہر طرح سے کامیاب تھی۔ سارے ہی لوگ شریک تھے اور اپنی طرف سے اس نے اپنی بیوی کی ممکنہ خودکشی کی ساری وجوہات لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دی تھیں۔ ہر کوئی میرین کی وابستگی سے خوش تھا۔ حتیٰ کہ میرین کے خاندان بھی، اب خدا کا شکر ادا کر رہے تھے اور امید ظاہر کر رہے تھے کہ جیک اپنی بیوی کو دوبارہ زندگی کے دھارے میں لانے کے لئے بھرپور کوشش کرے گا۔

پارٹی کے اختتام پر گھر کے لئے واپس نکلنے تک میرین نے اپنے مہمانوں کے ساتھ جس شائستہ رویہ کا مظاہرہ کیا تھا وہ اب غائب ہو چکا تھا اور وہ اکھڑی

اکھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں..... اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، چہرے بے تاثر تھا اور وہ جیک سے یوں لائق بیٹھی تھی جیسے وہ کار میں موجود ہی نہ ہو۔ جب کار فرسٹ ایونیو کے پل پر پہنچی تو وہ بولی۔ ”یہاں رک جاؤ..... مجھے کچھ تازہ ہوا چاہئے۔“

جیک نے سڑک کے کنارے ایک پارکنگ میں کار روک دی اور اس کو اس نگی دیوار کے پاس پارک کیا جو دریا کے کنارے چٹانوں سے بچنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ میرین باہر نکل آئی اور اس نے سڑک کے ساتھ بنے راستے پر چلنا شروع کر دیا، جو پل کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ تھا۔ میرین نے اونچی ایڑی والی جوتی پہن رکھی تھی، اس کا سیاہ گاؤن ہوا کی وجہ سے پیچھے کی طرف لپڑا رہا تھا۔ اس کے سامنے پل کے آہنی جنگلے کی جالی تھی۔ جیک اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ آدھے راستے میں ہی رک گئی اور پل کی ریلنگ پر جھک کر نیچے شور کرتے پانی کو دیکھنے لگی۔ جب جیک اس کے قریب پہنچا تو وہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور مسکرانے لگی۔ ”کتنی حسین منظر ہے!“ اس نے کہا۔

”جیک کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سوچا اس طرح کی جگہ اس کے منصوبے کے لئے بہت کار آمد ہے۔ شہر میں یہ پل ”خودکشی پل“ کے نام سے مشہور تھا کیونکہ ہر خودکشی کرنے والا کو دنے کے لئے اسی کو منتخب کرتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ خود اس جگہ چلی آئی، اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لے تو..... پل پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ سڑک تقریباً سناں تھی۔ صرف ایک دھکا..... پھر 911 پر ایک ایمر جنسی کال..... پھر دوبارہ ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایملی میکم کا گداز جسم۔

”میں جانتی ہوں..... تم نے کیا کیا تھا جیک.....“ میرین نے پرسکون لہجے میں ایک دم لفظوں کا ہم پھوڑ دیا۔ اس کی آواز پر یقین تھی۔ ”..... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارا اگلا منصوبہ کیا ہے؟“ جیک اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا اسے یوں لگا جیسے

دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہو اور کسی نے اس کے سینے کو مٹھی میں لے کر دبا دیا ہو..... کیا واقعی وہ سب جانتی تھی؟..... ہو سکتا ہے یہ الفاظ اس نے آج کی پارٹی کے متعلق کہے ہوں..... اس کی نظریں سڑک پر چلنے والی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ تھی۔

”بے وقوف مت بنو.....“ وہ دوبارہ بولی۔ ”اور..... نہ ہی میں بے وقوف ہوں۔ مجھے تمہاری گرل فرینڈ ایملی میکم کے متعلق علم ہو چکا تھا اور تمہارے نام نہاد کاروباری دوروں اور مینیکوں کا بھی، جو اس حرافہ کے نرم گرم بستر میں ہوتے تھے۔ مجھے خطرہ تھا کہ تم مجھے ضرور کوئی نقصان پہنچاؤ گے اس لئے میں نے پیہر پالیسی تبدیل کر دی.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی اور جیک کے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے تردید یا تصدیق کی منتظر ہو۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو میرین نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

”آج پارٹی میں کوئی بھی میرے حادثے کے متعلق بات نہیں کر رہا تھا۔ صرف مجھے پتہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا، یا پھر تم..... جس نے یہ سب کیا تھا۔ اب کیا منصوبہ ہے؟..... میرے دوستوں کو اور خاندان والوں کو بتانا کہ میں اس قدر دہنی تناؤ کا شکار ہوں کہ خودکشی بھی کر سکتی ہوں، کیا خیال ہے تمہارا میں تمہارے لئے ری کے ساتھ لنک جاؤں..... گولیاں کھالوں.....“ وہ دوپل کے لئے رکی پھر پل کے نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”..... یا بھراس پل سے نیچے چلا ننگ لگا دوں؟“

جیک کا منہ حیرت کے مارے کھلا ہوا تھا۔ ”تمہیں یہ سب کیسے علم ہوا.....؟“ اس کی آواز گلے میں گھٹ رہی تھی۔

میرین سیدھی کھڑی ایسے دونوں ہاتھ کو لہوں پر رکھے بالکل پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس تنہائی میں اس اندھیرے پل پر جیک کو الزام دینا اور مجرم ٹھہرانا اس کی سنگین غلطی نظر آ رہی تھی۔

”تم نے آج پارٹی میں میری دوست کیرل سے میری دہنی کیفیت اور تناؤ کے متعلق جو کچھ کہا..... وہ

اس نے سب مجھے بتا دیا.....“

جیک نے تردید کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ پہلے بھی اس کے لئے ترنوال ثابت ہوئی تھی اور اب بھی ہو سکتی تھی۔ میرین نے اس کے ساتھ پیدل اس پل پر آ کر اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے تھے۔ ”تم عقل کل نہیں ہو..... اپنے آپ کو چالاک سمجھتے ہو مگر وہ نہیں..... کیوں جیک..... کیا تم سمجھتے تھے کہ مجھے علم نہیں ہوگا؟“

جیک اس کی خود اعتمادی اور دلیری پر حیرت زدہ تھا۔ اس نے اس دن کے متعلق سوچا جب اس نے اس کا سر اس وقت تک دریا کے پانی میں ڈبوئے رکھا جب تک اس کا سانس نہیں رک گیا۔ وہ اس دن بھی نہیں بچ سکی تھی اور..... اب بھی نہیں بچ سکے گی۔ جیک کو اس کا وہ چلنا، اس کا ترنپنا اور پھر دھیرے دھیرے موت کے منہ میں اتر جانا یاد تھا۔ وہ آزادی تھی، کامیابی تھی جسے..... جیسمی کمپنی نے چر لیا تھا۔ مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ جیک کے لبوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی میرین دوبارہ کہنے لگی۔

”تم کیا سمجھتے تھے، میں تمہارا انتظار کرتی رہوں، تنہائی کا عذاب بھوگتی رہوں اور تم..... ایملی میکم کے پر شباب جسم کو بھیگی راتوں میں جوانی کا خراج پیش کرتے رہو..... تم کیا سمجھتے تھے، میں کسی اور کے قابل نہیں ہوں، مجھے تمہارے سوا کوئی نہیں مل سکتا تھا، جب تمہارے لئے جائز تھا وہ میرے لئے کیسے ناجائز ہو سکتا تھا..... کیا تم نے سنا نہیں..... جیسا کرو گے دیا بھرو گے۔“ میرین نے اپنے دائیں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جیک نے بھی غیر ارادی طور پر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پل کے اسی طرف دیکھا تو اس کو قریبی ستون کے پیچھے کچھ حرکت محسوس ہوئی اور ایک طویل القامت آدمی سائے سے نکل کر سامنے آ گیا، اس کے کندھے چوڑے، بال سیاہ اور آنکھیں چمکدار تھیں۔

میرین نے اپنی بھنوں اچکا میں اور جیک کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔





## لمبے بال

رفعت محمود-راولپنڈی

ایک سیاہ ناگ لڑکی کی گردن سے لپٹا ہوا تھا، ناگ کا پچھلا حصہ لڑکی کے سینے اور پیٹ پر تھا۔ ناگ نے اپنا منہ لڑکی کے بالوں میں دبے رکھا تھا، لڑکی کی آنکھیں پھٹی پڑی تھیں اور چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا۔

حدود سے تجاوز کرتے ہی اکثر اوقات انسان پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ سبق آموز کہانی

جب اس کی نظر پڑی تو وہ اداس ہو گئی۔ وہ شفی جواس کے چہرے پر قصاں بھی اچانک ختم ہو گئی۔  
شبیم کی خوبصورتی میں کی چیز کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس کے چھوٹے بال اکثر اس کا دل دکھاتے تھے۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کے بال بھی اس کی سبلی ناہید کی طرح لمبے ہو جائیں۔

ناہید کو خوب صورت نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن وہ بد صورت بھی نہ تھی گندی رنگ اور کچھ یونہی ساناک نقشہ تھا۔ لیکن اس کے ریشمی بال جیسے بہت ہوا میں کھاتا ہوا آبشار۔ سر

**شبیم** نہا کر اپنے کمرے میں بڑے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو کسی پھول کی مانند گل اٹھی۔ معمول کے مطابق آج بھی وہ اپنے آپ کو حسین نظر آ رہی تھی۔ شریقی آنکھوں میں کنول کی سی پاکیزگی تھی۔ رخساروں پر پھولوں کی دلفریب تھی۔

رات کو وہ دیر سے سوئی تھی۔ نہانے کے باوجود اس کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ اس نے میک اپ کرنا شروع کیا۔ لبوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل لگائی۔ وہ کسی مصور کا حسین شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن اپنے بالوں پر

مجھے خود بھی اس کا پتہ نہیں چل سکا۔“  
میرین سوچنے لگی۔ ”کیا وہاں کوئی گواہ تھا؟  
نہیں..... کوئی نہیں ہو سکتا تھا ورنہ آج انشورنس پالیسی کے نمائندے کے بجائے پولیس اس کے دروازے پر ہوتی۔“  
بیورک نے اپنا سر ہلایا۔ ”مجھے بری خبریں پہنچانے سے نفرت ہے اچھا نہیں لگتا اور وہ بھی اتنے مختصر وقت میں ایک ہی گھر میں، مجھے اس کا بہت ہی افسوس ہے۔“  
میرین نے اندرونی طور پر سکھ کا سانس لیا۔  
”..... میں جانتی ہوں مگر یہ سب حادثہ میری موجودگی میں ہوا..... میرا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔“  
بیورک کے چہرے پر چمک آ گئی۔ ”..... مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میرے پاس آپ کے لئے ایک اچھی خبر ہے جو آپ کے نقصان کو پورا کر دے گی۔“

میرین کے دل میں لٹو پھونٹنے لگے اور اس کو بیس لاکھ ڈالر اپنے سامنے نظر آنے لگے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی بیورک دوبارہ کہنے لگا۔  
”..... کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر جیک نے پچھلے ہفتے اپنی بیوہ پالیسی کی شرائط تبدیل کر دی تھیں؟“

میرین کے چہرے پر پریشانی اور الجھن نمودار ہوئی وہ بجائے بولنے کے صرف لٹی میں سر ہلا کر رہ گئی۔  
”ہاں.....“ بیورک نے کہا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ”..... اس نے بھی تمہاری طرح کلون والی تجویز منظور کر لی تھی۔ اب تمہیں بھی نقد رقم نہیں بلکہ اپنے پیارے شوہر کا کلون ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں یہ تم دونوں کے لئے بالکل نیا آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے کی مومن منانے کا موقع..... نئی اور جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ۔ اب موت بھی سچے پیار کو نہیں روک سکتی۔ کل ٹھیک اسی وقت جیک کا کلون آپ کے ساتھ ہوگا۔“  
مبارک ہو۔“



”تم کیا سمجھتے تھے میں بغیر کسی منصوبے کے اس اکیلے سنسان اندھیرے پل پر تمہارے ساتھ آ گئی ہوں۔ جیک!..... اس سے ملو..... یہ ہے براڈ۔ پولیس میں ہے اور میرا ابوائے فرینڈ ہے..... براڈ!..... یہ میرا خاوند جیک ہے، یہ مجھے پہلے بھی ایک بار قتل کر چکا ہے۔ میرا خیال ہے یہ دوبارہ یہی حرکت کرنا چاہ رہا ہے۔“  
اتنا کہہ کر میرین چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور براڈ جیک کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ جیک کا رد عمل ست اور تاخیری تھا، اس سے پہلے کہ وہ سنبھلا براڈ اس کو دھکیلتا ہوا جھٹکے کے قریب لے گیا۔ جیک کی مٹھیاں جھنجھکیں اور نتھنے پھول گئے۔

براڈ نے ایک زوردار جھٹکا مارا اور جیک ریڈنگ کے ساتھ جا لکرایا، اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ ریڈنگ پر جھک گیا، پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلا براڈ نے اس کو ٹانگوں سے پکڑ کر ریڈنگ پر الٹا دیا۔ جیک نے بچاؤ کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کا جسم ایک زوردار دھماکے سے نیچے چٹانوں پر جا گرا اور جس وحشت ہو گیا۔ اس کو دوسرا سانس لینے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چیخ اس کے گلے میں گھٹ کے رہ گئی۔ پل پر میرین کے قہقہے کو سنے گئے۔

☆.....☆.....☆

میرین نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دروازے پر ٹووا بیورک کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں کالا بریف کیس تھا اور ہونٹ مسکراہٹ سے بالکل عاری۔ وہ سوچنے لگی کہ کہیں کچھ غلط تو نہیں..... اس نے بیورک کو اندر آنے کی دعوت دی اور چائے کے کپ کی پیشکش کی۔  
”مسز جیک!..... آپ کے شوہر جیک نے نہایت غیر ضروری اور عجیب حرکت کی۔ میری پوری توجہ آپ پر تھی اس کو تو میں سمجھ ہی نہیں پایا۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ اگر میں تھوڑی توجہ دیتا تو شاید..... اس کو اس طرح خودکشی سے باز رکھ سکتا تھا۔“

”اس میں..... تمہارا کیا قصور..... اس وقت



سے پاؤں تک بال بڑے بھلے لگتے تھے۔ جس شادی اور پارٹی میں وہ جاتی لڑکیاں اس کے بال دیکھتی رہ جاتیں۔ جب وہ بال کھول کر شائون پر ڈالتی تو ایسے معلوم ہوتا جیسے ناگ شائون پچھول رہے ہوں۔

کالج کی لڑکیاں ناہید کے بال دیکھ کر رشک کرتیں۔

تمام لڑکیاں بال بڑھانے کے نسخوں کی جستجو میں رہتی تھیں۔ لیکن کسی کے بال بھی ناہید جیسے نہ ہو سکے تھے۔

”شبم تیار ہونے کے بعد ناہید کے گھر جا پہنچی۔“

”تمہیں بھی بڑی لگن رشتی ہے بال بڑھانے کی۔“

اخبار پڑھا ہے آج کا تم نے۔“ ناہید نے باتوں باتوں میں کہا۔

”کیوں کوئی خاص ترکیب چھپی ہے؟“ شبنم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ترکیب کیا ہے۔ ایک محترمہ نے وہی سانپ کی  
ہڈیوں کا نسخہ آزمائے کا لکھا ہے۔“  
”کون سا نسخہ؟“ شبنم بولی۔

”سانپ کی ہڈیوں کا نسخہ“، ناہید سسکا کر بولی۔ ”تم نہیں جانتی کیا؟“

”نہیں۔“ شبنم دھیرے سے بولی۔ ”ارے کیا نسخہ ہے کچھ بتاؤ گی صی“

”سانپ کی ہڈیاں اور سرسوں کے تیل میں کچھ  
دوائیں ملا کر لگانے سے بال بڑھتے ہیں۔ اسٹے گھنے اور  
لےبے ہو جاتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو“ ناہید نے شبنم کی بات  
کاٹتے ہوئے کہا۔

”اچھا“ شبنم حیرانی سے بولی۔ ”مگر سانپ ملے گا کہاں سے اور اسے مارے گا کون؟“

”ہاں یہ مشکل کام ہے۔“ تاہم فکر مند سے بولی۔  
”اچھا وہ خبر تو سناؤ وراپوری۔“ شب بنم بولی۔

”اے خبر کیا ہے“ ٹائیڈ بولی۔ ”ایک لڑکی تھو تمہاری طرح سانپ نکلا تو دوڑ کر مارنے کو لگی۔ تو سانپ نے دس لیا۔ اگرچہ تھو لیکن نہر چڑھ گیا۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے مگر بے حاشی کا کام تمام ہو گیا۔“

”گھر میں اور کوئی نہ تھا۔“ شبخیز نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ گھر والے شادی میں  
 گئے ہوئے تھے۔“  
 ”ارے ہاں بالوں کے لئے نسخہ کیا بتایا تھا تم  
 نے۔۔۔۔۔۔“

سانپ کی ہڈیاں اور سرسوں کا اصلی تیل نکلاؤ۔ اس میں دو دو آئیں اور بھی ملائی جاتی ہیں۔ ان کا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ کانڈر پر لکھا ہوا ہے۔ جب نسخہ تیار ہو جائے تو اسے بالوں میں لگانا شروع کرو۔“

”لیکن سانپ کی ہڈیاں کہاں سے آئیں گی۔“  
”ارے کسی سپرے سے کہو زیادہ پیسوں کی خاطر  
لا دے گا۔“

”ہاں بھئی۔“ شبیہ نے آکر کہا۔ ان ہزار ہزار کے ٹوٹوں میں بڑی شش ہے۔ انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ کہیں خود نہ مارنے نکل جانا گاؤں میں۔ ورنہ ماری جاؤ گی۔“ ناہید نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”اچھا“ یہ کہہ کر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ سانپ کی  
مڈماں کسے حاصل کی جائیں۔

خوشنم والدین کی انکوئی اولاد تھی۔ اور اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ لیکن ایسی خواہش سانپ کی ہڈیاں کہاں سے لاتے۔

”ابو جان سے کہوں گی کیا پتہ وہ مائیں نہ تیں۔  
ای تو بالکل نہیں مائیں گی۔“ وہ اسی سوچ میں کافی دیر تک  
غرق رہی۔ شبنم کے والد ایک دولت مند آدمی تھے۔ شکار خان  
کا محبوب مشغلہ تھا۔ شبنم نے ان سے اس بات کے لئے کہا تو  
وہ ہنس پڑے۔

”بیٹی“ وہ بولے۔ ”مجھے بھی معلوم ہے کہ اس دوا کی  
سے بال بچے ہوتے ہیں لیکن سانپ کی ہڈیاں کہاں سے  
آئیں گی؟ یہ ناممکن چیز ہے۔“

”ابو۔ جب آپ دریائے سواں پر مرغابیوں کے شکار کے لئے جائیں تو مار لائیے گا۔ سانپ کو۔“

”اچھا..... اچھا۔“ وہ اکتاہٹ سے بولے ”جب گاؤں گاؤں لگاؤ تو دیکھ جائے گا۔“

شبتم کے ابو مرغانیوں کی تلاش میں دریائے سواں کی چھیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دو دوست اور بھی تھے۔ دس بارہ فٹ کے فاصلے پر نہیں ایک کالا سانپ نظر آیا تین شکاری تھے اور ایک اکیلا سانپ بھلا کیسے بچ سکتا تھا۔ انہوں نے سانپ پر فائر کر کے مار دیا۔ شبتم کے ابو جب گھر لوٹے تو انہوں نے ایک مرا سوا سانپ بیٹی کے آگے ڈال دیا۔  
وہ ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کے دل میں خوشیوں کے پھول کھل اٹھے۔

سانپ کو لان کے حصے میں دُفن کروایا گیا۔ دس دن بعد چھوڑا گیا تو سانپ کی ہڈیاں نکلیں پھر دوسری دو میں ملا کر نیل تیار کیا گیا اور شہنشاہ نے اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دن اور راتیں گزرتی گئیں۔ چالیس دنوں میں شہنشاہ کے بال کافی لمبے ہو چکے تھے۔ اب وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی خوشحوشی محسوس کرتی تھی۔ گھنٹوں اپنی زلفوں سے کھیلا کرتی۔

وقت کا سورج چلتا رہا ایک روز بچوں کا شور نہ کر بنم  
روازے پر جانچنے اسی نے دیکھا ایک سیمہ اچھول کوسانپ کا  
شاوا دکھائی تیاری کر رہا تھا سیمہ نے ایک پٹاری کھولی۔  
وہ بین کی تیز آواز پر ایک سیاہ ناگ نمودار ہوا۔ وہ چھین  
ہٹانے لہرا نے لگا۔ پھر ایک دم وہ پٹاری میں بیٹھ گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ ایک جھٹسے کے ساتھ  
 ماری سے بچن نکال کر اوپر اُڑھ دیکھنے لگا۔ جیسے کچھ تلاش  
 کر رہا ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بنم کے دروازے کی طرف  
 دوڑنے لگا۔ بنم نے دروازہ بند کر لیا۔ ناگ دروازے سے  
 دستِ تلاش کرتا رہا۔ کسی نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی مگر  
 بنم سمجھ گئی۔

ڈر اور خوف کے مارے اس کا برا حال ہوا جا رہا تھا۔  
بھگ کر اپنے کمرے کے بستر پر جاگری۔ باہر سپرہ اینین  
بجایا کر سانپ کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام  
اشائیوں کے چہرے فق ہو گئے تھے اور سپرہ کے کارنگ زرد  
رہا تھا۔ اس کا سانس پھول جانے سے گلے کی رگیں موٹی  
ہوئیں اور کاجال معلوم ہو رہی تھیں۔ بین بجاتے بجاتے وہ

شاید تھک چکا تھا۔  
جب کافی دیر ہو گئی اور ناگ بھی دھیماپڑا تو سپیرے  
کے دم میں دم آیا۔ اس نے ناگ کو پٹاری میں بند کر دیا  
سپیرے کا خیال تھا کہ ان کے گھر میں کوئی سانپ معلوم ہوتا  
ہے اس لئے سانپ ان کے گھر میں جانا چاہتا تھا۔ پھر سپیرا  
چلا گیا۔ اس واقعہ کے بعد شبنم بہت خوف زدہ رہنے لگی۔  
طرح طرح کے خوفناک خواب اس پریشان کرنے لگے۔  
لیکن وہ خاموش رہی اور کسی کو کچھ نہ بتایا۔

پھر ایک رات وہ ایک دم جاگ پڑی اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہی ناگ اس کی چارپائی کے گرد کھڑا پکار رہا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی کیونکہ ناگ ایک دم انسانی شکل میں نمودار ہو گیا اس کے سر پر سرخ رنگ کا خوب صورت سامان تھا۔

”اے لڑکی“ وہ غصے سے بولا۔ ”تمہارے باپ نے میری ناگن کو مارا ہے اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”میں..... میں نے کیا کیا ہے۔“ وہ ہکا بولی۔

”تم..... تم نے میری ناگن کی ہڈیاں پیس کر اپنے لوں میں لگا لی ہیں اسنے بال بے کرنے کے لئے، تمہیں سب کی سزا ضرور ملے گی۔“ جی تھی۔“

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اور شبنم کے ماتھے پر پھنکار تے ہوئے ڈنک ماریا۔  
شبنم کا لورا جسم نیلا ہو کر ایک طرف کوڑھلک گیا۔

صبح ناشتے پر شبنم موجود تھی اس کے بونے اس کی  
 بی سے کہا کہ وہ جا کر شبنم جو جگادیں۔ شبنم کی امی کمرے  
 میں داخل ہوئی رہی تھیں کہ ان کی نظر شبنم پر چاڑی اور ایک  
 بڑا ہونچ کر گر پڑیں۔

ایک سیاہ ناگ شبنم کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔ ناگ کا پچھلا حصہ اس کے سینے اور پیٹ پر تھا۔ اور اس نے اپنا منہ شبنم کے ریشی بالوں میں دے رکھا تھا۔ شبنم کی آنکھیں مٹی ہوئی تھیں اور چہرہ سیاہ ہو چکا تھا۔ ناگ نے اپنی مری دلی ناگن کا انتقام لے لیا تھا۔





وہ واقعی پر اسرار تو قوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گلزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ سن کر خوشبو بولی۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں بھلا آپ کی طاقت کے آگے کسی کی مجال ہے جو آپ کی نگرانی کرے، لگتا ہے کہ آج آپ زیادہ پریشان ہیں اس سے پہلے تو آپ نے کبھی ایسی بات نہ کی، آپ پریشان نہ ہوں، خوشبو کی بات سن کر روشاک بولا ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو اور پھر اس نے خوشبو کا ہاتھ پکڑا تو خوشبو بے سدھ ہوئی اور پھر اچانک روشاک کی گردن اور غصیلی آواز گونجی۔ اگر کوئی نادیدہ قوت کرے میں موجود ہے تو میرے سامنے آئے ورنہ اگر میں نے اپنے طریقے سے معلوم کر لیا تو تمہاری خبر نہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ ایک جن کی طاقت کیا ہوتی ہے، اب بھی وقت ہے تم جو بھی فوراً ظاہر ہو جاؤ نہیں تو..... اور پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ دیوار کی طرف کر دیا تو اس کی پانچوں انگلیوں سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکلنے لگیں وہ چاروں طرف کرے میں گھوم کر یہ عمل کرتا رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وہ قہر آلود نظروں سے دیوار کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر مزید بیٹھا پھر خوشبو کے کرے سے نکلتا چلا گیا۔ پھر دوسرے دن رات کے وقت وہ خوشبو کے کرے میں آیا اور خوشبو سے والہانہ طریقے سے باتیں کرتا رہا کہ اچانک اس کی آنکھوں سے سرخ شعاعوں کی دو لکیریں نکلیں اور خوشبو کے دماغ میں کھتی چلی گئیں اس کے بعد ان سرخ شعاعوں کا وجود ختم ہو گیا۔ تو وہ مسکراتے ہوئے مجسم خوشبو کے پورے وجود پر اوندھے منہ جیسے ڈھے گیا۔ خوشبو کا دل دماغ اپنے حواس میں نہ تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنی سن مانی کرنے کے لئے خوشبو کے ذہن کو ماؤف کر دیتا تھا، اس وقت خوشبو بے سدھ ہو کر بستر پر پڑ جاتی، آج بھی اس نے جب ایسا ہی کیا وہ اپنی حدود سے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک کرے میں ایک گرد آواز گونجی۔

(اب آگے پڑھیں)

”خبردار!! حدود سے آگے بڑھنا ب ختم ہوا۔ اب تو اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔“ اور اس کے ساتھ ہی کسی نادیدہ ہاتھ نے روشاک کو پشت سے پکڑ کر اوپر کو اٹھالیا۔ اس کے بعد خود بخود دروازہ کھلا اور روشاک ہوا میں معلق دروازے سے باہر کو نکلتا چلا گیا۔ دروازے سے نکلتے ہی دروازہ پھر خود بخود بند ہو گیا۔

روشاک پر جیسے سستہ طاری ہو چکا تھا۔ وہ بالکل پتھر کا بت بن چکا تھا۔ وہ ہوا میں معلق ایک طرف کو بڑی تیزی سے اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس نادیدہ ہاتھ نے اسے بڑی مضبوطی سے اپنے گتھنے میں جکڑ رکھا تھا۔ روشاک کی ذہنی صلاحیت بھی مفقود ہو چکی تھی۔



ہو چکا تھا۔

اسے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ”خبردار! اب اگر تو نے خوشبو کے ساتھ کوئی بھی گری ہوئی حرکت کی تو.....“ اور آواز ادھوری رہ گئی۔

”تو کون ہے؟ میرے سامنے آ میں بھی دیکھوں کہ تجھ میں کتنی طاقت ہے، ارے چھپ کر وار کرتا ہے، یہ مردانگی نہیں، بزدلی ہے۔ چل آ میرے سامنے۔“ روشاک طیش میں بولا۔

”اگر تجھ میں طاقت ہے تو مجھ پر غلبہ حاصل کر لے، کسی کمزور انسان پر اپنا تسلط جمانا کہاں کی مردانگی ہے، اگر تجھ میں مردانگی ہے تو کسی طاقتور سے ٹکرا، پھر تجھے پتہ چلے گا کہ طاقت و مردانگی کیا ہوتی ہے۔ میں جارہا ہوں، میری بات یاد رکھنا، خوشبو کے ساتھ اب اگر کوئی گری ہوئی حرکت کی تو تیری خیر نہیں۔“ اور آواز بند ہو گئی۔

کانی دیر تک وہ اس دیرانے میں بے سدھ کھڑا رہا، اس کی ساری جتناقی طاقتیں جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس نادیدہ قوت کے متعلق جان سکے مگر یہ جاننا اس کے بس سے باہر تھا، وہ سوچتے سوچتے تھک گیا تو نڈھال ہو کر اس جگہ دھب سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

روشاک کانی دیر تک مراقبہ کی صورت میں اس جگہ بیٹھا رہا پھر اچانک جیسے وہ ہوش میں آ گیا اس نے اپنا سر اوپر کھٹایا اور بہت لمبا سانس کھینچا۔ پھر وہ نڈھال طریقے سے اٹھا اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا، جب اس کی توانائی کچھ بحال ہوئی تو اپنے قبیلے کی جانب بڑھنے لگا، اور پھر چند لمحوں میں ہی اپنے قبیلے میں پہنچ گیا۔

قبیلہ میں رات کے وقت کئی جنات اپنی ڈیوٹی انجام دیتے تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر روشاک پر پڑ گئی تو وہ بھاگ کر اس کے قریب آیا اور پوچھا۔ ”روشاک خیریت تو ہے نا تم اس پہر کہاں سے آ رہے ہو، آج سے پہلے تو تم اس وقت کبھی نظر نہیں آئے؟“

”آج نہ جانے کیوں میری طبیعت کچھ زیادہ ہی گھبرا رہی تھی، یہی نہیں بلکہ میرے پورے وجود میں بے چینی سی ہونے لگی تھی، اس لئے قبیلہ سے ذرا باہر چلا گیا تھا۔ ایک جگہ سے میں گزرنے لگا تھا کہ اچانک ایک روحانی حصار میرے سامنے آ گیا اور اس حصار سے میری ٹھٹھیر ہو گئی۔ وہ حصار کچھ زیادہ ہی طاقتور تھا۔

بس میں بھی کچھ ضد میں آ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ میں اس حصار کو توڑ دوں اور پھر اس کنگش میں لگ گیا۔ وہ حصار تو نہ ٹوٹا مگر پھر ایک طرف کود چلا گیا۔ اور اس چکر میں میں کچھ نڈھال سا ہو گیا۔“ روشاک نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”روشاک اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک طاقتور پڑا ہے، اپنے کام سے کام رکھا کرو، خواہ وہ کسی سے الجھنا ٹھیک نہیں۔ تم جس طرح ضد میں آئے، اگر وہ حصار والی ہستی بھی ضد میں آ جاتی تو بولتو تمہارا کیا بنتا، جبکہ تمہارا اعتراف ہے کہ تمہاری کوشش کے باوجود بھی وہ حصار اس سے مس نہیں ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حصار کو قائم کرنے والا یعنی اس حصار میں یقیناً کوئی بہت زیادہ طاقتور ہستی ہوگی۔

اب تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ ایک جن زادہ کی کوشش سے وہ حصار نہیں ٹوٹا تو اس کا مطلب کیا لیا جاسکتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس حصار میں مقید ہستی کو غصہ نہیں آیا ورنہ تمہارا کام ضرور ہو جاتا اور تمہاری ضد دھری کی دھری رہ جاتی۔ تم خف کر آ گئے، کبھی آئندہ خیال رکھنا، خیر! اب جاؤ اور جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو، رات بہت بیت چکی ہے، تھوڑی دیر میں فجر ہونے والی ہے۔“

یہ سن کر روشاک بولا۔ ”وہ حصار ایک طرف کو بڑھ گیا اور میں خاموشی سے آ گیا مگر اب میں یہ کوشش ضرور کروں گا اور معلوم کروں گا کہ وہ کون تھا؟ کسی نہ کسی دن معلوم کر کے ہی رہوں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ ”روشاک تم غلطی کرو گے اس ہستی کے راتے میں آنے کی، میں نے تو اندازہ کر لیا ہے کہ وہ ہستی تم سے بہت زیادہ طاقتور ہے اور اگر تم نے ضد نہ چھوڑی تو تمہارا

نا قابل یقین نقصان بھی ہو سکتا ہے اور پھر تم سردار یعنی اپنے والد کو بھی جانتے ہی ہو کہ وہ اصول کے کتنے پکے ہیں۔ ضد کو اپنے دل و دماغ سے نکال دو، اور جا کر آرام کرو، میرا مشورہ یاد رکھنا۔“ یہ بول کر پہریدار جن خاموش ہو گیا اور روشاک اپنے کمرے میں آ گیا۔

ادھر خوشبو اپنے کمرے میں رات بھر بے چین رہی۔ روشاک کے اس طرح کمرے سے غائب ہونے پر اس کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے یہ پریشانی تھی کہ کبھی ایسا تو نہ ہوا تھا کہ روشاک اس طرح اچانک غائب ہوا تھا۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ اب وہ ہمارے ساتھ کوئی بدسلوکی کرے، کہیں غصے میں آ کر کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔

مگر یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ ایسا ہونے میں بھی یقیناً حکیم کامل کا ہی ہاتھ ہوگا کیونکہ حکیم کامل نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اب روشاک کسی صورت بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن پھر بھی اس کے دماغ میں ایک پچھل پچی ہوئی تھی۔

خوشبو اپنے کمرے میں کبھی اٹھ کر ٹھٹھکتی اور پھر بستر پر بیٹھ جاتی، پھر لیٹ جاتی اور پھر اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتی وہ یہ بھی سوچنے لگی تھی کہ کہیں اس کا اور حکیم کامل کا ٹھہر نہ ہو جائے، اور حکیم کامل کا کوئی نقصان نہ ہو جائے۔

پھر اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ ”وہ حکیم کامل پر غلبہ نہیں پاسکتا، حکیم کامل زیادہ طاقتور ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو کئی مرتبہ اس نے کمرے میں کسی نادیدہ قوت کا ذکر کرتا رہا ہے اور پھر اس نے اپنی پوری طاقت اور صلاحیت بھی آزمایا ہے مگر اس نادیدہ قوت کا نہ ہی پتہ لگا سکا اور نہ ہی اس پر قابو پاسکا اور وہ نادیدہ قوت یقیناً حکیم کامل کی ہوتی ہے۔

روشاک کسی صورت بھی حکیم کامل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا، اگر ایسا ہوتا تو اب تک وہ حکیم کامل کو نقصان پہنچا چکا ہوتا۔

پھر اس نے کھڑے کھڑے اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھادیے۔ ”اللہ تعالیٰ میری غلطیوں، کوتاہیوں اور نافرمانیوں کو معاف فرما، ہم تمام گھروالوں پر اپنا رحم و فضل فرما اور حکیم کامل پر بھی نظر کرم کر، اور انہیں تمام پریشانیوں سے بچائے رکھنا، اور حکیم کامل کو مزید طاقت بخش کر وہ اس جن زادے پر قابو پاسکیں۔ اللہ جلد از جلد اس موزی سے ہماری جان چھڑا اس کو نیست و نابود کر دے، اس نے ہماری زندگی ایک طویل عرصے سے اذیت ناک بنادی ہے۔ ہماری تمام خوشیاں خاک میں ملادی ہیں، اللہ تو دلوں کا عہدید بھی جانتا ہے تو ہماری نیکیوں کو بھی جانتا ہے، ہماری کوششوں سے بھی واقف ہے، اللہ تو ہی دین و دنیا کا خالق و مالک ہے، تو ہی نے دنیا کے تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے تو نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اللہ تیری پیدا کردہ اس مخلوق نے ہماری زندگیوں میں زہر گول دیا ہے، بل بل ہمیں سہا کر رکھ دیا ہے، اللہ ہمیں اس سے فوری نجات دے۔

فوری نجات دے۔“ اور خوشیوں کی آواز زندہ ہو گئی، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اس حالت میں وہ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی اور پھر سسکیوں سے رونے لگی۔

فرش پر بیٹھی ہوئی خوشبو سسکتی رہی کہ اتنے میں اذان فجر کی آواز اسے سنائی دی۔ اذان فجر کو سنتے ہی اس نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ اس نے اپنے پورے جسم میں عجیب تو اتانی محسوس کی، اس کا دل جیسے مطمئن ہو گیا تھا، وہ بار بار لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی، اس حالت میں چند منٹ گزرے پھر وہ طمانیت سے اٹھی اور بستر پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی میزبھوں سے اتر کر نیچے صحن میں آ گئی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ غسل خانے سے نکلی منہ ہاتھ دھو یا اور وضو کرنے لگی۔ وضو سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ اپنی والدہ کی آواز سنی۔ ”ارے خوشبو! آج اتنی جلدی.....؟“



”ہاں امی آنکھ کھلی گئی اور اذان فجر کی آواز سنائی دی تو نماز ادا کرنے کے لئے نیچے آگئی۔ آج میں اپنے اندر بہت زیادہ طمانیت محسوس کر رہی ہوں۔ میرے دل دماغ میں ایک عجیب طرح کی توانائی محسوس ہو رہی ہے۔“

”بیٹا! یہ اچھی بات ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں خوشیوں سے نوازے، آج میں بھی ایک طویل عرصہ بعد تمہارے چہرے پر ایک نیا عزم اور خوشی دیکھ رہی ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ضرورت سمجھتا ہے، وہ کسی بھی دعا کو رد نہیں کرتا، خیر تم نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ تیار کرو، میں اور بچوں کو بھی اٹھاتی ہوں تاکہ وہ بھی نماز ادا کریں، تمہارے ابو بھی وضو کر کے نماز پڑھ رہے ہیں۔“ یہ بول کر خوشبو کی والدہ وضو بنانے لگیں، اور خوشبو نماز فجر کی اذان کی گئی کے لئے جانے نماز بچھانے لگی۔

تمام لوگوں نے نماز فجر ادا کی اور پھر تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے گرم گرم ناشتہ لگ گیا، آج تمام گھر والے بہت خوش تھے کیونکہ آج خوشبو نے اپنے ہاتھ سے ناشتہ تیار کیا تھا، ورنہ اب تک خوشبو اپنے کمرے میں آٹھ نو بجے تک سوئی رہی تھی، گرم گرم پراٹھے، فرنی انڈا اور دودھ پتی کی چائے نے سب کو خوش کر دیا تھا۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر چھوٹی بہنوں نے برتن اٹھائے اور کچن میں لے گئیں۔ چھوٹا بھائی اسکول جانے کی تیاری کرنے لگا اور ان کے ابو عتیق صاحب اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے گھر سے نکل گئے۔

امی کی آواز سنائی دی۔ ”خوشبو بیٹا! میں نے ملازم کو بازار بھیج دیا ہے، تھوڑی دیر میں وہ گوشت اور دیگر چیزیں لے آئے گا، پلاؤ کے لئے چاول چن لو اور ہاں تھوڑے سے کباب بھی بنالینا، تمہارے ابو کا دل چاہ رہا ہے، دو دن پہلے انہوں نے کباب کی فرمائش کی تھی۔“

”جی امی!“ اور خوشبو چاول نکالنے لگی۔ چھوٹی بہن سے بولی۔ ”تم کبابوں کے لئے چنے کی دال نکال کر چن لو۔ گوشت کے آتے ہی فوراً کباب کے لئے تیاری شروع کر دینا۔“

آج واقعی سارا گھر خوشیوں سے جھوم رہا تھا، ہر کسی کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی سرشاری نظر آ رہی تھی، ایک طویل عرصہ بعد گھر والے یہ سرشاری محسوس کر رہے تھے۔

ادھر رولو کا نے اپنے کئی کارندے روٹاک کی نگرانی پر لگا دیئے تھے، کارندوں کو علم تھا کہ جب بھی روٹاک کسی بھی کام کے لئے اپنے قبیلہ سے باہر نکلے تو اس کی خبر فوراً دی جائے، کارندے بہت چوکس اور مستعدی سے اپنی ذمہ داری انجام دے رہے تھے۔

ویسے بھی رولو کا نے پورے مطب کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کر دیا تھا، اسے خدشہ تھا کہ روٹاک طیش میں آکر مطب کا یا مطب کے کسی ملازم یا پھر کوئی اور نقصان نہ کر بیٹھے۔ ان تمام باتوں کا علم حکیم وقار کو نہیں تھا اور نہ ہی رولو کا نے انہیں کچھ بتایا تھا۔ رولو کا کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر حکیم وقار کو ان تمام باتوں کا علم ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے دماغ پر کسی قسم کا بوجھ پڑ جائے اور وہ سوچنے لگیں کہ کسی جن سے دشمنی اچھی نہیں ہوتی۔

اور یہ بات بھی مسلم تھی کہ جب بھی رولو کا کسی نا دیدہ قوت سے معرکہ ہوتا تو وہ حکیم وقار کے علم میں بات نہیں لاتا تھا۔ جب وہ تمام باتوں سے مطمئن ہو جاتا اور ہر طرح کا کیس ختم ہو جاتا اور دشمن یا ماورائی قوتوں کا خاتمہ یا پھر ماورائی قوتیں دم توڑ دیتیں تو پھر رولو کا حکیم وقار کے علم میں تمام باتیں لے آتا۔

اور جب بھی کوئی نیا مسئلہ درپیش ہوتا تو اس کا علم حکیم وقار کو ضرور ہوتا تھا، حکیم وقار ہر نماز میں خدا سے رولو کا کی کامیابی کے لئے دعا کرتے رہتے تھے۔

ویسے رولو کا حکیم وقار کے علم میں یہ بات لے آیا تھا کہ یہ جن زادہ بہت زیادہ ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوا ہے، یہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پڑا ہوا ہے اور کسی صورت بھی یہ خوشبو کی ذات سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں، ویسے تو میری حتی الامکان کوشش ہوگی کہ یہ تھک ہار کر پسپائی قبول کر لے اور خوشبو کی ذات سے الگ ہو جائے

اور اگر یہ اپنی ضد پڑنا رہا اور اوجھے ہٹکنڈوں پر اتر آتا تو پھر جنگ آمد جنگ آمد۔

رولو کا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ چند باتیں بتانے کے لئے خوشبو کے گھر چلنا چاہئے۔ رولو کا نے خوشبو کے گھر کا تصور کیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحہ بھی نہیں لگا کہ رولو کا خوشبو کے گھر سے تھوڑی دور آکر ایک باغ میں نمودار ہوا اس وقت باغ میں کوئی بھی انسان موجود نہیں تھا۔ رولو کا چلتا ہوا خوشبو کے گھر کے دروازے پر پہنچا۔

گھر کے باہر دالان میں ایک ملازم چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ رولو کا بولا۔ ”جناب مجھے عتیق صاحب سے ملنا ہے اگر آپ انہیں بتادیں تو آپ کی مہربانی ہوگی، آپ بتائیے گا کہ حکیم کامل آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

رولو کا کی بات سنتے ہی جھٹ ملازم اٹھا اور ایک طرف موجود دروازے سے اندر چلا گیا۔ وہ کمرہ باہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے وقف تھا۔

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے عتیق صاحب باہر نکلے اور جھٹ رولو کا سے مصافحہ کیا۔

رولو کا نے بھی ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”عتیق صاحب چند باتیں تمہیں جس کی وجہ سے میں نے آپ کو تکلیف دی۔“

”حکیم صاحب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، میں تو یہ سوچ سوچ کر ذہنی خائشاں میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ ہماری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے، اگر آپ کے آنے کا کوئی دلی مقرر ہو تو میں کو چوان کو بھیج دوں۔“

آپ اندر تشریف لے آئیں۔ ”عتیق صاحب نے کہا۔ بیٹھک میں آکر رولو کا ایک صوف پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”عتیق صاحب آپ میری تکلیف کے متعلق قطعی نہ سوچا کریں، میں پریشان حال لوگوں کے کام آکر بڑا دلی سکون محسوس کرتا ہوں چونکہ میرا کوئی وقت آنے کا مقرر نہیں تو بھلا میں کیسے آپ کو بتا سکتا ہوں، جب اشد

ضرورت محسوس ہوتی ہے تو آ جاتا ہوں اور پھر بڑے آرام سکون سے چلا بھی جاتا ہوں۔

میرے ذہن میں چند باتیں آئیں تو میں چلا آیا۔ آپ برائے مہربانی خوشبو کو بلا لیں۔ اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”جی بہت اچھا۔“ بول کر عتیق صاحب اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

کچھ ہی لمحے میں خوشبو کمرے میں داخل ہوئی۔ ”السلام علیکم حکیم صاحب۔“ خوشبو بولی، اور آکر سعادت مندی سے سر پر اپنل سنبھالتی ہوئی رولو کا کے سامنے بیٹھ گئی۔

رولو کا بولا۔ ”علیکم السلام۔“

”جی فرمائیں۔“ خوشبو بولی۔

”در اصل چند باتیں تمہیں جن کی وجہ سے میں آ گیا۔ بات یہ ہے کہ کل رات سے میں نے اس جن پر سختی شروع کر دی ہے، کل رات میں وہ تم سے باتیں کرتا رہا اس وقت غائبانہ طور پر میں کمرے میں موجود تھا اور پھر جب وہ آگے بڑھا تو میں اسے اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا۔ غصہ تو مجھے بہت تھا اور دل میں آیا کہ میں اسی وقت اس کا کام تمام کر دوں مگر میں کچھ سوچ کر ایسا نہ کر سکا۔

اس کے دل و دماغ پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ جیسے وہ پتھر کا بت بن چکا تھا۔ میں نے اسے لے جا کر اس کے قبیلہ سے کچھ دور ایک ویرانے میں شیخ دیا۔ اور ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ بعد اسے جیسے ہوش آ گیا تو خود کو اس جگہ پا کر بہت تمللانے لگا۔ اس نے اپنی صلاحیت سے بہت کچھ میرے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کے گرد ایک حصار قائم کر کر چکا تھا تاکہ اس کی سوچ کا دائرہ اس حصار سے باہر نہ جاسکے۔

وہ طیش میں بہت زیادہ اول فول بکتا رہا۔ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پھرا ہوا تھا مگر اس کی ایک نہ چلی۔ وہ مجھے بھی طیش دلانا ہوتا کہ میں طیش میں



آکر اس کے سامنے آ جاؤں، اگر میں طیش میں آ جاتا اور اس کے سامنے ظاہر ہو جاتا تو اس کے حق میں ٹھیک نہیں ہوتا۔

اور یہ حقیقت ہے کہ مجرم کے سامنے اس کے قصور کو لایا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تمہاری ذات سے یہ قصور سرزد ہوا ہے۔

میرے یہاں آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ بہت طیش میں آ گیا ہے ویسے تو میں نے اپنے کارندوں کو اس کے قبیلے کے باہر کی ہر حرکت کو نوٹ کرنے پر لگا دیا ہے اور پھر میں نے آپ لوگوں کے گھر کے گرد بھی ایک مضبوط حصار قائم کر دیا ہے لیکن یہ حصار ایسا ہے کہ صرف وہی آپ کے گھر میں آ سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی اور جن یا کوئی اور دیگر ماورائی قوت یہاں نہیں مار سکتی۔ خاص طور پر تمہارے وہ کسی وقت بھی بہت زیادہ طیش میں آ سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے وہ آپ لوگوں کے سامنے آپ لوگوں کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دے سکتا ہے۔

لیکن اس کی تمام دھونس دھمکی سٹی ہوگی، گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں، اس گھر کے کسی بھی فرد کا وہ بال تک با کا نہیں کر سکتا، اچھے کو دے گا بہت زیادہ۔ وہ ہر طرح سے کوشش کرے گا کہ آپ لوگوں کی زبان سے یہ نکل جائے کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا علم آپ لوگوں کو ہے اور خاص طور پر تمہارے علم میں ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چند منٹ کے لئے وہ تم پر دباؤ ڈالے یا پھر کسی کرب میں مبتلا کر دے مگر اس معاملے میں اپنی زبان نہیں کھولنا۔

میرا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اس قدر تھک جائے کہ اسے اپنی زندگی اجیرن معلوم ہونے لگے، وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے چند خیر خواہ اور دوستوں کو کہہ دے کہ تم لوگ گھر والوں کو تنگ کرنا شروع کر دو مگر وہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوگا۔

میں چاہوں تو اسے آج ہی ختم کر سکتا ہوں مگر

جنات قوم میں یہ خاصیت ہے کہ ان کی کسی سے اگر دشمنی ہو جائے تو یہ اس دشمنی میں بہت دور تک جاتے ہیں اور مونیع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ نقصان پہنچائیں۔ اگر ایک کو ختم کر دیا جائے تو اس کے گھر والے اس کے خاندان اس کے دوست احباب اور پھر اس کے قبیلہ والے دشمنی پر اتر آتے ہیں۔

ان ہی تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے میں اس کے گرد ایسا جال بنا چاہتا ہوں کہ وہ کسی بھی طرح اس گھیرے سے نکل نہ سکے اور اگر اس کے خاندان یا اس کے قبیلہ والوں کو علم ہو جائے تو وہ سب بھی اسے قصور وار ٹھہرائیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ماورائی قوت کو قید کر کے کہیں دفن کر دیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی بوتل میں قید کر کے دریا سمندر برو کر دیا جاتا ہے مگر اس میں یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ کسی بھی وجہ سے اگر کبھی وہ بوتل ٹوٹ جائے یا جہاں اسے دفن کیا گیا ہے کسی بھی وجہ سے اگر وہاں سے نکل جاتا ہے تو پھر وہ ایک طویل عرصہ بعد بھی اپنے ساتھ دشمنی کرنے والے یا پھر جس کے لئے اسے قید کیا گیا تھا، اس سے انتقام لیتا ہے یا پھر ایسا بھی کرتا ہے کہ اگر ان لوگوں تک نہیں پہنچ پاتا جن کی وجہ سے اسے سزا دی گئی تھی تو پھر دوسروں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیتا ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ سرکش جن کا خاتمہ کر دیا جائے یا پھر دیگر آسیب وغیرہ کا بھی خاتمہ ضروری ہوتا ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عتیق صاحب بھی کمرے میں آ گئے ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے میں چائے کے دو کپ تھے، ٹرے کو انہوں نے روٹو کا سامنے میز پر رکھ دیا۔

”عتیق صاحب اس کی کیا ضرورت تھی، بھی آپ لوگ تکلف نہ کیا کریں۔“ روٹو کا بولا۔

”حکیم صاحب یہ تکلیف نہیں، ایک کپ چائے میں کون سی پریشانی ہو جاتی ہے، یہ آپ کا بڑا پین ہے اور آپ ایک رحم دل انسان ہیں جو کہ دوسروں کے لئے

انتھک پریشانی اٹھاتے ہیں، دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہوئے لوگوں کو دکھ تکلیف اور پریشانیوں سے چھٹکارا دلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہت اجر دے گا۔“

”حکیم صاحب انسانیت ہے دوسروں کا احساس کرنا، دوسروں کے دکھ درد میں کام آنا، اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ دینا، جہاں تک ہو سکے ڈوبتے کو سہارا دے کر کنارے لگانا، سب کچھ یہیں رہ جاتا ہے، صرف انسان کا نفع اور کیا دھرا اعمال ہی اس کے ساتھ جاتا ہے۔“

جانے والے چلے جاتے ہیں اور جانے والوں کو لوگ دو طرح یاد کرتے ہیں اچھوں کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے اور بروں کو جانے کے بعد بھی برائی ملتی ہے برے الفاظ سے یاد کرنے پر، میں ہر نماز میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حوصلہ و ہمت دے اور آپ دوسروں کی پریشانیوں کو دور کریں۔

حکیم صاحب آپ کا یہ احسان مرتے دم تک میں یاد رکھوں گا اور اپنی اولاد کو بھی کہہ جاؤں گا کہ وہ بھی آپ کے حق میں دعا کرتے رہیں۔“ عتیق صاحب نے کہا۔

”عتیق صاحب! آپ کی ساری باتیں درست ہیں، میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ اصل انسانیت یہی ہے کہ انسان دوسروں کے کام آئے، اور اپنی ذات سے کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچائے، مگر کون ہے جو اس کے حکم پر عمل کرتا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حکم کو من و عن ماننے ہیں اور اپنی ذات سے دوسروں کو فیض پہنچاتے ہیں۔“

میں جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ باتیں میں نے خوشبو کو بتادی ہیں۔ دراصل یہ کہنا تھا کہ وہ جن اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہو سکتا ہے کچھ زیادہ اچھل کود کرے یا پھر دھمکی جیسے الفاظ بولے، اس صورت میں آپ لوگ بالکل بھی نہ گھبرائیں، اندرونی طور پر مطمئن رہیں، یہ خیال بالکل بھی اپنے دماغ سے نکال دیں کہ

اس کی ذات یا کسی بھی عمل سے آپ کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ نقصان پہنچانے والی اس کی تمام طاقتیں میں نے سلب کر دی ہیں، اچھا خوشبو، اب تم جاؤ اور آرام و سکون سے کھاؤ پیو اور ہو۔“ روٹو کا نے کہا۔

”جی حکیم صاحب، میں آپ کی باتوں کو ذہن میں رکھوں گی۔“ یہ بول کر خوشبو اٹھی اور ”خدا حافظ“ کہتی ہوئی بیٹھک سے نکل چلی گئی۔

”حکیم صاحب چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے آپ چائے پیئیں۔“ عتیق صاحب نے کہا تو روٹو کا کپ اٹھا کر چائے پیئے لگا۔ چائے پی کر روٹو کا بولا۔ ”عتیق صاحب اب میں اجازت چاہتا ہوں، ایک دو کام اور بھی ہیں اور اس کے لئے میرا جلدی پہنچنا بھی ضروری ہے۔“

”حکیم صاحب میں کو چوان کو بلاتا ہوں، آپ گھوڑا گاڑی پر چلے جائیں۔“ عتیق صاحب نے کہا۔

”عتیق صاحب اس کی ضرورت نہیں، میرا آنا جانا تو لگا رہتا ہے، میں جس طرح آتا ہوں، اسی طرح چلا بھی جاتا ہوں۔ خواہ خواہ کسی کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ، اب میں چلتا ہوں پھر بہت جلد آپ لوگوں سے ملاقات ہوگی۔“ یہ بول کر روٹو کا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

عتیق صاحب بولے۔ ”حکیم صاحب جیسے آپ کی مرضی۔“ اور روٹو کا عتیق صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ اس جگہ سے نکلنے کے بعد روٹو کا خراماں خراماں چلتا ہوا، اس آم کے باغ میں پہنچا جہاں سے وہ آیا تھا۔ باغ میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ اس جگہ کوئی اور نہیں جو کہ اسے دیکھ رہا ہے تو وہ ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر اپنے کمرے کا تصور کیا اور فوراً غائب ہو کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

اس وقت دن کے ساڑھے بارہ کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر حکیم وقار کے کمرے میں آ گیا۔ روٹو کا کو کچھ حکیم وقار اپنی کرسی سے اٹھ گئے اور ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ کیا۔ ”حکیم



صاحب اور سائیں! کیسے ہیں، میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ صبح کے وقت اپنے کمرے سے نہیں نکلے اور میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یقیناً آپ مصروف ہوں گے، اگر فارغ ہوتے تو یہ مجھ کو ضرور تشریف لے آتے۔ کیا بنا خوشبو والے مسئلے کا؟“ حکیم وقار نے کہا۔

”حکیم صاحب! کم بخت بہت ہی ضدی اور ہٹ دھرم جن سے واسطہ پڑ گیا ہے، ابھی وہ نو جوان ہے، شادی شدہ نہیں، اور آپ تو جانتے ہیں کہ کسی بھی نو جوان کی سوچ کیا ہوتی ہے، جوانی اور نو جوانی سب پر آتی ہے، اگر کوئی چارو بھی ہو تو وہ بھی جوانی میں زیادہ چاک و چوبند اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر زیادہ پھرتیلا ہوتا ہے اور جسمانی توانائی و طاقت کے ڈوم میں کہیں تک نہیں بیٹھتا ہے۔

میری تو اب تک یہی کوشش ہے کہ وہ اپنے غصہ سے باز آئے اور خوشبو کی ذات سے الگ ہو جائے اور اگر وہ اسی طرح ہٹ دھرمی پر اڑا رہا تو سوائے نقصان کے اس کے ساتھ اور کچھ نہیں آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جانی نقصان بھی اٹھائے۔

جبکہ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ اس کے اس عمل میں اس کا ساتھ کوئی اور نہیں دے رہا ہے، اس کا تعلق مسلمان جنات کے قبیلہ سے ہے اور اس کے والد اس قبیلہ کے سردار بھی ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دل میں یہ بات ہو کہ وہ سردار کا بیٹا ہے، اس لئے اور بھی جنات اس کا ساتھ دیں گے۔

جس طرح دنیا میں عام طاقتور لوگوں کا ساتھ ہوتا ہے کہ طاقتور کا ساتھ دوسرے لوگ بڑھ چڑھ کر دیتے ہیں۔

ابھی تک میری کوشش ہے کہ میں اسے تھکا تا رہوں اور وہ اس قدر تھک جائے کہ اس میں سکت باقی نہ رہے، طاقتور کے جب مہرے پٹنے لگتے ہیں تو وہ اور زیادہ پھرتیلا ہوتا ہے اور پھر طیش میں آ کر سارے غلط اقدام اٹھانے لگتا ہے جس کی وجہ سے وہ مزید پریشان ہو

سے دوچار ہوتا چلا جاتا ہے۔ بڑوں نے یہ حقیقت کہا ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔“ رولو کا مسکراتے ہوئے بولا۔

”بالکل آپ صحیح فرما رہے ہیں، بہر حال میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد کامیاب و کامران کرے اور کم بخت اس جن کو منہ کی کھانی پڑے۔“ حکیم وقار نے کہا۔

اس کے بعد حکیم وقار نے میز پر کئی کھینی بجائی تو فوراً ایک ملازم آیا تو حکیم وقار نے کہا۔ ”بھئی فوراً دو کپ چائے لے آؤ اور ہاں! ساتھ ہی پکچسٹ بھی لانا۔“ یہ سنتے ہی ملازم فوراً اپنا اور حکیم وقار کے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ملازم چائے اور بسکٹ لے کر آیا اور میز پر دونوں چیزوں کو رکھ کر واپس چلا گیا۔ حکیم وقار نے کہا۔ ”حکیم صاحب گرم چائے پیئیں اور ساتھ ہی بسکٹ بھی کھائیں، کئی دن ہو گئے تھے آپ کے ساتھ چائے پے ہوئے، یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ چند گھنٹی آپ کے ساتھ گزار لیتا ہوں، ورنہ آپ کو دیکھے ہوئے ہفتہ بلکہ ہفتے گزار جاتے ہیں اور آپ سے ملاقات نہیں ہوتی۔“

رولو کا حکیم وقار کی باتیں سن کر بولا۔ ”حکیم صاحب یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ دلی طور پر مجھے یاد کرتے ہیں، میری تو خواہش ہوتی ہے کہ میں بلا ناغہ وقت مقررہ پر مطب میں بیٹھا کروں مگر یہ بھی مجبوری ہے کہ کام کے پیش نظر آپ کی نظروں سے اوجھل رہتا ہوں، آپ کی دعاؤں اور اوپر والے کی مہربانی سے میں حتی الامکان مسئلے مسائل کو قابو کر لیتا ہوں، ارے کیا جانتا ہے، میری تھوڑی بہت محنت سے، اذیت و کرب سے دو چار مصیبت زدہ لوگ اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو دنیا میں سبھی لوگ بہت کم ہیں۔ ہاں ایک شعرا یا آداب۔

دنیا ہے سکھ سے خالی دکھ چار سو بھرا ہے

غم کے سوا یہاں پر سوچو تو کیا دھرا ہے ”بالکل صحیح! آپ نے حقیقت بیان کر دی، پوری دنیا میں ایسا ہی ہے اور ایسا صرف اس لئے ہے کہ انسان مقرر کردہ اپنی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔

اگر انسان فرمان الہی پر قائم رہے تو وہ کسی صورت بھی تکالیف کا آجاگاہ نہیں بن سکتا۔ حکم ربی کو ماننے والے قناعت پسند ہوتے ہیں، زیادہ اور زیادہ کے چکر میں نہیں پڑتے، اپنی نفسانی خواہشات کے غلام نہیں بن جاتے، اپنے حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی خوشی زندگی گزارتے ہیں، جو لوگ خوب سے خوب تر کی جستجو میں دن رات لگے رہتے ہیں، وہ اپنا سکون غارت کریتے ہیں اور پل پل کرب و اذیت محسوس کرتے رہتے ہیں، اگر انسان سنجیدگی سے اس بات پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں کیوں بھیجا ہے، اور پھر دنیا میں بھیج کر اس پر اپنا کیا حکم صادر کر دیا ہے تو اس دنیا میں جنگ و جدل اور خون خرابہ نہ ہو، کوئی کسی کا جانی دشمن نہ بنے بلکہ پوری دنیا امن و شانتی کا گہوارہ بن جائے۔“ حکیم وقار نے کہا۔

”حکیم صاحب یہی تو اصل مسئلہ ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنی ذمہ داریوں کے متعلق بغور سوچتا نہیں، قناعت کو اپنا نہیں اور آسمان پر چڑھنے کے تک و دو میں دندناتا ہوئے سر پٹ بھاگتا رہتا ہے۔ خیر جو حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے وہی نقصان میں رہتا ہے۔“

اتنے میں ایک ملازم آیا اور بولا۔ ”حکیم صاحب بغیر اجازت اندر آنے کے لئے معذرت خواہ ہوں، دراصل ایک صاحب آئے ہیں جو کہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، جب وہ بائیں کر رہے تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں اندر بھیج دوں۔“

”لگتا ہے وہ بہت زیادہ پریشان ہیں، انہیں جلدی سے اندر بھیجو۔“ حکیم وقار نے کہا۔ یہ سن کر ملازم کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور پھر جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک

بارش بزرگ تھے، سینے تک آتی ہوئی سفید داڑھی اور پٹھرے ہوئے بال، چہرے پر واضح طور سے فکر و تدنظر آ رہا تھا۔ آتے ہی گڑ گڑانے لگے۔ ”حکیم صاحب میں بہت زیادہ پریشان حال ہوں براۓ مہربانی میرے بچے کو بچائیں، کل رات سے اس کی حالت بہت زیادہ خراب ہے، رات میں اچھا بھلا سویا تھا کہ آدمی رات میں اچانک اٹھ بیٹھا اور وقفے وقفے سے خون کی لٹلیاں کرنے لگا ہے۔

میں نے بہت کوشش کی اسے آپ کے پاس لانے کی مگر اتنی کوشش کے باوجود بھی وہ اپنی چارپائی سے اٹھ نہیں اور پھر جب میں نے زبردستی کی تو اس نے مجھے دھکا دے دیا جس سے میں کافی دور جا کر، حالانکہ وہ میرا بہت ہی نیک اور فرمانبردار بچہ ہے، اس نے بھی مجھ سے زیادہ تیز آواز میں بات تک نہیں کی اور نہ ہی کبھی اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات بھی کی، گاؤں کے کئی اور نو جوانوں نے بھی کوشش کر لی مگر وہ کسی سے بھی اٹھ کر نہیں دے رہا ہے، کئی نو جوانوں کی کلائی مروڑ کر انہیں الگ کر چکا ہے، کوئی بھی اس کے قریب جانے سے ڈر رہا ہے، میں سامنے والے گاؤں شانتی پور میں رہتا ہوں۔

حکیم صاحب میرے بچے کو بچائیں، میں تا زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا، وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، اس کے علاوہ کوئی اولاد نہیں۔“ اور یہ بول کر بزرگ سسکیاں بھرنے لگے۔

حکیم وقار جلدی سے اٹھے اور بزرگ کو پکڑ کر کرسی پر بیٹھایا اور کندے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے لگے۔ ”آپ پریشان نہ ہوں، اللہ کی مہربانی سے آپ کا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اسی طرح کی اور بھی تسلی آمیز باتیں حکیم وقار کرتے رہے۔

مگر جب انہوں نے رولو کا پر نظر ڈالی تو رولو کا اپنی آنکھیں بند کئے بالکل خاموش تھا۔ پھر چند لمبے بعد رولو کا نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بزرگ کی طرف دیکھا۔



”محترم! آپ کے بچے کو کوئی جسمانی بیماری نہیں بلکہ اس کے ساتھ بہت ہی مہلک ہوائی پتھر ہو گیا ہے، آپ فکر نہ کریں، آپ کا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

پھر رولوکا حکیم وقار سے مخاطب ہوا۔ ”حکیم صاحب بزرگ کی باتیں سن کر مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ بچے کو کوئی جسمانی بیماری نہیں کیونکہ اگر کوئی جسمانی بیماری ہوتی تو وہ نوجوان ان کے ساتھ بدتمیزی کی اور انہیں آتا، اور پھر اس نے ان کے ساتھ بدتمیزی کی اور انہیں زور کا دھکا دیا، جسمانی بیماری والے مریض ایسی حرکت نہیں کرتے بلکہ ان مریضوں کو کسی بھی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس لے جائیں تو وہ خاموشی سے چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔“

ویسے میں نے معلوم کر لیا ہے کہ اس پر کوئی بھاری اثر ہو گیا ہے، بزرگ بہت زیادہ پریشان ہیں اور پھر یہ معاملہ بہت سمجیر بھی ہے اس میں زیادہ وقت نہیں، کرنے والے نے بہت تیز اور مہلک عمل کر دیا ہے، سفلی عمل ہے جو کہ جان لیوا ثابت ہوگا، اس کی موت کے لئے نین دن کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔

حکیم صاحب! آپ فکر نہ کریں میں ان بزرگ کے ساتھ جا رہا ہوں، میں نے اگر دیر کر دی تو ہو سکتا ہے کہ بچے کی جان.....“ اور رولوکا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ٹھیک ہے آپ جائیں، میں آپ کے لئے دعا گو ہوں۔“ حکیم وقار نے رولوکا سے کہا۔

”جناب آپ چلیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کے پاس کیا کوئی سواری ہے یا پھر کسی سواری کا انتظام کروں۔“ رولوکا بولا۔

”میرے پاس اپنی گھوڑا گاڑی ہے، آپ تشریف لے چلیں۔“ بزرگ نے بدحواسی کے عالم میں کہا اور چلتے ہوئے رولوکا کے ساتھ باہر آ گئے۔ باہر ایک گھوڑا گاڑی کھڑی تھی اسے دیکھ کر بزرگ نے کہا۔ ”حکیم صاحب یہی میری گاڑی ہے۔ آپ گاڑی میں تشریف رکھیں۔“

رولوکا گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گیا تو بزرگ نے کوچوان کی جگہ سنبھالی اور گھوڑے کو چابک سے اشارہ کیا تو گھوڑا آگے بڑھنے لگا اور پھر چند منٹ بعد ہی ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

ایک گھنٹہ سے پہلے ہی گھوڑا گاڑی ایک گاؤں میں پہنچ کر ایک گھر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بزرگ نیچے اترے اور بولے۔ ”حکیم صاحب یہی میرا گھر ہے آپ نیچے تشریف لائیں۔“ یہ سن کر رولوکا گھوڑا گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ گھر کے باہر کئی لوگ کھڑے تھے اور باتوں میں مصروف تھیں۔ بزرگ کو دیکھ کر ایک صاحب آگے بڑھے اور بولے۔ ”کمال الدین اچھا ہوا کہ تم آ گئے، ہم کافی دیر سے باہر کھڑے ہیں، جب تم گئے تھے تو اس وقت ہم اندر ہی تھے مگر پھر اچانک شرفا اپنی چارپائی سے اٹھا اور میری کلائی پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور بولا۔ ”اُوئے بڑھے چل یہاں سے بھاگ جا، یہاں کوئی تماشہ نہیں ہو رہا ہے کہ تم سب بیٹھے ہو۔ چلو جلدی سے باہر جاؤ ورنہ ہر ایک کی گردن مروڑ دوں گا، جس کے لئے تم لوگ آئے ہو اور پہاڑ اُڑے رہے ہو، اب یہ زیادہ دیر کا مہمان نہیں، میں اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا، گرو اپنی جگہ بیٹھے میرا اور اس کا انتظار بڑی بے چینی سے کر رہے ہیں، میرا نام چندرا ہے اور تم لوگ چندرا کی طاقت سے واقف نہیں، چلو بھاگو یہاں سے۔“

اور ہم لوگ فوراً سر پر پاؤں رکھ کر باہر نکل آئے اور اس وقت سے یہیں کھڑے ہیں۔“

”سلامت بھیا! سب ٹھیک ہو جائے گا، میں حکیم صاحب کو لے آیا ہوں، یہ بھی ہماری خوش قسمتی اور اللہ کی مہربانی کہ حکیم صاحب مجھے وقت پر مل گئے، ورنہ.....“ اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی، وہ رولوکا سے بولے۔ ”حکیم صاحب آپ اندر تشریف لے چلیں۔“

کمال الدین رولوکا کو لئے ہوئے اندر کمرے میں آ گئے، ان کے پیچھے جو چار لوگ باہر کھڑے تھے وہ بھی اندر آ گئے۔

اندر کمرے میں ایک صحت مند نوجوان چارپائی

پر بے سدھ پڑا تھا۔ پورے کمرے میں چٹائی بھیجی ہوئی تھی۔ سارے لوگ چٹائی پر بیٹھ گئے تو رولوکا نے کمال الدین سے کہا۔

”کمال صاحب آپ ایک کٹورے میں تھوڑا سا صاف پانی لائیں اور ساتھ ہی ایک مٹی کی ہانڈی میں کونسلے یا ایلے کی آگ بھی دہکا کر لائیں اور ہاں تھوڑی سی رائی بھی لیتے آئے گا۔“

یہ سن کر کمال الدین اٹھے اور اندر گھر میں چلے گئے۔ ویسے اندر گھر میں جیسے پورے گاؤں کی عورتیں موجود تھیں۔

چند منٹ میں ہی کمال الدین نے ایک مٹی کی ہانڈی میں دہکا ہوا کونسل اور ساتھ میں ایک کٹورے میں پانی اور ایک چھوٹے پیالے میں تھوڑی سی رائی لا کر رولوکا کے سامنے رکھ دی۔ اور ایک طرف کو بیٹھ گئے۔

رولوکا نے کٹورے میں موجود پانی پر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا، تین بار پانی پر پھونکنے کے بعد تھوڑا سا پانی چلو میں لیا اور زور سے چارپائی پر لینے ہوئے شرفو کے چہرے پر چمک کر دیا، پانی کا چہرے پر پڑنا تھا کہ شرفو کے منہ سے ایک بہت ہی ڈراؤنی اور وحشت ناک غراہٹ نکلی، جسے سن کر اس جگہ بیٹھے ہوئے لوگ لرز کر رہ گئے۔

شرفو فوراً سوتے سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور قہر برساتی آنکھوں سے رولوکا کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر رولوکا بولا۔ ”اُوئے تو کون ہے؟ اپنا نام بتا! اور یہ بھی بتا کہ تو نے اس نوجوان پر دھرتا کیوں دیا، تو کیا چاہتا ہے، جلدی بول ورنہ سمجھ.....“ رولوکا نے بات یہی تک کہ تھی کہ شرفو کے منہ سے کرخت اور بھاری آواز نکلی۔

”اُوئے تو کون ہے؟ اور تیری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی اور یہ جو تو نے مجھ پر گرم پانی پھینکا ہے، اس پانی سے میرا سارا شریر مل رہا ہے، میرے شریر میں انگارے بھر گئے ہیں، اگر تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو جلدی سے اٹھ اور یہاں سے چلتا بن۔ دیکھ میں زیادہ بولنے کا عادی نہیں، میرا نام چندرا ہے۔“

اس درمیان رولوکا نے اپنے چلو میں پانی لیا اور سامنے چارپائی پر بیٹھے ہوئے شرفو پر پھینک دیا۔

پانی کا جسم پر پڑنا تھا کہ شرفو کی آنکھیں جیسے انگارہ بن گئیں، اس کی آنکھوں میں روشنی نظر آنے لگی جیسے کہ وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ دودھ دھکتے ہوئے انگارے ہوں، منہ سے باشت بھرزبان باہر نکھل پڑی، زبان کیا تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے تازہ خون کا لوتھڑا ہو، زبان بار بار اندر باہر کو ہونے لگی تھی کہ پھر اچانک رولوکا نے ایک چلو پانی اور اس کے جسم پر پھینک دیا۔ اب کی بار پانی کا جسم پر پڑتے ہی، منہ سے باہر کو اندر باہر نکلتی ہوئی زبان اندر کو ہونٹی اور شرفو کرخت آواز میں قہقہہ لگنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ جنونی ہو گیا ہو اور پھر اس کے منہ سے گرم گرم بھاپ باہر کو نکلنے لگی۔

وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ یہ دیکھ کر اٹھنے لگے کہ رولوکا نے ان لوگوں کو اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا جسے دیکھ کر لوگ اپنی جگہ کم کر بیٹھ گئے۔

”اومورکھا! اب تو جلدی سے بھاگ جا، اگر اب بھی تو نہیں اٹھا تو تیری اور یہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی گردنیں مروڑ کر رکھ دوں گا۔“

اگر تجھ میں شفی ہے تو اب سنبھال۔ اور اس کے ساتھ ہی شرفو کے منہ سے ایک بھیا تک شکل وجود برآمد ہوا، اس وجود کا صرف چہرہ ہی نظر آ رہا تھا، چہرہ اتنا بھیا تک اور ڈراؤنا تھا کہ شاید ہی کسی نے اپنی زندگی میں اتنا بھیا تک چہرہ دیکھا ہوگا۔

رولوکا نے چلو میں پانی بھرا اور شرفو پر پھینک دیا۔ اب کی بار پانی کا جسم پر پڑنے ہی شرفو کے منہ سے شریر کے مشابہدھاڑ کی آواز نکلی۔

”اُوئے مورکھا، تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا، میرے گرو کا حکم ہے کہ میں اسے ساتھ لئے بغیر یہاں سے نہ ٹلوں، میں ہر صورت اسے لے کر ہی جاؤں گا۔ اب زیادہ سے میرے پاس نہیں، بس صرف ایک رات کا سے ہے، کل کا سورج یہ نہیں دیکھ پائے گا۔“

”کیا تجھ یہ پتہ ہے کہ تو کل کا سورج دیکھ سکے



میری بات مان لی تو بچ جائے گا ورنہ جل کر بھسم ہو جائے گا، ابھی جو تونے شعبہ دکھایا، یہ بند کرو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تیرا گرو اپنے استھان پر شکستے میں جکڑا پڑا ہے، میرے کارندوں نے اسے دبوچ کر بے بس کر دیا ہے۔“

”مورکھ! میری بات مان لے، ورنہ تو بھی بچھتا ہے گا، تجھے بھی میرے گرو کی ہشتی کا اندازہ نہیں، بڑے بڑے ہیرا درمیا میرے گرو کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، تو میرے گرو کو نہیں جانتا، گرو مہا ہشتی شالی کے مالک ہیں، میں تجھے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میں کسی صورت بھی اس مالک کا پران لئے بغیر خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔“ یہ باتیں شرفو کے منہ سے نکلتیں۔

”اگر تو نہیں مانتا تو نہ مان یہ تیری مرضی۔“ اور یہ بول کر رولوکا نے مٹی کی ہانڈی میں دیکھتے ہوئے کوکلوں کی طرف دیکھ کر پھونک ماری اور پھر مٹی کی ہانڈی کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے ہاتھ میں رائی لے کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر رائی پر پھونک مار کر رائی کو دیکھتے ہوئے کوکلوں پر ڈال دیا۔ رائی کا آگ پر پڑنا تھا کہ اچانک گاڑھے رنگ کا پیلا دھواں اوپر کو اٹھنا شروع ہوا، اور پھر آہستہ آہستہ تمام دھواں چار پائی کے چاروں طرف جمع ہونا شروع ہو گیا، پھر رولوکا کے اشارے پر وہ دھواں جو کہ چار پائی سے کچھ دوری پر جمع ہوا تھا، روٹن دان کے راستے باہر کو نکلتا چلا گیا، جب وہ دھواں باہر نکل گیا تو رولوکا نے چار پائی کے گرد جو دھواں جمع ہوا تھا، رولوکا کی انگلی کا اشارہ پاتے ہی چار پائی کے گرد اپنا گھبراہٹ کا رنگ کر دیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے شرفو کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اچانک شرفو نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ کر چیخا شروع کر دیا۔ ”اوئے مورکھ، مجھے چھوڑ دے، اوئے میں نشٹ ہو رہا ہوں، مجھے چھوڑ دے، مجھے مٹی دے، میں یہاں سے چلا جاؤں گا، میں گرو کی باتوں میں آ کر پھنس گیا، اوئے ظالم مجھ پر دیا کر، مجھ پر دیا کر، مجھے

گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے ساتھ ساتھ گرو کا بھی وجود ختم ہو جائے۔ اب میں کہتا ہوں کہ تو اپنی خیر منا، اور اپنے گرو کی بات نہ مان کر یہاں سے چلا جا، میں تیری جان آزاد کر دوں گا، اور اس میں تیری بھلائی ہے، میری بات پر سنجیدگی سے غور کر، ورنہ پھر تیرا ستیا ناس ہو جائے گا، تیرا وجود اس سنار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔ تیری اور تیرے گرو کی ہشتی قتی ہے تو اس کا اندازہ کر لے کہ تو اس چار پائی کی حدود سے ایک انچ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔“ رولوکا بولا۔

”مورکھ تجھے بھی اندازہ نہیں کہ میرا گرو اپنے استھان پر بیٹھا میری سہانٹا ضرور کرے گا، اور تیرا ادبائے بھی، تو میرے ساتھ یہ جربہ اس لئے کر بیٹھا کہ میرے گرو کا حکم ہے کہ میں اس پر اس کا شریا یک پل کے لئے بھی نہ چھوڑوں، اگر مجھے آزادی ہوتی کہ میں آگے پیچھے ہو جاؤں تو پھر میں تجھے دکھاتا کہ ہشتی کیا ہوتی ہے، میں اپنے گرو کا بھمان نہیں ہونے دوں گا۔ ان تمام باتوں کا میرے گرو کو پتہ لگ گیا ہو گا جو کہ تو میرے ساتھ کر رہا ہے۔“ اور پھر شرفو کے منہ سے ایک زبردست اور کان پھاڑ دینے والی چیخ نکلی۔ چیخ اتنی زوردار تھی اور ساتھ ہی آندھی نما ہوا بھی اس میں شامل تھی جس سے کمرے میں موجود ساری چیزیں ہلنے لگیں اور کمرے میں درود یوار پر ہی نہیں چھت پر موجود گرد بھی چھڑنے لگی تھی۔

اس کے اس حربے کو دیکھ کر کمرے میں موجود دیگر لوگ اور شرفو کے والد کمال الدین بھی بدحواس ہو کر یک بیک اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے کہ اچانک رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ”آپ لوگ اپنی اپنی جگہ فوراً بیٹھ جائیں، یہ اس قسم کا صرف شعبہ بازی کر رہا ہے تاکہ میں ڈر کر یہاں سے چلا جاؤں اور ساتھ ہی آپ لوگ بھی ڈر کر بھاگ جائیں اور کمال الدین صاحب خوفزدہ ہو کر مجھے یہاں سے چلے جانے کا کہیں۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر بیٹھ رہیں۔“

رولوکا بولا۔ ”چندرا اب تو اپنی خیر منا، میں تجھے چند پل دیتا ہوں کہ تو اچھی طرح سوچ لے، اگر تو نے



جانے دے، مجھے مت مار، میں تیرے آگے بٹتی کرتا ہوں، مجھے کتے دے، ہائے..... ہائے..... اوہ..... اوہ..... اس طرح کی اور بھی آوازیں شرفو کے منہ سے نکلنے لگیں، میں جا رہا ہوں، مجھے جانے کا راستہ دے، میرے راستے کی تمام رکاوٹیں ہٹا دے، میں چلا جاؤں گا، مجھ پر دیا کر، مجھے جانے دے۔“

”اچھا خیر، اب جلدی سے بتا دے کہ تو یہاں تک پہنچا تو کیوں پہنچا، کس دشمنی پر تیرے گردنے تجھے یہاں بھیجا، وہ کون ہے جو دشمنی پر اتر آیا، اور تیرے گرد کے پاس آیا، چل جلدی سے بتا دے۔“ رولوکانے پوچھا۔

”اس گاؤں کا گنگا رام گرد کے پاس آیا تھا۔ کھیتوں میں پانی لگانے پر ان کی منہ ماری ہوئی تھی، اسی کارن گنگا رام نے دشمنی کے عیوض ایسا کرایا۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ خیر شروع میں تو نے میری بات نہ مان کر اپنا نقصان کر لیا، اب تیرا حال میں خاتمہ ہے، میں نے تو تجھے بہت سمجھایا تھا مگر افسوس کہ تو نے.....“ اور پھر رولوکانے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو تمام دھواں شرفو کی ناک اور کان کے راستے اندر جانا شروع ہو گیا۔ تمام دھواں جب اندر چلا گیا تو پھر وہ دھواں اندر سے کان اور ناک کے راستے باہر نکلتا شروع ہوا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام دھواں نے ایک ہیولہ کی شکل اختیار کر لی اور پھر وہ ہیولہ آہستہ آہستہ رولوکانے کے پاس پڑی ہوئی ہانڈی کی طرف آئے لگا۔

اس ہانڈی میں دیکھتے ہوئے کوئلے موجود تھے۔ اور پھر وہ ہیولہ بڑے کرب و اذیت کی حالت میں ہانڈی کے اوپر آ کر ٹھہر گیا۔

رولوکانے اس ہیولے کو غور سے دیکھتا رہا پھر رولوکانے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو وہ ہیولہ ہانڈی کی آگ میں اتر گیا۔ اس کا ہانڈی میں اترنا تھا کہ ہانڈی میں دیکھتے ہوئے کوئلے بھڑکنے لگے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے دیکھتے ہوئے کوئلوں میں بھونچال آ گیا ہے، مگر انگارے بنے کوئلے جال ہے کہ ہانڈی سے باہر نکلے ہوں۔ رولوکانے

منہ سے نکلا۔ ”خس کم جہاں پاک۔“ اس کے بعد رولوکانے کچھ پڑھ کر ہانڈی میں پھونک ماری تو ہانڈی میں موجود دیکھتے ہوئے کوئلے خود بخود راگھ کی شکل اختیار کر گئے تو رولوکانے ہانڈی پر دھکن رکھ کر ہانڈی کا منہ بند کر دیا۔

ہانڈی کا منہ بند ہوتا تھا کہ چار پائی پر موجود شرفو چار پائی پر اوندھے منہ گر کر بے سدھ ہو گیا۔ پھر رولوکانے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر شرفو کی طرف پھونک ماری تو شرفو کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں اور اچنبھے کی حالت میں لوگوں کو دیکھنے لگا۔

رولوکانے بولا۔ ”کمال الدین صاحب! سارے حالات کھل کر آپ لوگوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ جس پنڈت نے عمل کیا تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے، اور پھر آپ کا دشمن گنگا رام بھی بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ جائے گا، اب چاہے وہ لاکھ بھاگ بھاگ کرے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور یہ تمام باتیں آج رات میں آپ سب کے دماغ سے نکل جائیں گی، کسی قسم کی کوئی بھی کارروائی آپ لوگوں کو یا نہیں رہے گی، اب آپ کا بچہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے، اور آئندہ بھی ٹھیک ہی رہے گا۔

اس ہانڈی کو آپ لے جا کر گاؤں سے باہر جو ندی بہہ رہی ہے اس میں ڈال دیجئے گا، اور واپسی پر کسی قسم کی بھی آوازیں سنائی دیں، یعنی اگر کوئی آپ کا نام لے کر پکارے تو آپ برائے مہربانی پلٹ کر پیچھے مت دیکھئے گا، یہ خاص تاکید ہے۔“

”ٹھیک ہے حکیم صاحب! ایسا ہی ہوگا۔“ کمال الدین نے کہا۔ ”حکیم صاحب آپ ہمارے ساتھ اگر کھانا کھائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

یہ سن کر رولوکانے بولا۔ ”کمال الدین صاحب میرا پیٹ بھرا ہوا ہے، کھانے کی کوئی بات نہیں، میں جلد از جلد مطب پہنچنا چاہتا ہوں، مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔“

”حکیم صاحب اگر آپ کھانا نہیں کھاتے تو ہمارے ساتھ ایک کپ چائے پی لیجئے۔“ کمال الدین

نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”اور آپ بتائیں اس کا نذرانہ کتنا ہے، آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے، میرے بچے کو نئی زندگی دی ہے، آپ نہ ہوتے تو آج میرا بچہ موت کے منہ میں چلا جاتا۔ میں تاحیات آپ کا احسان مانتا رہوں گا۔“ کمال الدین نے کہا۔

”کمال الدین صاحب کی قسم کا بھی نذرانہ نہیں چاہئے۔ میں یہ سارا کام اوپر والے کی خوشی کے لئے کرتا ہوں، اوپر والے نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے، بس آپ مجھے دعاؤں میں یاد کر لیا کیجئے گا، چلئے اگر آپ کی خوشی چائے میں ہے تو چائے پی لوں گا مگر ذرا جلدی کیجئے۔“ رولوکانے بولا۔

چند منٹ میں چائے آ گئی تو کمرے میں موجود سب نے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد رولوکانے بولا۔ ”کمال الدین صاحب اب مجھے اجازت دیں۔“ یہ سن کر کمال الدین بولے۔ ”چلئے میں آپ کو مطب تک چھوڑ آتا ہوں۔“

”کمال الدین صاحب اس کی ضرورت نہیں، میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ رولوکانے بولا۔

”حکیم صاحب یہاں سے مطب کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اور پیدل جانا، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے، اور اس طرف سے کوئی گاڑی بھی دلی تک نہیں جاتی۔“ کمال الدین نے کہا۔

”دراصل مجھے گاؤں سے باہر جوندی ہے وہاں پر ایک ضروری کام ہے، اور میں اکیلا ہی جاؤں گا، کسی کا ساتھ مناسب نہیں اور آپ مجھے کی کوشش کریں، میں آرام سکون سے مطب تک پہنچ جاؤں گا۔ میں اپنی خوشی اور ایک اہم کام کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔“ رولوکانے بولا۔

”ٹھیک ہے حکیم صاحب! جیسی آپ کی مرضی، ہم آپ کی خوشی میں خوش ہیں، میں ایک بار پھر آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں، ہم اسی قابل ہیں اس کام کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ دے گا، آپ جیسے بہت کم لوگ دنیا میں موجود ہیں، جو اس طرح دوسروں کے کام آتے ہیں۔ خیر میں آپ کو رات دن دعاؤں میں یاد کروں گا۔“ کمال

الدین نے کہا۔ اور پھر رولوکانے سب سے ہاتھ ملایا اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چلنا شروع ہو گیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اب وہ گاؤں سے باہر نکل آیا ہے اور کسی کی نظر اس پر نہیں تو ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر مطب کے اپنے کمرے کا تصور کیا اور آنکھیں بند کر لیں تو پلک جھپکتے ہی وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجتے ہی روشاک بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا، اسے کسی پل بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ اندرونی طور پر وہ بہت سہا ہوا تھا۔ وہ ہر صورت میں خوشبو کے پاس جانا چاہتا تھا۔ لیکن خوف اس کو اپنے ٹکٹے میں جکڑ چکا تھا مگر رات کے پونے بارہ بجتے ہی اس کی بے چینی میں ناقابل برداشت حد تک اضافہ ہو گیا تو وہ عاتبانہ طور پر اپنے کمرے سے نکلا اور خوشبو کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

اور پھر چند لمحے میں وہ خوشبو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ خوشبو اپنے ماتھے پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھے خیالوں کی دنیا میں غرق تھی کہ اچانک اسے سنائی دیا۔ ”خوشبو“ اپنا نام سنتے ہی وہ خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئی اور آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کے سامنے روشاک کھڑا تھا۔ اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ چہرے پر صاف طور پر پریشانی عیاں تھی جسے خوشبو نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا۔

”آپ آگئے! میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ اور کل رات آپ اس طرح گئے کہ مجھے بالکل بھی خبر نہ ہوئی، ورنہ آپ تو ہمیشہ مجھے بتا کر جاتے رہے ہیں، کل کیا کوئی اہم کام یاد آ گیا تھا کہ مجھے بتائے بغیر ہی چلے گئے۔“ خوشبو ہر ایک لفظ کو چباتے ہوئے بولی۔

”خوشبو ایسے ہی ایک اہم کام پڑ گیا تھا۔ اور اب رجسٹری میں مجھے جانا پڑا، خیر تم فکر نہ کرو، ایسے کام بھی کبھار پڑتے رہتے ہیں۔“ یہ بول کر وہ خوشبو کے قریب



ہوا، اور جب اس نے خوشبو کو چھونے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو یک دم ٹھٹھک گیا کیوں کہ اس کے اور خوشبو کے درمیان ایک اندکی دیاور حاصل تھی۔

یکدم اس کا دماغ غلاؤں میں پھکر کھانے لگا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر خوشبو سے ہٹ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ مگر اب اس کے اور خوشبو کے درمیان اندکی دیاور حاصل نہیں تھی اور یہ دیکھتے ہوئے وہ اچھینے میں پڑ گیا۔ آج اس کے چہرے پر ہر دنی جھائی ہوئی تھی جسے خوشبو نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ لیکن خوشبو کسی بھی رد عمل کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔

بستر پر بیٹھنے کے بعد مزید وہ خوشبو کے قریب کھسک گیا اور بولا۔ ”خوشبو دراصل آج میری طبیعت اندرونی طور پر کچھ تازہ ہے، پہلے تو میں نے سوچا کہ آج کی رات تمہارے پاس نہ آؤں مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قدم تمہارے گھر کی طرف اٹھنے لگے، بس یہی تو اصل معاملہ ہے کہ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔

اور ہاں یاد آیا۔ وہ سامنے بیک پڑا ہے۔ اس میں اچھی خاصی رگم موجود ہے اپنے والد صاحب کو دے دینا تاکہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق خرچ کریں، ان سے کہنا کہ اگر اور چاہے ہوں تو میں لیتا آؤں گا۔“ اتنے میں اس نے اپنے ہاتھ خوشبو کی طرف بڑھادیئے اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں خوشبو کا ہاتھ لیتا چاہا اور جوہنی اس کا ہاتھ خوشبو کے ہاتھ سے چھوا تو اسے ایک زبردست کرنٹ کا جھٹکا لگا اور فوراً وہ اپنے ہاتھ کو ہلانے لگا مگر منہ سے بولا کچھ بھی نہیں۔

کسی طرح وہ اپنی تکلیف کو خوشبو پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس کیفیت کو خوشبو نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

آج سے پہلے کبھی اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی دونوں آنکھوں کو بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ خوشبو بغور اسے یک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ پھر خوشبو سے رہا نہیں گیا تو وہ بولی۔ ”کیا بات ہے؟ آج کچھ زیادہ ہی

اپ سیٹ لگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے تو میں نے کبھی آپ کی ایسی حالت نہیں دیکھی۔ اگر آپ کی طبیعت زیادہ تازہ ہے تو آپ تشریف لے جائیں اور جا کر مکمل آرام کریں۔“

”خوشبو! نہ جانے مجھے آج کیا ہو رہا ہے، مجھے شک ہو رہا ہے کہ میرا کوئی جانی دشمن مجھے پریشان کر رہا ہے، مگر میں نے اس معاملے میں بہت غور کیا کہ میرا دشمن کون ہو سکتا ہے؟ لیکن جہاں تک مجھے معلوم پڑتا ہے کہ اس طرح کا جبراً کوئی بھی دشمن نہیں۔

آج کل میں جن حالات سے دوچار ہو رہا ہوں تو کبھی کبھی میرے دل میں یہ بھی آتا ہے کہ کہیں میرے والد صاحب کو تو تمہارا اور میرے حالات کا علم نہیں ہو گیا اور اس طرح خفیہ طور پر وہ میری نگرانی کے ساتھ ساتھ مجھے پریشان کر رہے ہوں تاکہ میں دل برداشتہ ہو کر تم سے ملنا چھوڑ دوں۔

وہ کھل کر مجھ سے بات نہیں کر سکتے اور یہی راستہ ان کے دماغ میں آیا ہو کہ اسے زیادہ پریشان کر دو، اس کے راستے میں اتنی زبردست رکاوٹیں کھڑی کر دو کہ اس سے نا قابل برداشت ہو جائے۔

مگر یہ خیال پھر دل میں آتا ہے کہ یہ ناممکن ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں مانا کہ میرے والد بہت اصول پسند اور دین کے پابند ہیں اور اس طرح کی حرکت کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتے، میں بچپن سے ان کے اصول اور طور طریقے دیکھتا آ رہا ہوں، وہ لارے لپے اور الجھاؤ والی کوئی بات نہیں کرتے، حقیقت پسند ہیں اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔

ان کی صاف گوئی اور انصاف پسندی دور دور تک دیگر جنات کے قبیلوں تک پھیلی ہوئی ہے، اگر کوئی مسئلہ زیادہ الجھ جاتا ہے اور کسی قبیلے کے سردار کی سمجھ میں بات نہیں آتی تو وہ سردار والد صاحب سے مشورہ کرنے آ جاتا ہے، یا پھر کبھی کبھی والد صاحب کو اپنے قبیلے میں لے جاتا ہے اور اس طرح اس کے قبیلے میں درپیش مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔“ روشاک نے کہا۔

اگر دیکھا جائے تو روشاک پر ایک طرح سے لرزہ طاری تھا مگر وہ اپنے بیرونی و اندرونی کیفیت پر خاصی حد تک قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

خوشبو بولی۔ ”آپ آج عجیب کیفیت سے دو چار ہیں، آج تو آپ مجھ سے بھی ہٹ کر بیٹھے ہیں، کیا میں آپ کو بری لگنے لگی؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، ارے تم پر تو جان بھی قربان ہے۔“ وہ پھر آگے بڑھ کر اس نے خوشبو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس مرتبہ جب اس نے خوشبو کا ہاتھ پکڑا تو اسے کسی قسم کا بھی کرنٹ جیسا جھٹکا نہیں لگا۔ وہ پھر اچھینے میں پڑ گیا۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جب اس نے خوشبو کے ہاتھ پکڑے تھے تو اسے زبردست کرنٹ کا جھٹکا لگا تھا اور اس بنا پر اس نے فوراً خوشبو کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس نے خوشبو کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبانے شروع کر دیا۔ اب وہ والہانہ طریقے سے خوشبو کے قریب ہو گیا۔ اب اس کے چہرے پر خوشی کے آثار جھلکنے لگے تھے، اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی خوشی رقصاں تھی، وہ قریب بلکہ خوشبو کے بہت قریب ہو گیا اتنا قریب کہ اس کی سانس کی گرامٹ خوشبو اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگی۔

جب بھی وہ خوشبو کے بہت قریب ہوتا تو خوشبو اندرونی طور سے بے سدھ ہی ہو جاتی، اس کی ذہنی صلاحیت جیسے مفقود ہو کر رہ جاتی، خوشبو بالکل نڈھال سی ہو کر خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی تھی۔

یہ تمام معاملہ یوں ہوتا تھا کہ روشاک کی آنکھوں سے عجیب طرح کی سفید ہلکی روشنی نکلیں کی صورت میں نکلتی اور خوشبو کی آنکھوں میں گھسٹی چلی جاتی۔ یعنی روشاک اپنی ماداری قوتوں سے خوشبو کا دماغ ساکت کر دیتا تھا اور پھر خوشبو کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔

اور پھر اس نے خوشبو کو اپنے دونوں بازوؤں میں پھنسا لیا کہ چانک اسے ایک زبردست جھٹکا کرنٹ کا لگا۔ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ وہ بستر سے نیچے فرش پر جا پڑا اور

خوشبو بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑی۔ خوشبو کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ بالکل ساکت تھی۔

روشاک پر کچھ طاری ہو چکی تھی۔ خوشبو کو وہ یک ٹک دیکھے جا رہا تھا کہ پھر وہ اچانک گھبراہٹ میں اٹھا اور بدحواسی کے عالم میں کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اس کی حالت بہت غیر اور دیدنی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اپنے قبیلے کی طرف اڑان بھری۔

مگر شاید وہ اس بات سے خبر نہ تھا کہ ایک سایہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ واقعی بہت بدحواس تھا۔ اگر وہ بدحواس نہ ہوتا تو شاید اسے اپنا پیچھا کرتا اس سائے کا علم ہو جاتا۔

چند لمحوں میں وہ اپنے قبیلے کے حدود میں پہنچ گیا۔ پھر وہ ایک حویلی نما مکان کے قریب پہنچا اور اس مکان میں گھستا چلا گیا اور پھر وہ سایہ جو کہ اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا وہ واپس اس جگہ سے پلٹ آیا۔

دراصل وہ سایہ کوئی اور نہیں بلکہ رولوک تھا، جس نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے قبیلے تک اس کا گھر دیکھنے آیا تھا۔ خوشبو کے کمرے میں جب روشاک آیا تھا اس وقت بھی رولوکا غائبانہ طور پر کمرے میں موجود تھا، پہلے تو رولوکا نے اس کے اور خوشبو کے درمیان ایک اندکی شیشے کی دیوار قائم کر دی، پھر اس دیوار کو ختم کر کے خوشبو کے جسم میں بجلی کا اثر پیدا کر دیا جس کی وجہ سے روشاک کو کرنٹ کا جھٹکا لگا۔ پھر رولوکا نے خوشبو کے جسم سے بجلی کا اثر ختم کر دیا۔

مگر پھر روشاک جب حد سے آگے بڑھنے لگا تو رولوکا نے دوبارہ خوشبو کے جسم میں بجلی کا اثر جو کہ زیادہ تھا پیدا کر دیا جس سے روشاک کو اتنا زبردست جھٹکا لگا کہ بستر سے وہ نیچے فرش پر جا پڑا تھا۔

رولوکا اپنے کمرے میں واپس آ کر اطمینان سے بستر پر لیٹ گیا اور نے والے وقت کے متعلق سوچنے لگا اور پھر اس کے ہونٹوں پر زبردست معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، پھر وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ ”روشاک کے نیچے تیری وہ حالت کر دوں گا کہ مگر کبھی تو بھول نہیں سکتا،



تو نے معصوم لوگوں پر بہت ظلم کر لیا۔“

ادھر روشاک اپنے کمرے میں بیچنے ہی بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔ وہ مابھی بے آب کی طرح تڑپنے لگا تھا۔ اسے ایک پل کے لئے بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں پھلنے لگیں اور کافی بڑی ہو گئیں۔ ساتھ ہی اس کی ہنسیوں چوڑی ہو کر تن گئیں اس کے لمبے بال ہنکے کی طرح کھڑے ہو گئے، اس کا چہرہ بہت ڈراؤنا اور ہمایا تک لگنے لگا تھا۔ اس کا غصہ اپنے انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

وہ بار بار اپنے ہاتھ کی دونوں مٹھیوں کو اس قدر زور سے بھینچتا کہ لرز کر رہ جاتا، وہ بھی بستر سے اٹھ جاتا اور کمرے میں ٹھیلنے لگتا اور پھر بستر پر اوندھے منہ پڑ جاتا اور پھر اسی صورت میں وہ وقت بھی آن پہنچا جب اس کے والد نماز فجر کے لئے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیتے۔ والد نے دروازہ کھٹکھٹایا تو فوراً وہ اپنے نارمل حالت میں آ گیا اور کپکپاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

والد نے جب اس کی حالت دیکھی تو گھبرا گئے اور بولے۔ ”روشاک خیریت تو ہے، تمہاری طبیعت بہت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔“ اور پھر انہوں نے اس کی کلائی پکڑی تو انہیں بہت زیادہ گرم مس محسوس ہوا، ”روشاک تمہیں تو زبردست بخار ہو رہا ہے، تم نے ہمیں بتایا نہیں۔ خیر تم لیٹ جاؤ، تم پر تو کچھ ٹپکی طاری ہے، نماز کے بعد میں حکیم صاحب سے بات کروں گا، وہ علی الصبح آ کر دوا دے دیں گے۔ گھبراؤ نہیں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ یہ بول کر وہ نماز فجر کے لئے چلے گئے۔

دوپہر تک روشاک کا بخار ٹھیک ہو چکا تھا۔ دوپہر کے بعد اپنے قبیلے سے تھوڑی دور درختوں کے جھنڈ میں ایک درخت کے پاس بہت اداس بیٹھا تھا اس کا دماغ سوچ سوچ کر شل ہو رہا تھا۔ جو حالات اس کے ساتھ پیش آرہے تھے ان کے متعلق وہ جتنا زیادہ سوچتا اس سے کہیں زیادہ الجھتا جا رہا تھا۔

اپنا سر نیچے کے مراتب کی صورت میں بیٹھا تھا

کراتے میں اس کے تین دوست ٹھیلے ہوئے اس طرف آنکھ۔ جب انہوں نے اس حالت میں دیکھا تو بہت تشویش میں پڑ گئے اور پھر وہ تینوں ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے اور اشارے سے ایک دوسرے سے پوچھنے بھی لگے کہ ”یہ معاملہ کیا ہے؟“

وہ تینوں اچھنبے کی حالت میں تھے انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا اس حالت میں دیکھ کر کیونکہ روشاک ایک بہت ہی منجلا اور کھلنڈرا جن زیادہ تھا۔ ایک منٹ بھی خاموش رہنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہر وقت اچھل کود، غل شاپڑہ چمچائے رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ کھاؤ پیو اور ہنسو کھیلو۔ اس سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں سوچتا تھا۔

وہ تینوں اس کے پاس خاموشی سے بیٹھ گئے اور اسی حالت میں کچھ وقت تک اسے دیکھتے رہے مگر وہ جس حالت میں تھا اس سے شس سے مس نہیں ہوا۔ تب ان میں سے ایک بولا۔ ”روشاک! روشاک!“

اپنا نام سنتے ہی اس نے فوراً سر کو اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور اسی اثنا میں اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔ اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے منہ سے کچھ بھی نہیں بولا بلکہ ٹکڑا نہیں دیکھنے لگا۔

ایک بولا۔ ”روشاک خیریت تو ہے ناں! کیا بات ہے تمہاری یہ حالت؟“

دوسرا بولا۔ ”جلدی سے بتاؤ ہوا کیا ہے؟“ تیسرا بولا۔ ”آخر بات کیا ہے؟ اگر کسی نے زیادتی کی ہے تو ہم اس کا نام اس دنیا سے مٹا کر رکھ دیں گے۔“

”الماش میری اس حالت کے پیچھے کوئی ناایدہ قوت ہے جس نے میری زندگی کو اجیرن کر دیا ہے، اس نے میرا پل کا چین چھین لیا ہے، وہ ناایدہ قوت میری قوت سے نہیں بڑھ کر ہے، لاکھ کوشش اور تنگ دود کے باوجود بھی میں اس کی گردنک کو نہ پاسکا۔ دراصل میں ایک آدم زاری کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور آج بھی میں

اس آدم زادی کی محبت کا دم بھرتا ہوں، اب میں اس بچے پر پہنچ چکا ہوں کہ اس آدم زادی سے ایک پل کی دوری بھی مجھے حال سے بے حال کر دیتی ہے۔

یہ سلسلہ ایک طویل عرصہ سے چل رہا ہے، اس بات کو میں نے سب سے چھپائے رکھا، وہ آدم زادی بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔

لیکن اب تھوڑے دنوں سے ایسا ہونے لگا ہے کہ میں جب بھی اس کے پاس جاتا ہوں، تو وہ ناایدہ قوت مجھے پریشان کرتی ہے، بلکہ اب تو مجھے اذیت دینے لگی ہے۔ میں اپنی تمام جتنی قوتوں کو آزما چکا ہوں مگر ہر صورت وہ میری پہنچ سے بہت دور ہوتا ہے۔ بلکہ ایک رات تو اس قوت نے مجھے اس آدم زادی کے پاس سے اٹھا کر فلاں ویرانے میں لا کر اوپر سے نیچے زمین پر پٹخ دیا تھا اور کل رات بھی اس قوت نے مجھے بہت اذیت سے دو چار کر دیا۔“ روشاک نے اتنا کہا اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔

”اس ناایدہ قوت اور ہستی کی ایسی کی تھی۔ تم اس آدم زادی کے گھر کا پتہ بتاؤں، ہم تینوں اس جگہ بھی جاتے ہیں، اس گھر اور اس گھر کے اطراف رہتے ہوئے یہ پتہ کرتے ہیں کہ وہ ناایدہ قوت ہے کون؟“

روشاک ہم تینوں تمہاری پریشانی کے لئے اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے، دوست کے لئے اگر دوست کی جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس آدم زادی یا اس کے گھر والوں نے کسی بڑے عامل سے رابطہ کیا ہو، اور وہ عامل تمہیں تنگ کر کے پریشان کر رہا ہے اور پھر آہستہ آہستہ تمہارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے تمہاری طاقت کو سلب کر دینا چاہتا ہو، اگر ایسی بات ہے تو یہ بہت پریشان کن ہے۔

اور ہاں یاد آتا ہے یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ہمارے سردار یعنی تمہارے والد کتنے با اصول ہیں۔ کیا وہ تمہاری اس حرکت یعنی آدم زادی سے میل جول کو سراہیں گے؟

ایک دوسرا بولا۔ ”اور پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری مدد کے چکر میں ہم سردار کی نظروں میں آ جائیں اور ہماری جان کی بخشی نہ ہو، خیر تم گھبراؤ نہیں، ہم خفیہ طور پر ان معاملات کو معلوم کرنے کی کوشش کریں گے، تم ایسا کرو کہ ہمیں اس آدم زادی کے گھر کا پتہ بتاؤ اور ساتھ ہی یہ بھی کرو کہ چند دن اس آدم زادی سے نہ ملنا، پھر دیکھتے ہیں کہ ہوتا کیا ہے۔“

”چلو اٹھو، اس میں دیر نہیں کرنی چاہئے، ہمارے ساتھ چلو اس کا گھر دکھانے کے لئے۔“ ایک نے کہا۔

روشاک اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر وہ چاروں غائب ہو کر خوشبو کے گھر کی طرف آنے لگے۔ اس جگہ پہنچ کر روشاک نے خوشبو کے گھر کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد وہ چاروں اپنے قبیلہ کی جانب واپس ہوئے تاکہ کافی سوچ بچار کرنے کے بعد اس مسئلے کا حل تلاش کریں اور ساتھ ہی اس ناایدہ قوت کا پتہ بھی چلائیں۔

جب وہ چاروں جن خوشبو کے گھر کے پاس آئے تو فوراً رولوکا کے کارندوں نے ان کے آنے کی خبر رولوکا کو دے دی۔ جسے سن کر رولوکا مسکرانے لگا تھا۔ اس کے بعد رولوکا نے اپنے کارندوں کو کسی انجان زبان میں کچھ ہدایات دیں اور پھر انہیں جانے کا اشارہ کر دیا۔

ادھر روشاک کے تینوں دوست الماش، داماش، کالاش، خوشبو کے گھر کے چکر لگانے لگے، ایک جاتا تو دوسرا موجود ہوتا، اندرونی بیرونی تمام جگہوں کو وہ چیک کرنے لگے تھے بلکہ غائبانہ طور پر ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی خوشبو کے گھر والوں کے درمیان موجود ہوتا تھا تاکہ گھر والوں کی زبان سے اس معاملے کی کوئی بھی بات نکلے، مگر تین دن ہو گئے تھے مگر اس درمیان کوئی ایسی بات یا پھر ہینک تک کو وہ نہ بھانپ سکے اور نہ ہی کسی ناایدہ قوت کو ہی محسوس کر سکے، تین دنوں کی ایک ایک پل کی خبر روشاک کو دیتے رہے اور پھر اس طرح پورا ہفتہ گزر گیا۔ وہ تینوں کی بھی ناایدہ قوت کا پتہ نہ چلا سکے۔

پورا ہفتہ روشاک خوشبو کے پاس نہیں آیا اور روشاک کے تینوں دوست تھک ہار کر اپنے قبیلے میں بیٹھ



گئے، ان تینوں کو یہ بھی ڈرتھا کہ کہیں ان کی ان حرکتوں کا علم سردار کو نہ ہو جائے اور پھر اس معاملے میں ان کی کھنچائی شروع ہو جائے۔

اس قبیلے کا مسلم اصول تھا کہ اس قبیلے کے کسی بھی جن سے کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر کسی نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو تکلیف پہنچائی تو پھر اس کی خیر نہیں، اور سارے جن اس معاملے میں احتیاط برتتے تھے کہ کہیں بھول کر بھی ان کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچ پائے۔

ٹھیک آٹھویں دن روشاک کو خوشبو کی جدائی ناقابل برداشت ہوگئی تو نماز جمعہ کے بعد وہ اپنے قبیلہ سے نکلا اور خوشبو کے کمرے میں آن دھکا۔ اس وقت خوشبو اپنے کمرے میں نماز پڑھ کر آرام کر رہی تھی کہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

جس وقت روشاک خوشبو کے گھر کے قریب پہنچا تھا کہ اس کی خبر رو لوکا کو اس کے کارندوں نے فوراً کر دی اور پھر رو لوکا مسکراتا ہوا غائبانہ طور پر خوشبو کے کمرے میں پہنچ گیا۔

اور دیکھا کہ خوشبو سے روشاک اپنی داستان جدائی سنانے میں مصروف ہے۔ ویسے خوشبو کافی سہی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

خوشبو ولی۔ ”حیرت ہے آپ ایک ہفتہ بعد آئے اور وہ بھی دن میں اور آپ تو خاص کر جمعہ کے دن کبھی آئے نہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ جمعہ کے دن آپ کے والد صاحب قبیلہ میں درس دیتے ہیں، محفل منعقد ہوتی ہے اور اس وقت قبیلے کے سارے جن اس محفل میں موجود ہوتے ہیں، مگر آپ کو اس محفل میں نہ پا کر آپ کے والد اور دیگر جنات کیا سوچیں گے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی کھوج شروع ہو جائے۔“

روشاک بولا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو جائے، خوشبو میں تمہاری جدائی.....“ اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس کے گال پر ایک زنائے دارزبردست چھڑ پڑا تھا۔ وہ چھڑ اتنا زردار تھا کہ وہ بدحواسی کے عالم میں

کمرے کے دروازے سے باہر کھڑا ہوا کہ دوش پر اپنے قبیلے کی جانب بڑے بڑے لگا رو لوکا بھی اس کے پیچھے ہی قبیلہ میں پہنچ گیا۔ رو لوکا غائب حالت میں تھا۔ بدحواسی کے عالم میں روشاک دوڑتا ہوا ایک طرف محفل میں آ کر بیٹھ گیا روشاک کی اس حرکت کو محفل میں بیٹھے ہوئے سب نے واضح طور پر محسوس کیا۔

روشاک کے والد ایک اونچی کرسی پر بیٹھے ہوئے درس دینے میں مصروف تھے کہ اچانک ان کے منہ سے نکلا۔ ”آدم زاد.....! ہماری محفل میں۔“ وہ خاموش ہو گئے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اپنے سردار کے منہ سے لفظ آدم زاد اچانک سن کر قریب کے جنات ششدر ہو گئے اور پھر انہوں نے دیکھا کہ سردار نے اپنی آنکھیں فوراً بند کر کے کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ رو لوکا بھی اس محفل میں غائبانہ طور پر آ کر سردار کے دائیں طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ سردار نے چند لمحے بعد اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر سردار کی بارعب آواز سنائی دی۔ ”قابل محترم آدم زاد۔ میں آپ کو سلام کرتا ہوں۔ میں آپ کے رتبے، قابلیت، بڑائی، علیت اور روحانی طاقت کا اقرار کرتا ہوں اور یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے کی اور وہ بھی اچانک۔ آپ کی ہمت اور وصلے کی میں داد دیتا ہوں کہ آپ نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا؟ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ اچانک بے مقصد یہاں آئے ہیں۔ میرے قبیلے کے سارے جنات آپ کی آمد کو محسوس نہ کر سکے مگر میرا تجربہ، میرا علم روحانی طاقت نے آپ کی آمد کو محسوس کر لیا۔

آپ کی آمد ہمارے لئے باعث خوشی ہے، کیا میں آپ کی آمد کے بابت جان سکتا ہوں۔ ویسے خیر تو ہے نا؟“

”سردار! خیریت نہیں ہے!“ رو لوکا بولا۔ ”خیریت نہیں ہے! کیا مطلب؟ آپ کھم کریں! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا ہم سے کسی قسم کی کوئی زیادتی ہوئی یا پھر.....“ سردار نے بات ادھوری

چھوڑ دی۔

سردار کی باتیں سن کر پوری محفل پر اچانک جیسے سنگت طاری ہو چکا تھا۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے تمام جنات اچنبھے کی حالت میں تھے۔ رو لوکا جو غائبانہ طور سے موجود تھا کس کو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سردار کو بھی نظر نہیں آ رہا تھا مگر سردار نے رو لوکا کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔

کچھ جنات غصے کی حالت میں بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی جناتی قوتوں سے یہ معلوم کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہے تھے کہ معلوم ہو جائے کہ یہ کون انسان ہے اور اتنی طاقت کا مالک ہے کہ دندناتا ہوا ہماری محفل میں آن دھکا اور وہ بھی بغیر اجازت اور بغیر کسی اطلاع کے بھی بکھارایا بھی ہوا تھا کہ کوئی بہت پہنچا ہوا انسان سردار کی دعوت پر یا پھر کسی اور ضرورت کے تحت سردار سے ملنے آ جاتا تھا۔ مگر آج یہ اچانک کیا ہوا کہ ایک اجنبی اس طرح اچانک وارد ہو گیا اور وہ بھی کسی شکایت کے تحت۔

سردار کے برابر والی کرسی پر ایک بہت ہی ضعیف باریش جن بیٹھا تھا، وہ سردار کی اور رو لوکا کی باتیں سن کر بالادب اپنی جگہ سے اٹھا اور سردار سے مخاطب ہوا۔ ”معزز سردار! اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟“

سردار نے کہا۔ ”محترم استاد آپ کو اجازت ہے آپ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ سکتے ہیں لیکن یہ خیال رہے کہ اجنبی اپنے مزاج پر کچھ بار نہ محسوس کرے۔“

”سردار ایسا نہیں ہو سکتا، میں ان تمام باتوں کو بخوبی سمجھتا ہوں اور میں نے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ محترم اجنبی نے جب یہاں اس طرح آنے کی جسارت کی ہے تو یقیناً کوئی بہت ہی اہم معاملہ ہے، اور اجنبی کی روحانی قوتیں بھی اپنی جگہ مسلم ہیں۔ ایک عام انسان اس جگہ آ ہی نہیں سکتا، ان تمام باتوں کے پیش نظر میں اجنبی کی مدعا جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔“ باریش جن نے کہا۔

پوری محفل میں جتنے بھی جنات موجود تھے ان سب میں ابھی تک رو لوکا کی آواز صرف وہ باریش جن

اور سردار نے ہی سنی تھیں۔

بزرگ جن نے رو لوکا کی طرف اپنا منہ کیا اور اپنا سر خم کر کے تعظیم دی اور پھر گویا ہوا۔ ”محترم اجنبی کیا میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟“

”محترم استاد! میرا نام رو لوکا عرف کامل ہے۔ لوگ مجھے حکیم کامل کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔“

رو لوکا نے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”محترم! ہم آپ کو آپ کے اصل نام سے ہی مخاطب کرتے ہیں۔ محترم رو لوکا صاحب! سب سے پہلے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی روحانی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا کروں کہ محفل میں موجود سارے جنات آپ کی گفتگو کو سن سکیں اور آپ کے مدعا کو سب جان سکیں، ہمارے قبیلہ کا اصول ہے کہ ہم کسی بھی گھمبیر مسئلے کو سب کے سامنے لاتے ہیں اور پھر سب کی متفقہ رائے جانتے ہیں۔ ہمارے قبیلے میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا معاملہ نہیں ہے جس کا جو مقام ہے وہ اپنی جگہ خوش ہے۔

محترم رو لوکا صاحب! میں آپ کی روحانی قوت پہنچ کو بخوبی سمجھ چکا ہوں اور یہ بھی جان چکا ہوں کہ آپ بھی بہت با اصول اور انصاف پسند ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ جس شکایت کے تحت یہاں تشریف لائے اس کا ازالہ آپ اپنی جگہ کر سکتے تھے۔

اور جس بات یا پھر جس کی حرکت سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے اور یقیناً غصہ بھی آیا ہوگا تو اس غصہ کے تحت آپ کوئی اہم فیصلہ کرتے ہوئے اس جن کو ناقابل فراموش اذیت سے دوچار کر سکتے تھے یا پھر اس جن کو قید کر لیتے یا پھر اس کی زندگی کا صفایا کر سکتے تھے۔

آپ نے جس بردباری اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے، میری عمر کوئی چار ہزار سال کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے اور اب تک میں نے اپنی اتنی عمر میں آپ جیسا تحمل مزاج اور قوت برداشت والا نہیں دیکھا جس کا میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔



آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ہم مسلمان جن ہیں، ہم احکام خداوندی کو ماننے ہیں، ہم حدود شرعی سے آگے نہیں جاتے، ہماری کوشش رہتی ہے کہ ہمارے قبیلہ کا کوئی بھی جن خلاف شریعت کوئی قدم نہ اٹھائے، ہماری ذات سے کسی انسان کو دکھ اور اذیت نہ پہنچے اور اگر نادانگی میں کسی انصاف سے ہمارے مزاج کے خلاف کوئی غلطی سرزد ہو بھی جاتی ہے تو ہمارے سردار کا حکم ہر جن کے لئے ہے کہ اس انسان کی غلطی کو درگزر کر دیا جائے۔

شریعت کی تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے سردار ہر جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد ایک محفل منعقد کرتے ہیں جیسے کہ آج کی محفل آپ کے سامنے ہے، اس محفل میں درس دیا جاتا ہے، پورے ہفتے کی ہر کسی کی کارکردگی کو مد نظر رکھا جاتا ہے، سب کے گوش گزار کیا جاتا ہے کہ احکام خداوندی پر کاربند ہیں اور اپنی ذات سے کسی بھی جنات قبیلہ یا پھر انسان کو تکلیف نہ پہنچائی جائے، ہمارا ایمان ہے کہ خدا نے دنیا میں جتنے بھی مخلوق پیدا کئے ہیں ان سب کے لئے ایک حدود متعین کر رکھی ہے دنیا میں کوئی بھی مخلوق بے مقصد نہیں پیدا کی گئی۔ ہر مخلوق کا خدا کی نظر میں کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے۔ حشرات الارض، چند پرند اور درندے تک ان سب کی بھی ایک حدود مقرر ہے، درندے خون پی پیتے ہیں مگر وہ بھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتے اگر درندے جنگل چھوڑ کر جو شہر یا گاؤں ان کے رہائشی جنگل کے قریب ہیں اس جگہ آجائیں تو ایک ہی رات یا دن میں میٹروں بلکہ لاکھوں انسان یا چوپائے خون میں نہا جائیں مگر ایسا نہیں ہوتا، اس لئے کہ خدا نے حد بندی کر دی ہے۔

قرآن میں واضح طور پر ہماری نشاندہی کی گئی ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت ”سورہ جن“ ہے۔ جنات میں بھی کچھ نافرمان کچھ کافر اور شریعت کے پابند ہیں۔ جس طرح انسان موت سے ہمتا ہوتا ہے اسی طرح جنات بھی اپنی عمر کو پہنچ کر یا آخری عمر سے پہلے کی بیماری

یا حادثاتی موت سے ہمتا ہوجاتے ہیں۔

جس طرح انسان اپنی زندگی گزارتا ہے اسی طرح جنات بھی اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ جس طرح انسان میں کچھ لوگ نافرمان ہوتے ہیں، کچھ شرارتی، کچھ بے راہ روی کا شکار ہوجاتے ہیں، کچھ اپنی مفاد پرستی اور نفسانی خواہشات میں بہت آگے نکل جاتے ہیں، کسی کی عزت آبرو کا خیال نہیں رکھتے، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ اپنی پسند اور ناپسند کو مقدم سمجھتے ہیں، کچھ شریعت پر چلتے ہیں اور احکام خداوندی کو اپنی زندگی کا شعار بنالیتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو احکام خداوندی کا پرچار کرتے یعنی دور دراز کا سفر اختیار کر کے لوگوں کو شریعت پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس طرح جنات بھی اپنی زندگی گزارتے ہیں جس طرح انسان جزا اور سزا کا مستحق ہوتا ہے، اسی طرح جنات بھی ان تمام باتوں کے حقدار ہوتے ہیں جس طرح انسان مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح جنات بھی مذہبی تعلیم کو اپناتے ہیں۔

جس طرح انسان کسی جرم میں سزا پاتا ہے اور کوئی بہت بڑا جرم کرتا ہے تو اسے پھانسی پر چڑھایا جاتا ہے یا پھر کسی اور طریقے سے اسے سزائے موت دی جاتی ہے بالکل اسی طرح جنات بھی کسی بڑے جرم کے پاداش میں سزا پاتے ہیں یا پھر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جس طرح انسان با مشقت قید چھیلتا ہے اسی طرح جنات بھی سزا کے سخت قرار دیئے جاتے ہیں اور انہیں قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔

معزز و محترم رولو کا صاحب! میں نے ساری باتیں تفصیل سے کر دی ہیں۔ اب ہماری خواہش ہے کہ آپ اپنا مدعا بیان کریں جس کے لئے آپ نے یہاں آنے کی زحمت اٹھائی۔ آپ کی باتیں سننے کے بعد، اس کے فیصلے پر پورا عمل ہوگا، اگر کسی نے قبیلے کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔“

یہ سب سن کر رولو کا بولا۔ ”معزز سردار اور محترم استاد صاحب! آپ کی تمام باتیں سو فیصد درست ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فرمان خداوندی کے مطابق کسی کی ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچے اور ہر مخلوق کے لئے خدا نے ایک حد مقرر کر دی ہے۔

خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ قوم جنات بھی خدا کی مخلوق ہیں اور جنات کو خدا نے مخفی طاقتیں عطا کی ہیں۔ جو قومیں جنات میں ہیں وہ انسان میں نہیں۔ انسان کی نظر میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ مخفی چیزوں کو دیکھ سکے مگر جنات ہر مخفی چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں یعنی جنات انسان کو دیکھتے ہیں مگر انسان جنات کو نہیں دیکھ پاتے۔

کیا کسی جن کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ انسان کو اپنی ذات سے نقصان پہنچائے جب کہ وہ انسان معصوم ہو، اس انسان کی ذات سے تکلیف پہنچانے والے جن کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا ہو۔ وہ جن اپنی مخفی طاقتوں کے زیر اثر اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیش نظر، انسان کو بے سمدھ کر کے اپنی من مانی کرے۔

کیا کسی جن کو یہ زیب دیتا ہے کہ شروع میں ایک انسان کو دھوکے دے کر، خود کی شکل تبدیل کر کے یعنی وہ شکل کسی خوب صورت جانور کا دھار لے اور کسی انسان کی توجہ حاصل کرے اور جب ایک انسان اس کی طرف بھڑپور توجہ دیتا ہے اور انسان اپنی فطرت کے تحت اس جانور کا گرویدہ ہو جاتا ہے تو پھر وہی جن جس نے اپنی شکل بدل ڈالی ہے، انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے، یا پھر ایک انسان کو دھونس دھکی سے زیر کرے یا پھر ایک انسان پر اپنی جتنی قوتوں سے سحر طاری کرے اور اس کے بعد اپنی خواہشات کی تکمیل کرے۔

چونکہ انسان جنات سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا لہذا ایک انسان جن سے خوفزدہ ہو کر ڈر جاتا ہے اور جن کے آگے اپنا سر خم کر دیتا ہے۔ ایک جن انسان کو اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے، بعض اوقات انسان کو

جن تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے یا پھر انسان کو موت سے ہمتا کر دیتا ہے، اکثر سرکش جن انسان کی پوری زندگی کو اجیرن کر کے رکھ دیتے ہیں، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جن انسان کو صرف مارتے ہی نہیں بلکہ انسان کے مال و متاع کھیت کھلیاں کھتی باڑی ڈھور ڈھگر یا پھر دیگر چیزوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

جبکہ جنات کا ایک انسان اتنا نقصان نہیں کرتا، جنات کو اذیت نہیں دیتا، جنات پر زور زبردستی قبضہ نہیں کرتا، جنات کو ڈرا اور دھکا کر یا پھر جنات پر اپنا کوئی سحر طاری کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں کرتا کیونکہ ایک عام انسان کے پاس اتنی ادراکی قوت نہیں ہوتی جس کے ذریعہ وہ جنات پر تسلط قائم کر سکے۔

ہاں! میں اس بات کا ضرور اقرار کرتا ہوں کہ کبھی کبھار کوئی بہت پہنچا ہوا انسان جو کہ عامل ہوتا ہے یا پھر اللہ کا برگزیدہ ہوتا ہے جو کہ روحانی قوتوں پر دسترس رکھتا ہے ایسی صورت میں وہ باقوت انسان کی سرکش جن کو قابو کر کے اسے قید کر لیتا ہے یا پھر کسی ضدی یا نافرمان جن کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اور ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ سرکش جن اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے عامل باللہ والوں کی بات نہیں مانتا۔

اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اچھے اور بااخلاق جن اللہ والوں کے پاس آتے جاتے ہیں ان سے درس لیتے ہیں بلکہ قرآن مجید پڑھتے بھی ہیں۔

یہ بھی اکثر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ نو جوان جنات کی خوب صورت دلکش اور من موعنی صورت کی مالک لڑکی جس کے لمبے بال ہوں، اس پر عاشق ہو جاتے ہیں اور اس کے لئے اس معصوم لڑکی پر اپنا سحر طاری کر دیتے ہیں اور اس پر تسلط جمالیتے ہیں اور اگر اس لڑکی کے گھر والے اس جن کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں تو ان گھر والوں پر مصیبت کا پہاڑ توڑ دیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی پریشانیوں اور اذیتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور پھر آخر میں تمام گھر والوں کو جان





## دل کے رشتے

اسرہ نوشین۔ فیصل آباد

اچانک بند دروازہ کھلا اور پھر خود بخود ایسے بند ہو گیا جیسے کوئی باہر نکلتے ہوئے ہلکے سے بند کر دیتا ہے اور پھر ساتھ ہی بوڑھا دل بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ منہ سے آخری لفظ نکلا۔ میرا بچہ.....

کیا ناییدہ تو تیس بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں۔ حقیقت کا یہ تو کہانی پڑھ کر ہی چلے گا۔

”آخر کیا ہے اس ویرانے میں آپ ہماری کیوں نہیں مان لیتیں۔“ اونچی اور تیز آواز اندھیرے میں دور تک گونجی تھی۔ صحن میں بیری کے پتوں میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ جیسے بیری کے پتوں کو بھی یہ لہجہ ناگوار گزرا ہو۔ ”اس گھر میں ہی تم لوگوں نے آنکھ کھولی تھی اسی گھر میں تم لوگوں نے چلنا سیکھا تھا۔“ بوڑھی آنکھیں جگنوؤں کی مانند چمک اٹھی تھیں جیسے ایک لہان آنکھوں کے سامنے آیا ہو۔ پھر آنکھوں میں دھند سی چھا گئی تھی۔

”اس گھر کے پاس ہی تمہارے ابا دفن ہیں مستقیم۔ میں بوڑھی ہوں، زیادہ چلا نہیں جاتا اب تو آہستہ آہستہ روز تمہارے ابا سے چار باتیں کرنے چلی جاتی ہوں، تمہارے گھر چلی گئی تو روز یہاں تو نہیں آسکوں گی نا۔“

آپ کو باشریت احکام خداوندی کا پابند جانتے ہوئے یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں، اگر میں چاہتا تو اپنے مزاج کے مطابق کوئی اہم قدم اٹھا بیٹھتا مگر میں نے یہ مناسب نہ سمجھا بلکہ میں نے اپنے تئیں آپ کے قبیلہ کے آپ کے اصول اور آپ کی ذات کے متعلق پوری معلومات کر لی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میں خود کو کتنی قدم اٹھاؤں تو آپ طیش میں آجائیں اور غلط انداز میں سوچنے لگیں اور پھر غصے میں آ کر چند انسانوں کا نقصان کر بیٹھیں کیونکہ عموماً غصے میں کسی کو کچھ سوچنا نہیں۔“

رولوکا نے کہا۔

معزز مہمان! میں آپ کو مہمان یوں کہہ رہا ہوں کہ آپ ہمارے قبیلے میں تشریف لائے، تو میں اپنے مزاج اور قبیلے کے قانون کے مطابق آپ کو مہمان کا ہی درجہ دے رہا ہوں۔

یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ کسی شکایت کے پیش نظر آئے اور آپ کی آمد کے بعد آئندہ ہمارے قبیلے کا کوئی جن غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔“

سردار نے کہا۔

”معزز سردار! ابھی سوچ کر میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ حقیقت سامنے آئے، پھر آپ اپنے قانون کے مطابق پورا پورا انصاف کریں اور اس کے بعد آپ کے قبیلہ کا کوئی اور جن غلطی کو آئندہ نہ دہرائے کیونکہ جو لوگ پورا پورا انصاف کرتے ہیں اور جو اپنوں اور غیروں میں فرق نہیں رکھتے ان سے خدا بہت خوش ہوتا ہے۔“

رولوکا بولا۔

”معزز مہمان! آپ اصل مدعا بیان کریں؟“

سردار نے کہا۔

”تو سردار محترم! آپ کے قبیلہ کا وہ تا فرماں جن ہے، آپ کا بیٹا رولوکا۔“

رولوکا بولا۔

یہ سنتے ہی سردار کے تیور بدل گئے اس کا چہرہ غصے سے تنہا اٹھا اور غصی و غضب کی حالت میں کرخت اور گرجدار آواز سنائی دی۔ ”رو..... شا..... ک.....“

(جاری ہے)

سے مار دینے کی دھمکی دی جاتی ہے یا پھر ایک آدھ کو مار بھی دیتے ہیں جس سے گھروالے خوف کھاتے ہیں اس جن سے ڈر جاتے ہیں اور اپنی جان بچانے کی غرض سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔“

رولوکا جب یہ باتیں کر رہا تھا تو اس نے اپنی قوتوں سے ایسا کر دیا تھا کہ اس جگہ موجود تمام جنات اس کی آواز سن سکیں۔

تمام جنات رولوکا کی باتیں سن رہے تھے اور چونکہ تمام باتیں صحیح تھیں لہذا تمام جنات سکتے کے عالم میں بیٹھے تھے اور بغیر کسی چوں چوں کے ایک ٹک رولوکا کی آواز کی طرف کان لگا رکھے تھے۔

”ہاں! تو سردار محترم اور استاد محترم! اگر کوئی جن اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کسی آدم زادی پر اپنا سحر طاری کر دیتا ہے اور اپنی من مانی کرتا ہے اس کے لئے آپ کے قبیلہ کا کیا قانون ہے آپ ایسے جن کے لئے کیا سزا تجویز کریں گے؟ اور اگر وہ جن قبیلہ کے کسی اہم فرد کا بیٹا ہو؟“

رولوکا نے پوچھا۔

یہ سن کر سردار فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔

”محترم رولوکا! اگر میرا بھی بیٹا ہوا اور اس نے یہ قدم اٹھایا ہے اور قبیلے کے قانون کو توڑا ہے اور احکام خداوندی کے مقرر کردہ حدود سے آگے نکل گیا ہے یا پھر حدود شرعی کی خلاف ورزی کی ہے یا کسی آدم زادی پر اپنا جناتی سحر طاری کر کے اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کی ہے تو وہ قرار واقعی سزا کا مستحق ہے، ہمارے مقرر کردہ قانون سے وہ کسی صورت بھی بچ نہیں سکتا۔“

قابل احترام اور معزز رولوکا! آپ بتائیں کہ ہمارے قبیلہ کے کس جن نے ایسی خلاف ورزی کی؟ کیا اس نے کسی انسان کو ناقص ستایا ہے؟ کیا کسی کے ساتھ جبر کیا ہے؟ کیا کسی کو دھوکہ دیا ہے؟ کیا قانون قدرت سے انحراف کیا ہے؟ آپ بلا جھجک بتائیں، غلطی کرنے والے کو بخشا نہیں جائے گا اور پورا پورا انصاف ہوگا۔“

”معزز سردار! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور



”اماں ہم تینوں رات کو آپ سے ملنے آتے ہیں۔ روز ہم میں سے ایک رات کو آپ کے پاس سو جاتا ہے مگر آپ دیکھیں، ہمارے بچوں کو بھی تو ہماری ضرورت ہے۔ آج کل بچوں کا خیال رکھنا کم ضروری اور مشکل ہے آپ جانتی ہیں۔ شام کو کام سے آ کر کھانا کھاتے ہی ہم آپ کی طرف بھاگتے ہیں۔ یہاں سے واپس جاتے ہیں تو بچے سوچتے ہوئے ہیں۔ ان سے نہ ان کی پڑھائی کا پوچھ سکتے ہیں اور نہ ان کے مسائل وغیرہ کا کچھ پتہ ہوتا ہے۔“ عیبر نے قدرے دھیمی آواز میں اماں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”بیٹا معلوم نہیں میری زندگی کے کتنے دن باقی ہیں مگر جتنے بھی ہیں مجھے اسی گھر میں رہنے دو۔“ اماں نے محبت اور نرمی سے التجا کی۔

تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ”اماں کو سمجھانا بے ود ہے۔“ فیصل نے آہستگی سے سرگوشی میں پاس بیٹھے دونوں بھائیوں سے کہا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلیں مستقیم بھائی ہم چلتے ہیں۔ آج عیبر اماں کے پاس سوئے گا۔“

مستقیم بھی کھڑا ہوا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عیبر دونوں کو باہر تک چھوڑنے اور دروازہ بند کرنے دونوں کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

بوڑھی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھیں۔ ”یارب! میرے بیٹوں کو میری وجہ سے مشکل میں نہ ڈال۔“ دو آنسو آنکھوں سے گرے اور سفید آچل میں جذب ہو گئے۔

”بی بی!.....!“ آج پھر اماں کو آواز سنائی دی تھی۔ کچھ دنوں سے انہیں یہ آواز روز سنائی دیتی تھی مگر جب وہ آس پاس دیکھتیں تو کچھ نظر نہ آتا اور وہ اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتی تھیں۔ مگر وہم روز تو نہیں ہوتا۔ ”کون ہو تم؟“ کمزور اور نحیف آواز میں پوچھا۔ مگر آواز میں رعب تھا۔ ”ارے کیا کوئی جن ہو؟“ اماں نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں جن کا بچہ ہوں۔“ آواز دوبارہ آئی تو اماں گھبرا گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں چھلاؤں اور جن بھوتوں کے بہت سے قصے سنے تھے مگر ان کے ساتھ تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ جلدی سے چار پائی سے نیچے اتریں اور گھر سے باہر نکل گئیں۔

”مستقیم کے ابا گھر میں پتہ نہیں آج کیا آ گیا ہے۔ آج تو میرا گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔“ پچھلے تین گھنٹے سے اماں قبر کے پاس بیٹھی بولے جا رہی تھیں۔

”بی بی جان میں اتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں اور آپ یہاں بیٹھی ہیں۔“ اماں کا حوصلہ بحال ہوا۔ ”ارے میری بچی مجھے کیا پتہ تھا کہ تو جلدی آئے گی آج، ورنہ میں تھوڑا جلدی آ جاتی۔“

”میں جلدی نہیں آئی بی بی جان بلکہ آج آپ کو یہاں دیر ہو گئی ہے، میں تو روز اسی ٹائم پہ آتی ہوں۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں دادا ابو سے۔“ معصوم آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”ارے ہٹ میں نے کیا باتیں کرنی۔“ بوڑھے چہرے پر شرم و حیا کی لالی چھا گئی تھی۔

”بی بی جان آپ تو ابھی بھی دادا ابو کا نام نہ کر شرماتی ہیں، جب وہ زندہ تھے تب ان کو دیکھ کے کیا حال ہوتا ہوگا آپ کا۔“ مہک نے پیار سے بی بی جان کو دیکھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے میں ان کی مدد کی پھر دونوں گھر کی طرف چل پڑی تھیں۔

اماں سوچ رہی تھیں کہ مہک کو آج والی بات.....! بتائیں یا نہ بتائیں۔ بچی ہے اگر ڈر گئی تو..... یا اگر اس نے کسی کو بتا دیا تو مستقیم مہک کو آنے نہیں دے گا پھر میں کیا کروں گی۔ ابھی تو یہ تین چار گھنٹے کے لئے میرے پاس آ جاتی ہے اس کے بہانے باقی بچوں کو بھی بی بی یاد آ جاتی ہیں اور وہ بھی آ جاتے ہیں اگر بچوں نے آنا چھوڑ دیا تو میں کیا کروں گی۔ سوچ کے بہت سے رنگ اماں کے چہرے سے عیاں ہو رہے تھے۔

”بی بی!“ آدمی دوپہر کا وقت تھا، مہک ابھی

اماں کو کھانا کھلانے کے خالی برتن اٹھا کے گھر سے باہر نکلی ہی تھی کہ آواز اماں کے کانوں میں پڑی۔ اماں نے آواز کو نظر انداز کر دیا۔ سفید دوپٹہ اپنے منہ پہ ڈالا اور سوتی بن گئیں۔

”بی بی جان کچھ خدا کا خوف کریں۔ اتنی جلدی کسی کو نہیں آتی ہے؟“ آواز میں ہی تھی۔

”ارے مجھے کیا پتہ منحوس! تو کون سا انسان ہے۔ انسانوں کو اتنی جلدی نیند آ جاتی ہے۔“ اماں نے منہ پہ دوپٹہ ڈالے ہی اس کی بات کا جواب دیا تھا۔

آ نکلیں کھول کے دیکھنے کا فائدہ بھی کیا تھا وہ کون سا نظر آتا تھا۔ بس کچھ میزوں سے اماں کو محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ہے جو ہر وقت ان کے پاس رہتا ہے، جب بھی ان کو پیاس محسوس ہوتی خالی پیالے کو دیکھتیں اور وہ اچانک پانی سے بھر جاتا تھا۔

صبح کھانا مہک لے کر آتی اور تین چار گھنٹے تک ان کے پاس رہتی۔ دوپہر کے بعد سب بچے اسکول سے واپس آتے اور شام تک گھر میں خوب رونق ہوتی تھی۔ دوپہر کو اماں بہت اداس اور خود کو اکیلا محسوس کرتی تھیں مگر کچھ میزوں سے یہ ان کو دیکھا وجود ان کے ساتھ اس گھر میں تھا۔ اب وہ اس سے باتیں کرتی تھیں۔

گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی۔

”بی بی سو گئی ہو۔“ اماں کے کانوں سے آواز نکلائی تھی۔

”ارے تو مجھے بی بی کیوں کہتا ہے۔ بی بی تو میں اپنے پوتے پوتیوں کی ہوں۔“ اماں نے ناگواری سے کہا۔

”تو کیا کہوں بی بی، بلیقے بیگم کہہ لیا کروں؟“

کمال معصومیت سے پوچھا گیا تھا۔ ”ارے شرم کر ایسے میرا نام تو کبھی مستقیم کے ابا نے بھی نہیں لیا تھا۔ چل تو بی بی ہی کہہ لیا کر۔“ اماں نے احسان عظیم کیا۔

”ایک بات ہے بی بی جان۔“

”کیا؟“ اماں نے دیوار کو گھورا۔ کیونکہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ ”جتنا پیارا آپ اپنے مستقیم اور

باقی بچوں سے کرتی ہیں مجھ سے اتنا نہیں کرتیں۔“ ایک شکوہ تھا اور اماں کی پوری آنکھیں کھل گئی تھیں۔

”جن بھی حد کرتے ہیں؟ اور تو کیوں جلتا ہے میرے بچوں سے؟ وہ سالوں میرے ساتھ رہے، میرے جگر گوشے میرے دل کے ٹکڑے اور تجھے آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اور تو میرے بچوں سے مقابلہ کرنے لگا۔“ اماں جوش میں تھی اگر سامنے کوئی وجود ہوتا تو شاید ایک آدھ ہاتھ بھی لگ جاتا۔ ”جا چلا جا۔ دفع ہو جا یہاں سے۔“ ناراضگی کا بھرپور اظہار تھا۔ اندیکھا وجود بے چین ہوا تھا۔

”غصہ کیوں کرتی ہو بی بی اپنا مستقیم اتنا کچھ سنا تا ہے اور آواز نہیں نکلتی۔ میں نے ایک بات کی اور گھر سے نکلنے کا کہہ دیا۔“

”ارے تو نے چپ نہیں کرنا تو پھر مقابلے بازی پہ اتر آیا۔ خبردار اگر میرے مستقیم کو کچھ کہتا ہو“ غصے سے اماں نے پاس پڑی لکڑی اٹھائی اور دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔

اماں سے کوئی لڑ نہیں سکتا اور اگر لڑے تو جیت نہیں سکتا..... ”کیا نام ہے تمہارا؟“ اتنے میزوں بعد آج اماں کو اس کے نام کی فکر سنائی تھی۔

”میرا نام آپ کو مشکل لگے گا بی بی جان آپ خود ہی کوئی نام رکھ لو۔“ کمال ادب کا مظاہرہ ہوا تھا۔

”میں سنا۔“ بی بی نے فوراً نام تجویز کیا تھا۔

”کس کا نام ہے یہ بی بی جان؟ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ اماں کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

”ارے تمہارا نام ہے اور میں نے کا مطلب ہوتا ہے بہت زیادہ عقلمند،“ اماں نے انتہائی سنجیدگی سے نام کا مطلب بتا دیا۔

”بی بی جان آپ نے رکھا تو ٹھیک ہی ہوگا مگر جھوٹ تو نہ بولو اس عمر میں۔ اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گی اور سوچیں مستقیم کے ابا کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔“

بوڑھے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار



بی بی جان؟“ کافی دیر بعد فضا میں ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔

”تجھے لگے گا شاید مجھے تجھ سے پیار نہیں مگر تو یقین کر میرے بچے تو مجھے بہت پیارا ہے۔ ایسے تو اپنے بچے بھی خیال نہیں رکھتے جتنا تو نے میرا خیال رکھا۔ مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ مجھ سے کوئی سوال مت پوچھ میرے بچے۔ تجھے تیری سب سے پیاری چیز کا واسطہ تجھے خدا کا واسطہ ہماری زندگی سے، ہم لوگوں سے دور چلا جا۔“

”کئی گھنٹوں تک کوئی آواز نہیں آئی۔ سارے گھر پر سکوت چھا گیا تھا۔ میری کے پتے بھی اداس تھے ان کے ساتھی کو در بدری کا حکم نامہ مل چکا تھا۔ بوڑھی آنکھوں سے موتیوں کی برسات جاری تھی۔ یہ فیصلہ ان کے لئے کون سا آسان تھا۔ دل درد سے ٹھہرا تھا۔ یہ اندیکھا وجود بھی تو اب اس گھر کا حصہ تھا۔ اس کی باتیں، اس کی تابعداری، اس کی شرارتیں، سب بوڑھے ذہن میں محفوظ ہو چکا تھا۔

”بی بی! میں جا رہا ہوں!“ دروازے کے پاس سے اچانک آواز ابھری تھی۔ ”کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیں بی بی جان۔“

”تجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی میرے بچے، میری وجہ سے تیرا دل دکھا تو مجھے معاف کر دینا۔“ خفیف آواز اور کمزور ہو گئی تھی۔

✂

”میں نے آپ کو معاف کیا بی بی جان اور آپ کا تو کوئی قصور ہے بھی نہیں، یقیناً انجانے میں مجھ سے ہی کوئی خطا ہوئی ہوگی۔“ دروازہ کھلا اور ایسے بند ہو گیا جیسے باہر نکلنے ہوئے کوئی دروازے کو ہلکے سے بند کر دیتا ہے اور ساتھ ہی بوڑھا دل بھی بند ہو گیا تھا۔

✂

بوڑھے لبوں سے آخری سسکی نکلی تھی۔

✂

”میرا بچہ۔“ زندگی بوڑھے وجود کو چھوڑ کے جا چکی تھی۔

ہوئے تھے۔

”تجھے برا لگا۔ مجھے پتہ ہے۔ یہیں بھرتا رہا ہے تو کون سا کوہ قاف سے سیدھا میرے گھر آیا ہے جو تجھے اس لفظ کا مطلب نہ پتہ ہوتا۔ بس مذاق کر رہی تھی میں تو۔“ اماں نے اپنی شرمندگی پر قابو پایا۔

”تو میں بھی مذاق ہی کر رہا تھا بی بی جان۔“ ایک جاندار قہقہہ فضا میں گونجا۔

”بی بی! آج مہک نہیں آئی ابھی تک۔“ اماں کے چہرے پر اس کی بات سنتے ہی ناگواری اور نفکر چھا گیا۔ آج وہ بھی مہک کا انتظار کر رہی تھیں مگر اس جن نے کیوں نام لیا ان کی مہک کا؟ اسے کیا لینا دینا؟

دل میں عجیب سے دوسووں نے جنم لیا۔ انسان اور جنوں کی دشمنی کی کئی داستانیں ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں۔ کچھ دن عجیب کشمکش میں گزرے۔ چاہ کر بھی اماں خود کو مطمئن نہیں کر پا رہی تھیں۔

”بی بی! کیا بات ہے کچھ دنوں سے آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ میں بولتا رہتا ہوں اور آپ جواب نہیں دیتیں۔ کیا ہوا ہے؟“ آواز میں بے چینی تھی۔ اسے تو یہی لگتا تھا کہ یہ بوڑھی عورت اس کی ماں ہے۔ وہ بہت چھوٹا تھا تب سے اس میری پر رہتا تھا۔ اس آنگن میں بچے قرآن پاک کی تلاوت کرتے تو وہ غور سے سنتا تھا۔ یہ گھر تو اسے بہت پیارا تھا اور یہ کمزور اور ضعیف وجود تو اس کی دنیا تھی وہ اماں کی ناراضگی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

”ایک وعدہ کر میرے بچے۔“ آج اماں نے پہلی مرتبہ اسے میرے بچے کہا تھا۔

”جی بی بی جان۔“ آواز چمک اٹھی تھی۔

”تو پہلے وعدہ کر جو میں کہوں گی تو وہ کرے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں بی بی جان جو آپ کہیں گی میں کروں گا بتائیں نا۔“

”تو یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلا جا۔“ بوڑھی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ ”کیوں



## شیطانی کھوپڑی

ایس امتیاز احمد - کراچی

خواب گاہ میں بستر پر نظر پڑتے ہی نوجوان دھشت زدہ ہو گیا۔ ایک انسانی کھوپڑی مردہ وجود کے سینے پر براجمان تھی اور نوجوان کا تازہ تازہ خون بستر کی اجلی چادر کو داغدار بنادیا تھا اور پھر.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ مفاد پرستی انسان کیلئے اکثر باعث نقصان ثابت ہوتی ہے۔ دل گرفتہ کہانی

**کرسٹوفر فریٹ لینڈ**، آتش دان کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی اور وہ اس کی جلد کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا زرد چہرہ آتش دان کی آگ کی روشنی میں بھی زرد نظر آ رہا تھا اور اس پر فکر کے آثار نمایاں تھے۔

اس کی ساری توجہ اس پرانی کتاب پر تھی۔ وہ حیران تھا کہ اس کتاب کی جلد بنانے کے لئے انسانی



جیزیں جمع کرتا تھا اور اس سلسلے میں اس نے کئی لوگوں سے مدد لی تھی، جو برسوں سے اس کے لئے کام کر رہے تھے۔ وہ خوش تھا کہ اب اس کے ذخیرے میں ایک اور عجوبہ روزگار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس بہت سی تاریخی کھوپڑیاں تھیں اور قبرستان سے چرایا ہوا خوش قسمت ہاتھ بھی۔ اس کے پاس ایسی بہت سی چیزیں تھیں، وہ غیر معمولی چیزیں جمع کرنے کا شوقین تھا۔ میٹ لینڈ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب اٹھائی اور اسے آگ کی روشنی کے قریب کر کے دیکھنے لگا۔

”عورتوں کی کھال مردوں کے مقابلے میں زیادہ نازک ہوتی ہے نا؟“ اس نے کہا۔

”میں نہیں سمجھا جناب۔“ آواز پر میٹ لینڈ نے مرکز دیکھا۔ جیم اندر داخل ہو رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ میٹ لینڈ نے پوچھا۔

”وہ شخص بھر یہاں آیا ہے۔“

”کون شخص؟“

”مسٹر مارکو۔“

”اوہ! میٹ لینڈ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لا پرواہی سے جیم کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کا باورچی تھا اسے خوشی تھی کہ جیم اور اس کے دوسرے دوستوں کی طرح جو اس کے لئے غیر معمولی چیزیں لاتے تھے بلکہ اسے تو میٹ لینڈ کے جمع کئے ہوئے اس خزانے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

”مارکو ہی نام بتایا ہے نا؟“ اس نے باروچی سے پوچھا۔ ”بھلا یہ کیوں آیا ہے؟ خیر اسے اندر لے آؤ۔“ اس نے کہا اور جیم فوراً ہی واپس مڑ گیا۔ میٹ لینڈ اسے جانتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا مارکو اب یہاں بہت جلد ہی دوبارہ آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بہت اہم بات ہے۔ مارکو اس کے لئے ہمیشہ قیمتی چیزیں لے کر آتا تھا اور میٹ لینڈ کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی اچھی چیزیں کہاں سے حاصل کر لیتا ہے مگر وہ یہ سوچنے میں زیادہ وقت خراب نہیں کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مارکو کا مسئلہ تھا کہ وہ قیمتی چیزیں کہاں سے اور کیسے حاصل

کرے۔

ویسے مارکو میں یہ خاصیت تھی کہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ کرسٹوفر کو کیا چیز پسند آ سکتی ہے؟

”مسٹر مارکو۔“ جیم نے آکر اطلاع دی اور واپس چلا گیا۔

مارکو کمرے میں داخل ہوا تو میٹ لینڈ نے اس سے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مارکو کا جسم موٹا اور بھدرا تھا، وہ ایک پراسرار مسکراہٹ لبوں پر لئے میٹ لینڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن میٹ لینڈ کو ان رسمی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ مارکو کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہنڈل پر مرکوز تھی، جو وہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا، یہ ایک بڑا ہنڈل تھا جو ایک کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ مارکو نے بغیر کچھ کہے ہنڈل میز پر رکھا پھر اپنا اور کوٹ اتار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھنے کے لئے میٹ لینڈ کی اجازت کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔

وہ آگ کے قریب رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا پھر اس نے میٹ لینڈ کے سگار کیس میں سے سگار نکالا اور اسے سلگالیا۔ میٹ لینڈ کی نظر اس کی طرف ہنڈل پر لگی ہوئی تھیں۔ مارکو میٹ لینڈ کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“ میٹ لینڈ نے پہل کی اور مارکو کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میں بغیر اطلاع کے آنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ مسٹر میٹ لینڈ مجھے امید ہے کہ آپ کی تہنائی میں ناگواری کی حد تک محسوس نہیں ہوا ہوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کی پروا مت کرو یہ بتاؤ پیکٹ میں کیا ہے؟“ میٹ لینڈ نے کہا۔

”بہت ہی منتخب چیز ہے۔“ مارکو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک عجیب و غریب کھوپڑی۔“

”آخر یہ کسی عورت کی کھوپڑی یا کسی کم عمر نوجوان کی کھوپڑی یہاں لانے سے تمہارا مطلب کیا ہے۔“

”یہی بات ایک کھوپڑیوں کے ماہر نے بھی کہی تھی۔“ مارکو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں کھوپڑیوں کے ماہر کی بات نہیں کر رہا۔ مجھے اس کھوپڑی کے بارے میں بتاؤ اس میں کیا خاص بات ہے؟“ لیکن مارکو نے میٹ لینڈ کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنی توجہ پھر کھوپڑی پر مرکوز کر دی اور اسے اپنے موٹے اور بھدے ہاتھوں میں لے کر پھر گھمنا لگا۔

”اس کا غیپ کتنا اچھا ہے۔“ مارکو نے کہا۔

”خدا کے لئے مارکو بھلا میں اس عام کی کھوپڑی کا کیا کروں گا؟“ میٹ لینڈ نے بے زاری سے کہا۔

”پلیز! مسٹر میٹ لینڈ! کیا آپ مجھ سے ایسی توقع رکھتے ہیں۔ کیا میں ایک عام سی چیز پیش کر کے آپ کے ذوق کا مذاق اڑاؤں گا؟ اور کیا میں ایک عام کھوپڑی کے لئے آپ سے ایک ہزار پاؤنڈ مانگوں گا؟“

”ایک ہزار پاؤنڈ؟“ میٹ لینڈ نے حیرت سے کہا۔

”ہاں اور اس کی یہ قیمت بھی بہت کم ہے۔“

مارکو نے اسے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ”جب تمہیں اس کی کہانی معلوم ہوگی تو تم بخوشی یہ قیمت ادا کرو گے۔“

”میں نیولین کی کھوپڑی کے لئے بھی یہ قیمت دینے کو تیار نہیں ہوں۔“ میٹ لینڈ نے غصے سے کہا۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس کھوپڑی کا مالک تمہاری قسمت بدل سکتا ہے۔“ مارکو نے کہا۔

”بہت ہوگی اب مسئلہ کی طرف آؤ۔“

”تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ معلوم ہو سکتا ہے اور اپنے وجود میں آنے سے پہلے کے واقعات بھی پتا کر سکتے ہو۔ یہ کھوپڑی ایک فرامیسی شیطان صفت آدمی کی ہے مارکو ٹیس ڈی سیڈ کی۔“

میٹ لینڈ مارکو ٹیس سیڈ کے بارے میں جانتا تھا۔ اس کے ذہن میں مارکو ٹیس کی ساری تاریخ گھوم

گئی۔ وہ ایک کاؤنٹ تھا اور سترہ سو چالیس میں پیدا ہوا تھا۔ جوان ہونے پر اس نے فوج میں شرکت کر لی تھی اور سات سال تک جنگوں میں حصہ لیا تھا وہ زور و رگت اور نیلی آنکھوں والا شخص تھا اور اس میں شیطانی صفات کوٹ کوٹ کھرہری ہوئی تھیں۔

تیس سال کی عمر میں اسے ایک جرم کے سلسلے میں ایک سال کی قید ہوئی تھی۔ اس کی بہت جائیداد تھی جو آج تک کسی کوئٹس مل کی تھی نشہ کرنا اس کی کمزوری تھی اور اپنی خوب صورتی کی وجہ سے وہ عورتوں میں مقبول تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ اس نے قید کے دوران ایک کتاب لکھی تھی جس میں سیڈ سنک کے بارے میں لکھا تھا جس میں بتلا ہوا کہ لوگ نفسیاتی مریض ہو جاتے ہیں اور خود پر اور بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس نے اپنے نظریات ترتیب دیئے تھے اور ان میں مہارت حاصل تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی عورتوں سے محبت کرتا تھا اور اس کی تمام محبوبائیں ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتر گئی تھیں۔ اس نے فرانس میں ہونے والی خانہ جنگی میں لاتعداد لوگوں کا خون بہایا تھا اور عمر کے آخری حصے میں اسے لوگوں نے پاگل تسلیم کر لیا تھا۔

اٹھارہ سو چودہ میں وہ مر گیا تھا۔ اس نے جو کتابیں لکھی تھیں وہ حکومت نے ضبط کر لی تھیں۔ اس کی جائیداد اور وصیت پر بھی حکومت کا قبضہ تھا اور وہ کسی کوئٹس دی گئی تھی صرف اس کا نام باقی رہ گیا تھا اور وہ نام بھی شیطانی کا سہل بن گیا تھا۔ میٹ لینڈ نے مارکو کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھوپڑی کی طرف دیکھا۔

”تم نے ایک ہزار پاؤنڈ ہی کہا ہے نا؟“

”ہاں۔“ مارکو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت مناسب قیمت ہے اور ان حالات میں۔“

”کن حالات میں؟“ میٹ لینڈ نے پوچھا۔

”تم میرے پاس ایک کھوپڑی لائے ہو لیکن تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ مارکو ٹیس کی کھوپڑی ہے اور تم نے اسے کیسے حاصل کیا ہے؟“

”میری بات سنو مسٹر میٹ لینڈ۔ تم مجھے جانتے



ہو۔ تمہیں میرے ذرائع جاننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ میرے تجارتی اداروں میں سے ایک ہے اور میں اپنے ذرائع کسی کو نہیں بتایا۔“ مارکو نے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن میں بھی صرف تمہارے الفاظ پر اعتبار نہیں کر سکتا مارکو۔ میری معلومات کے مطابق اٹھارہ سو چودہ میں فوت ہونے کے بعد مارکوئیس کو چیزن میں دفن کر دیا گیا تھا۔“

”تمہارا یہ کہنا درست ہے۔“ مارکو نے کہا۔ ”لیکن تمہارے پاس ایلسز اسٹریٹ کی کوئی کاپی ہے اس میں ”محبت اور درد“ کے مضمون میں ایک چیز ہے جس سے تمہیں دلچسپی ہو سکتی ہے.....“ مارکو کی بات پر میٹ لینڈ نے الماری سے اس کی بتائی ہوئی کتاب نکالی اور اسے دی۔ مارکو اس کے ورق لٹنے لگا۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے ایک صفحہ پر اشارہ کرتے ہوئے کہا! ”یہ ایلسز کے مطابق مارکوئیس کی کھوپڑی کا تجربہ ایک ماہر نے کیا تھا اور وہ اپنے زمانے کا مشہور ماہر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے مارکوئیس کی کھوپڑی کو ایک عورت کی کھوپڑی کی طرح چھوٹا پایا تھا جیسا کہ ابھی تم نے بھی کہا تھا۔“

”لیکن یہ کھوپڑی تمہیں کیسے ملی؟“

”یہ کھوپڑی کافی عرصے سے ایک ڈاکٹر نوڈ کے پاس رہی۔ پھر اٹھارہ سو پچاس میں یہ چوری ہو گئی اور اسے ایک ماہر نفسیات ہی نے چرایا تھا جو اسے انگلینڈ لے گیا تھا۔ ایلسز نے اپنی کتاب میں اتنا ہی لکھا تھا اور یہی کہانی میں تمہیں بتا سکتا تھا، اوہ یہ مارکوئیس ڈی سیڈ کی کھوپڑی حاضر ہے۔“ مارکو نے کہا۔ ”کیا تمہیں میری بتائی ہوئی قیمت منظور ہے۔“

”ایک ہزار پاؤنڈ؟“ میٹ لینڈ نے پوچھا۔

”ایسی چھوٹی اور وہیبت کہانی کے لئے یہ بہت زیادہ قیمت ہے۔“ میٹ لینڈ نے احتجاج کیا۔

”چلو آٹھ سو ہی سہی۔“ مارکو نے کہا اور میٹ لینڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ میٹ لینڈ اسے دیکھ رہا تھا اور کھوپڑی ان دونوں کو۔ ”پانچ سو؟“ مارکو نے قیمت اور

کم کی۔

”تم ضرور جھوٹ بول رہے ہو۔“ میٹ لینڈ نے کہا۔ ”ورنہ تم کبھی بھی قیمت کم نہ کرتے۔“

”تم جانتے ہو میٹ لینڈ اگر میں چاہوں تو کسی بھی قیمت پر اڑ سکتا ہوں اور تم سے اپنی بات مناسکتا ہوں۔“ مارکو نے مسکراتے ہوئے کہا، ”لیکن میں یہ کھوپڑی جلد از جلد خود سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ مارکو نے کھوپڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ میٹ لینڈ سے نظریں چرا رہا تھا۔

”بس یوں سمجھ لو کہ میں ایسا قیمتی آئٹم رکھنے کی ہمت نہیں رکھتا بس میرا ذہن اس کے لئے تیار نہیں ہے۔“

”تمہارا ذہن؟“

”مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میرا دم ہے لیکن.....“

”تم یہ محسوس کرتے ہو کہ پولیس تمہارا تعاقب کر رہی ہو؟ تو یہ درست بھی ہو سکتا ہے کیونکہ تم نے یہ کھوپڑی چرائی ہوگی۔ ہے نا مارکو؟“ میٹ لینڈ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ مارکو نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے بلکہ میں کھوپڑیاں رکھنا پسند نہیں کرتا، جب کہ تم اس بڑے گھر میں رہتے ہو اور یہاں محفوظ ہو۔ میں ایک تنگ سی جگہ میں رہتا ہوں میں تمہیں یہ کھوپڑی بیچنا چاہتا ہوں، تم اسے اپنے انتخاب میں جمع کر سکتے ہو اور جب چاہو اسے دیکھ کر خوش ہو سکتے ہو اور نہ چاہو تو یہ تمہاری نظروں سے اوجھل بھی رہ سکتی ہے یہ تمہاری پریشانی کا سبب نہیں ہوگی اور تم مجھے جو قیمت ادا کرو گے اس سے میں اپنے رہنے کے لئے بہتر انتظام کر لوں گا اور اسی لئے میں اسے فروخت کر رہا ہوں۔ بس اب پانچ سو میں سودا ہو گیا۔“

”میں ابھی سوچنا چاہتا ہوں۔“ میٹ لینڈ نے

جلدی سے کہا۔ ”تم مجھے اپنا پتا دے دو۔ میں تم سے بات کر لوں گا اور کل رات لے کر تمہارے پاس آ جاؤں گا ٹھیک ہے نا؟“ میٹ لینڈ نے جان چھڑانا چاہی۔

”ٹھیک ہے۔“ مارکو نے جواب دیا اور میٹ لینڈ کو اپنا پتا دے دیا پھر اس نے بڑی عجلت میں اس کھوپڑی کو دوبارہ پیکٹ میں رکھا اور کاغذ پلیٹ دیا۔

”کل میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں ایک بات یاد رکھنا جب میرے گھر کا دروازہ کھولو تو ایک کتا تمہارا منظر ہوگا اگر کوئی بھی اس کھوپڑی کو چرانے کی کوشش کرے گا تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لے گا.....“ مارکو نے کہا اور واپس چلا گیا۔

”میٹ لینڈ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نقاب پوشوں نے اسے بہت سختی سے باندھ دیا تھا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے اس کے سینے پر اسٹیل کی زنجیریں کیوں پلیٹ دی تھیں پھر ان دونوں نقاب پوشوں نے جلتی ہوئی سلاخوں سے اسے داغنا شروع کر دیا تھا اور اس نے سختی سے پنے دانت بھینچے ہوئے تھے پھر اچانک جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی تھی۔ نقاب پوش اسے کھول رہے تھے پھر انہوں نے اسے ایک اسٹیل کے فرش پر لٹا دیا تھا اور اسے کانٹوں سے زخمی کر رہے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں تھا بلکہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا جو حرکت نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی وہ سانس لے رہا تھا پھر اچانک وہ میٹ لینڈ سے قریب آتا چلا گیا اور جب اس نے میٹ لینڈ کا جسم چھوا تو اسے موت کی سی ٹھنڈک محسوس ہوئی اب وہ جسم میٹ لینڈ سے اتنا قریب تھا کہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا جو بالکل سفید تھا۔ وہ ایک دھندلا سا آنکھ چہرہ تھا اس کے خدوخال نمایاں نہیں تھے اور پھر جیسے ہی اس جسم نے دوبارہ اس کے جسم کو چھوا اس سر نے میٹ لینڈ کے سر کو چھوا جیسے ہی اس کے ہونٹ اس انجلی جسم کے ہونٹوں سے ٹکرائے تو خوف اس کی

رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ وہ چیز ایک کھوپڑی تھی اور وہ کھوپڑی مارکوئیس ڈی سیڈ کی تھی۔

پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے کسی کو بھی اس خواب کے بارے میں نہیں بتایا اور اسی روز سر فٹرگ سے ملا۔

”مجھے مارکو پر بھروسہ ہے لیکن میں حیران ہوں کہ وہ اس کھوپڑی کو خود سے جدا کیوں کرنا چاہتا ہے؟“

میٹ لینڈ نے اسے کھوپڑی کی کہانی سننے کے بعد کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اس شے کے ماہر ہو چنانچہ جب میں مارکو کے پاس کھوپڑی لینے جاؤں تو تم میرے ساتھ چلنا اور اس کھوپڑی کی جانچ کر لینا۔“

”اس کی جانچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ فٹرگ نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے تم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی روشنی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ کھوپڑی مارکوئیس ڈی سیڈ کی ہے۔“

”تمہیں اس بات پر کیسے یقین ہے؟“

”میرے دوست کیونکہ وہ کھوپڑی میرے ہی پاس سے چرائی گئی ہے۔“ فٹرگ نے کہا۔

”کیا؟“

”ہاں! اور یہ کام دس دن پہلے ہی ہوا ہے۔ میرے گارڈن میں کھلنے والی کھڑکی سے ایک شخص میری لائبریری میں داخل ہوا میرے کسی ملازم کی آنکھ نہیں کھلی اور وہ رات کی تاریکی میں کھوپڑی لے کر فرار ہو گیا ہے۔“

”حیرت ہے۔“ میٹ لینڈ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم میرے ساتھ تو چلو گے ناں ہم دونوں اس کو شناخت کریں گے اور مارکو حقیقت بتائیں گے اور کھوپڑی بھی واپس لے آئیں گے۔“

”نہیں۔“ فٹرگ نے جواب دیا۔ ”اس کھوپڑی کے چرائے جانے پر مجھے خوشی ہوئی ہے اور میرا مشورہ ہے کہ تم بھی اس سے دور رہی ہو۔ میں نے پولیس میں بھی اس کی چوری کی رپورٹ درج نہیں کرائی اور نہ ہی ایسا کرنے کا میرا کوئی ارادہ ہے کیونکہ وہ



”کھوپڑی..... منخوس ہے۔“

”منخوس؟“ میٹ لینڈ نے حیرت سے پوچھا۔  
”تمہارے پاس مصر کی میاں بھی ہیں اور بہت قیمتی ذخیرہ ہے اور تم کیا کہہ رہے ہو کہ وہ کھوپڑی منخوس ہے؟ تم نے پہلے تو کسی چیز کے لئے ایسی بات نہیں کی۔“

”تمہارا کہنا درست ہے۔ میں یہ بات تم سے تب ہی کہہ رہا ہوں جب میں نے یقین کر لیا ہے کہ یہ کھوپڑی واقعی خطرناک ہے اور تمہیں میرے الفاظ پر یقین کرنا چاہئے۔“

میٹ لینڈ حیرت سے اس کی بات سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید اس نے بھی میٹ لینڈ کی طرح ڈراؤنے خواب دیکھے ہوں گے اسی لئے ایسی بات کہہ رہا ہے۔

”میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی، میں تو سمجھا تھا کہ تم فوراً اس کھوپڑی کو واپس حاصل کرنا چاہو گے۔“ میٹ لینڈ نے کہا۔

”میٹ لینڈ تم اس کھوپڑی کے متعلق بھی جانتے ہو اور اس کے مالک کی شیطانی قوتوں کے متعلق بھی اور تم پھر بھی اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو جب کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی اس کو خریدنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ فٹنرگ نے کہا۔ ”میں تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا۔“ اس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

”لیکن میں بھی اس کھوپڑی کی تاریخ سے واقف ہوں یہ بہت سے لوگوں کے ہاتھ سے گزری ہے ان میں کچھ پرانی چیزیں جمع کرنے کے شوقین تھے اور کچھ جادوئی تحفوں سے متعلق تھے یہ جن جن لوگوں کے پاس گئی وہ موت سے ہمکنار ہوتے چلے گئے۔“

لیکن یہ میرے پاس تو اتفاق سے آ گئی۔

میرے پاس بھی چھ ماہ پہلے ایک شخص لے کر آیا تھا۔ ”فٹنرگ نے کہا۔“ اس نے یہ کھوپڑی مجھے قیمتا نہیں بلکہ تحفے میں دی تھی کیونکہ وہ اس سے خوفزدہ تھا اور اس وقت میں اس کے بھائی پر ہنسنا تھا۔ باقی ایسے ہی جیسے اس وقت تم میرا مذاق اڑا رہے ہو لیکن ان چھ ہمنوں

میں جب تک یہ کھوپڑی میرے پاس رہی میں پریشان ہی رہا۔ میں خوفناک خواب دیکھتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ڈی سیڈ پاگل نہیں تھا اور میں ان پر یقین کرتا ہوں وہ پاگل نہیں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا اس میں کوئی چیز غیر انسانی تھی جو دوسروں کو متاثر کرتی تھی اور وہی چیز اس کھوپڑی میں بھی ہے۔ جتنے عرصے یہ کھوپڑی میرے پاس رہی مجھے طرح طرح کی فون کاگز بھی آتی رہیں اور عجیب و غریب خط بھی اور میرے بعض ملازموں نے رات کو کچھ سائے بھی گھر میں چلتے دیکھے۔“

”ہو سکتا ہے وہ عام چور ہوں۔ مارکو کی طرح اور

انہیں کسی چیز کی تلاش ہو۔“ میٹ لینڈ نے کہا۔

”نہیں۔“ فٹنرگ نے آہ بھری۔ ”ان سابیوں

نے اس کھوپڑی کو تلاش کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ

کیا۔ وہ رات کو میرے گھر میں آتے تھے اور اسے

استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کھوپڑی کو میں شیشے کے

ایک کبس میں رکھتا تھا تاہم ہر وقت وہ اپنی جگہ سے ہٹ

ہوئی ہوتی تھی۔ بعض اوقات شیشے کا کبس ٹوٹا ہوا تھا اور

کھوپڑی میز پر رکھی ہوتی تھی۔

ایک بار وہ فرش پر تھی۔ میں نے ملازموں سے

بھی پتا کیا تھا لیکن ان میں سے یہ کسی کا کام نہیں تھا۔ یہ

کسی باہر کے شخص کا ہی کام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس

کھوپڑی کے چاہنے والے میرے گھر میں آ کر اس کی

عبادت کرتے تھے اور جب وہ چوری ہوئی تو مجھے بہت

خوشی ہوئی تھی۔ میرا تو تمہیں یہی مشورہ ہے کہ تم اس

سلسلے میں دور رہو اور مارکو سے مت ملو۔“

”بہت بہتر۔“ میٹ لینڈ نے سر ہلاتے ہوئے

کہا۔ ”میں اس تنبیہ پر تمہارا شکر گزار ہوں۔“ اس نے

کہا اور سر فٹنرگ سے رخصت ہوا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ مارکو کے دروازے پر کھڑا

تھا۔ مارکو کا دروازہ لاک تھا اور اندر سے طرح طرح کی

آوازیں آرہی تھیں۔ سر فٹنرگ کی وارننگ نے اسے

ہوشیار کر دیا تھا اور وہ اپنے ساتھ اپنا رولور لایا تھا جس

سے اس نے دروازے کا لاک توڑ دیا اور دروازہ کھول کر

کمرے میں دیکھنے لگا۔

اچانک کوئی چیز اس کی طرف آئی اور اس سے

ٹکرائی وہ چیخ کر گیا۔ گرنے سے پہلے اس نے فائر بھی

کیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو مارکو کا کتا اس

کے پاس پڑا تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ مارکو نے پہلے ہی

اسے اس کتے سے خبردار کیا تھا کہ جو کوئی کھوپڑی لینا

چاہے گا کتا اس پر حملہ کر دے گا لیکن اس کی وجہ میٹ کی

سمجھ سے باہر تھی۔ وہ اٹھا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا

جہاں مارکو کا بستر تھا اور اس پر بے شمار شکنیں تھیں اور

قریب ہی مارکو کی لاش پڑی تھی۔

میٹ لینڈ حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر اس کی

نظر کھوپڑی پر پڑی جو مارکو کے قریب ہی پڑی تھی جس

پر جگہ جگہ خون لگا تھا۔ میٹ لینڈ کو پہلی بار کھوپڑی کی

تاریخ پر یقین آیا اور اسے اس کی شیطانی قوت کا یقین

ہو گیا۔ کھوپڑی میں عجیب سی چمک آگئی تھی اسے مارکو کی

بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس نے کھوپڑی کو اٹھا لیا اور کافی

دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر کمرے سے نکل آیا اس کے

ہاتھ میں کھوپڑی اسی طرح موجود تھی۔ وہ بڑی غیلت میں

تھا اور خوفزدہ تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے چلا جانا چاہتا

تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس وہاں پہنچ جائے اور میٹ

لینڈ کو مارکو کے قتل کے شبہ میں گرفتار کر لے۔ اسی خوف

کے زیر اثر وہ اپنے گھر میں سائیڈ ڈور سے داخل ہوا تھا

اور کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ وہ کھوپڑی بھی

لے آیا ہے جو مارکو اسے پہنچا چاہتا تھا۔

اس شام میٹ لینڈ پر خوف سوار رہا۔ میز پر

کھوپڑی اس کے سامنے رکھی تھی اور وہ اسے گھور رہا تھا

اور کسی انجمنے خوف سے کانپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا

کہ سر فٹنرگ صحیح کہہ رہے تھے اس کھوپڑی کی قوتوں نے

میٹ لینڈ کو بھی متاثر کیا تھا اور اس نے اپنے عزیز

دوست کی تنبیہ پر بھی یقین نہیں کیا تھا اور اس کھوپڑی ہی

کی قوتوں نے اسے ایک مردہ شخص کے پاس سے

چرانے کی جرأت بخشی تھی اور اب اسے ایک کمرے میں

تہا بند ہونے پر مجبور کر دیا تھا ایک لمحے کو اسے خیال آیا

کہ اسے پولیس کو فون کر دینا چاہئے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ

اس کھوپڑی کو کہیں دور لے جا کر بھینک سکتا ہے لیکن کوئی

چیز تھی جو اسے روک رہی تھی وہ تمام حقیقتیں جاننے کے

باوجود بھی اس کھوپڑی کے سامنے بے بس بیٹھا تھا اور

اسے گھور رہا تھا وہ اس سے ہارنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود

میں اسے تباہ کرنے کی طاقت بھی نہیں پارہا تھا۔ اسے

یقین تھا کہ وہ پاگل ہو جائے گا پھر اسے ایک خیال آیا

جس نے اسے موت کے خوف سے آزاد کر دیا۔

اس نے دل برداشتہ ہو کر شراب پی اور فرش پر

لیٹ گیا۔ اسے نیند آرہی تھی اس کا خیال تھا کہ صبح اس کا

ذہن تھکن سے آزاد ہو چکا ہوگا اور وہ اس مسئلے کا ضرور

حل ڈھونڈ نکالے گا۔ اسے سرفٹرگ کی باتوں نے

پریشان کر دیا تھا اور آج دوپہر کے واقعے نے اس کی

ہمت توڑ دی تھی۔

وہ مارکو کی کھوپڑی کے بارے میں سوچ سوچ

کراپنے ذہن کو پریشان کرنے کے بجائے سوچنا چاہئے

تھا، تا کہ صبح تازہ دم ہو کر کوئی فیصلہ کر سکے پھر وہ اٹھ کر اپنے

بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد اس نے لائٹ بھی آف

کردی۔ کھڑکی میں سے چاند کی کرنیں اس کے بستر پر پڑ

رہی تھیں۔ ان کرنوں میں میز پر رکھی ہوئی کھوپڑی چمک

رہی تھی اور میٹ لینڈ اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے آنکھیں

بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے سوچا

سرفٹنرگ کو فون کرے گا اور یہ کھوپڑی ان کے مشورے

سے ملک کے عجائب گھر میں رکھوا دے گا۔

پھر سونے سے پہلے اس کی نظریں کسی پریشان

کردینے والی چیز سے ٹکرائی تھیں اسے یوں لگ رہا تھا

جیسے وہ مارکو کے کمرے میں ہے اور اس کا کتا اسے گھور رہا

ہے۔ کتے پر خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا اور یہ حیرت کی

بات تھی کیونکہ میٹ لینڈ کی گولی لگنے کے بعد وہ مر گیا تھا

اور اس کے جسم سے خون بھی نکلا تھا پھر اس کتے نے

میٹ لینڈ کے گلے پر کاٹا تھا لیکن خون نہیں نکلا تھا۔ یہ

میٹ لینڈ کے لئے حیرت کی بات تھی۔

پھر اس نے یہ مسئلہ بھی صبح کے لئے اٹھا رکھا،





## ہیر وئن

ایس حبیب خان - کراچی

ایک پڑیا میں موجود راکھ کو جب لڑکی کے قدموں میں ڈالا گیا اور پھر جیسے ہی وہ لڑکی اٹھ کر اس راکھ پر سے گزری کہ اچانک وہ چکر اکر زمین بوس ہو گئی اسے خون کی الٹیاس شروع ہو گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی سلکت ہو گئی۔

جادوئی کہانیاں پڑھنے والوں کیلئے ایک عجیب و غریب دماغ پرستہ طاری کرتی خوفناک کہانی

”مان“ مجھے آنے میں شاید تھوڑی دیر ہو جائے تم چتا مت کرنا اور بھوجن سے پر کر لینا۔“ کامنی نے ساڑی کا پلو شانے پر درست کرتے ہوئے کہا اور گھر سے نکل گئی۔ کامنی اسٹرگلنگ ایکٹریس تھی۔ فلموں میں چھوٹے موٹے رول کر کے وہ اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پال رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اسے ایک فلم میں ”لیڈ رول“ ملنے کی امید ہوئی تھی، اسے معلوم ہوا تھا کہ ایک بہت بڑے ڈائریکٹر کو اپنی فلم کے لئے نئے چہرے کی تلاش ہے۔ اس نے جانے کن کن لوگوں کی خوشامد کی تب کہیں جاکر ڈائریکٹر سے ملاقات طے ہوئی۔ اس رول کو حاصل کرنے کے لئے انڈسٹری کی کئی اور لڑکیاں بھی ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ”شیام مکرمی“ نے ملاقات کے لئے اپنے آفس میں سب کو بلایا تھا، کامنی جب وہاں پہنچی تو بہت

پہنچ کر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

جونہی کلاک ٹاور نے شب کے 10 بجے کا گجر بجایا وہ ریو الورا اپنی جیب میں رکھ رکھ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدموں کا رخ میٹ لینڈ کے گھر کی طرف تھا۔ وہ میٹ لینڈ کی فطرت سے بخوبی واقف تھا اس لئے اسے یقین تھا کہ اب تک میٹ لینڈ وہ کھوپڑی حاصل کر چکا ہوگا اور پھر چودھویں چاند کی یہ شب بھی اس کے ذہن میں کھٹک کر اس کو کسی انجانے خطرے کا احساس دلانے لگی تھی۔ اسے شیطانی کھوپڑی سے منسوب ایلمنٹسٹریکٹ کے بعض حوالے یاد آ رہے تھے۔

میٹ لینڈ کے گھر پہنچ کر فٹنگر کافی دیر تک دروازے پر دستک دیتا رہا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ فٹنگر نے ہینڈل کو گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا دروازے اور کھڑکیوں سے در آنے والی چاندنی نے کمرے کے تاریک ماحول پر ایک عجیب سا سحر طاری کر دیا تھا۔ فٹنگر نے جیب سے ریو الورا نکالا اور اندھیرے ہی میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا میٹ لینڈ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

خواب گاہ کے اندرونی منظر پر نگاہ پڑتے ہی فٹنگر دہشت زدہ سا ہو گیا۔ اس نے فوراً لائٹ آن کر دی۔ کمر روشن ہوتے ہی میٹ لینڈ کا مردہ بدن نمایاں ہو گیا۔ اس کی گردن سے بچتے خون نے بیڈ کی اجلی چادر کو رنگ دیا تھا اور مارکونیس سیڈ کی شیطانی کھوپڑی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ اس کے سینے پر براجمان تھی۔ زرد کھوپڑی پر پڑتی روشنی نے اس کی پراسراریت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

فٹنگر نے دیوانگی کے عالم میں شیطانی کھوپڑی کو میٹ لینڈ کے مردہ بدن سے اٹھا کر فرش پر پٹنا اور پھر ریو الورا سے نشانہ لے کر یہ وہ گولیاں چلا کر ریو الورا خالی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں کھوپڑی ریزہ ریزہ ہو کر کھڑ گئی۔



اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ جیسے ہی سوئے گا اسے خواب نظر آنا شروع ہو جائے گا پھر ایسا ہی ہوا وہ چاندنی رات میں میز پر رکھی ہوئی کھوپڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ یہ چیز اس کے لئے حیران کن تھی کوئی بھی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی وہ خود اٹھا تھا۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے تو وہ یہ دیکھ کر ضرور اٹھ بیٹھتا کہ کمرے میں چاندنی کا دریا بہہ رہا تھا اور اس میں کھوپڑی تیر رہی تھی، وہ بار بار گھوم رہی تھی اور اس کے بستر کے قریب آتی جا رہی تھی اور پھر جب وہ کھوپڑی بستر کے قریب فرش پر گری تو اس کی آواز میٹ لینڈ کے سوتے ہوئے کانوں نے بہ خوبی سنی تھی پھر اور خوفناک خواب شروع ہو گیا تھا۔

کھوپڑی بستر پر پڑھ آئی تھی۔ اس کے دانتوں نے بستر کی چادر کو پکڑ لیا تھا اور پھر جھول کر بستر پر اس کے قدموں میں آ گئی تھی۔ اسے اس کھوپڑی کے گرنے کی دھمک محسوس ہوئی تھی پھر وہ بستر پر لڑھکنے لگی تھی اور اس کے سینے کے قریب آ گئی تھی۔ اسے چاندنی میں کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کی گردن سے چھانچ کے فاصلے پر تھی پھر اسے گلے پر تھوڑا سا دباؤ محسوس ہوا کھوپڑی اب حرکت کر رہی تھی پھر وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور خواب ٹوٹ گیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی لیکن باہر نہیں آ سکی۔ اس کی گردن پر کھوپڑی کے دانت پیوست ہو چکے تھے جو ایک انسانی قوت کے ساتھ اس کی گردن کو کاٹ رہے تھے۔ اس کے زخموں سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں جو جلد ہی معدوم ہو گئیں۔ اس کے بعد کھوپڑی میٹ لینڈ کے سینے پر چلی گئی تھی۔ اس کا سینہ اب سانس لینے سے ہل نہیں رہا تھا۔ وہ ساکت ہو چکا تھا اور کھوپڑی اس پر موجود تھی۔ چاندنی کھوپڑی پر پڑ رہی تھی جس سے اس کے خدو خال نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کھوپڑی میں بے تماشیا چمک محسوس ہو رہی تھی جو آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔

میٹ لینڈ کے جانے کے کافی دیر تک فٹنگر سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا رہا اور پھر شاید کسی خیال پر



ساری لڑکیاں پہلے سے ہی وہاں موجود تھیں۔ ان میں گیتا نام کی بھی ایک لڑکی تھی جو کہ بہت خوب صورت تھی۔ کامنی سے ایک دوسرے کی ملاقات ہو چکی تھی۔ کامنی کا دل گھبرا رہا تھا۔ اتنی ساری لڑکیاں اور رول ایک، اگر شام مگر کبھی کو خوب صورت لڑکی درکار ہوئی تو میرا کیا ہوگا؟“ کامنی نے سوچا کیونکہ وہ معمولی شکل کی تھی ہاں مگر ٹیلنٹ کی اس میں کوئی کمی نہ تھی۔

لڑکیاں ایک کے بعد ایک آڈیشن دینے لگیں۔ پھر گیتا کی باری آئی، اسے واپس آنے میں کامنی دیر لگی، جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس نے کامنی اور دوسری لڑکیوں کی جانب دیکھ کر غور سے کہا۔ ”دیکھ لو جا کر تم لوگ، ویسے مجھے نہیں لگتا کہ میرے آڈیشن دینے کے بعد تمہارے اندر جانے کا کوئی فائدہ ہوگا۔ یہ رول تو دیکھنا مجھے ہی ملے گا۔“ اور بال لہراتی ہوئی چلی گئی۔ کامنی کے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے یہ سب سن کر کہا۔ ”رام، رام کتنا غرور ہے اسے، ابھی تو کچھ بنی بھی نہیں اگر بن گئی تو جانے کیا حال ہوگا۔“ اتنے میں کامنی کی باری آ گئی۔

کامنی نے آڈیشن دیا اور جب باہر آ کر گھڑی دیکھی تو دس بجنے والے تھے۔ وہ جلدی جلدی گھر پہنچنا چاہتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کہنے کے باوجود اس کی ماں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا تو ماں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ”ماں! بس تم بھی۔“ کامنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چل ہاتھ منہ دھو لے میں کھانا روٹی ہوں۔“ کامنی نے ہاتھ منہ دھو یا اور پائنتی مار کر نیچے چھٹی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ تھالی میں ابلے چاول اور کٹوری میں دال تھی۔ کامنی نے ہاتھ سے نوالہ بنا کر منہ میں رکھا۔ ”پتر ہوگی تو فلم کے لئے پکی۔“ ماں نے پوچھا تو کامنی ہنسنے لگی۔

”جادو ٹھوڑی ہے ماں، جانتی ہو کتنی لڑکیاں آئی تھیں وہاں مجھے تو بہت مشکل لگ رہا ہے کہ میں چن لی جاؤں گی۔“ کامنی کی ہنسی اس بات پر پھیل گئی۔

”نراش مت ہو پتر! دیکھ ناں بھگوان کی کرپا

سے تو ہی چنی جائے گی۔ میں تیرے لئے پراگھنا کر رہی تھی جب تو ڈائریکٹر سے ملنے گئی تھی۔“ اور پھر دونوں ماں بیٹی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گئیں۔

اگلے روز شام مگر جی کے سیکریٹری نے کامنی کو بلوایا اور اسے خوشخبری سنائی کہ اس رول کے لئے کامنی سلیکٹ ہو گئی ہے۔ کامنی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کتنی محنت کے بعد آج اسے کامیابی مل گئی۔ یہ سب میری ماں کی پراگھنا کا پھل ہے۔“ اس نے سوچا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی ماں کا منہ میٹھا کر لیا تو ماں نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔ ”بھگوان تجھے کامیابی دے!“

شوٹنگ تین دن بعد تھی۔ کامنی سے یہ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا کہ کب شوٹنگ شروع ہو اور وہ مین ہیرو بنے۔

ادھر گیتا ایک سادھو کے سامنے بیٹھی تھی۔ ”کچھ بھی کرو مہاراج مگر میرے راستے کے کاٹنے کو نکال دو۔“ گیتا نے سر جھکائے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے سیاہ رنگت والے آدمی سے کہا جس کے بال اور ناخن میل سے لٹھڑے ہوئے تھے اور وہ آنکھیں بند کئے آگ میں کچھ ڈال رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور غصے سے کہا۔ ”کیا تجھے ہماری ٹھکتی پر غور نہ نہیں رہا یہ جو سن تو لے کر بیٹھی ہے کس نے دیا ہے تجھے؟ بول تو ابھی چین لوں یہ خوبصورتی تجھ سے۔“

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی! مجھے شکر دیجئے۔“ گیتا نے فوراً ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل اتنا سب کرنے کے بعد بھی رول کی اور کول گیا اس لئے میں جذبات میں آ گئی ورنہ میں تو آپ کے چرنوں کی دھول، آپ کی داسی ہوں۔“ گیتا بولی۔

”ہوں! اس بار بھی تجھے کڑی محنت کرنا ہوگی۔“

بول کرے گی؟“ وہ سیاہ آدمی بولا۔

”فلم میں کام کرنے کے لئے میں کچھ بھی کر گزروں گی۔“ گیتا بولی۔

”ٹھیک ہے تو پھر غور سے سن۔ آج سے دو دن

بعد پورن ماشی ہے، اس روز جو بھی مردہ مرگھٹ میں جلانے آئے۔ رات میں تجھے وہاں بیٹھ کر اور ایک دیا جلا کر تجھے جاپ کرنا ہوگا اور سن جاب مکمل ہونے کے بعد اس جگہ کی راکھ جمع کر کے میرے پاس لانا ہوگا۔ باقی میں خود کچلے گا۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں۔“ اور گیتا وہاں سے چلی گئی اور پھر اس نے وہ سب کر دکھایا جو اس سے کہا گیا تھا اور راکھ دینے میں جمع کر کے لے آئی۔ جب وہ آ گئی تو وہ سیاہ آدمی آگ روشن کئے کچھ عمل کر رہا تھا گیتا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کو گیتا کی آمد کا پتہ چل گیا۔

”بڑی جگر والی ہے تو! جو کر گزری اس عمل کو۔“ اس نے اپنے پیلے میلے گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ گیتا نے راکھ سے بھر دیا اس کے چرنوں میں رکھ دیا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ ”عمل تو کروالے کی مگر اس کے بدلے۔“ اس آدمی نے مکاری سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”آپ فکر مت کریں، جو آپ بولیں گے میں وہ کر دوں گی۔“ گیتا نے کہا تو آدمی خباثت سے مسکرانے لگا۔ پھر اس نے ایک تھالی میں ٹھوڑی سی رائی لی اور دینے میں موجود راکھ اس میں ڈال دیا۔ تھالی اس کے آگے تھی اور اس کے ہونٹ مسلسل حرکت کر رہے تھے۔ پھر اس نے گیتا کا ہاتھ پکڑا اور اس کی انگلی پر کٹ لگا کر اس کے خون کے قطرے اس میں پڑ گئے۔ اس کے ہونٹ مسلسل مل رہے تھے۔ پھر اس نے رک کر تھالی میں تھوک دیا اور پھر آنکھیں کھول کر گیتا کی جانب تھالی بڑھائی۔ گیتا نے تھالی میں جھانکا تو اس میں ننھے ننھے سانپ رینگتے ہوئے نظر آئے۔ ”یہ اس جگہ بکھیر دینا جہاں اس کے قدم پڑتے ہوں، تیرا کام ہو جائے گا۔“ اس سیاہ آدمی نے کہا۔

صبح کے وقت کامنی نے کہا۔ ”ماں میں جاری ہوں۔“ اور شوٹنگ کے لئے نکل گئی۔

آج کامنی کا ایک ایڈوٹل سین تھا۔ کامنی نے

اس میں انتہائی شاندار ایکٹنگ کی تھی لگ نہیں رہا تھا کہ وہ ہی ہے اس نے بالکل نیچرل طریقے سے سین کیا اور پہلے ٹیک میں ہی سین اوکے ہو گیا۔

”ویڈن! کامنی کیپ اٹ اپ۔“ شام مگر جی نے کامنی کے پاس آ کر اسے داد دی۔ آدھے گھنٹے کا بریک تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اس کا منہ دوسری طرف تھا کہ اسے کسی کے آنے کا احساس ہوا، اس نے پلٹ کر منہ اڑھ کر کیا تو دیکھا کہ سامنے والی کرسی پر گیتا بیٹھی ہوئی مسکراتی تھی۔ ”کیسی ہو کامنی؟“ گیتا نے پوچھا۔

”سب رام کی کرپا ہے، میں اچھی ہوں۔“ کامنی نے آسان کی جانب منہ اٹھا کر کہا۔ کامنی دل میں حیران تھی کہ گیتا جیسی مغرور لڑکی کو کیا بڑی جو کامنی کا احوال پوچھ رہی تھی۔ ”میں تو تمہیں ”بدھائی“ دینے آئی تھی ہیروئن بننے پر۔“ گیتا نے کامنی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ”غیر محسوس انداز میں رائی کے دانے کامنی کے پیروں کے پاس بکھیر دیئے۔

”دھننے واو گیتا!“ کامنی نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

”دیوی جی! آپ کو صاحب بلا رہے ہیں شاٹ ریڈی ہے آجائیں۔“ ایک اسپاٹ بوائے نے آ کر کہا تو کامنی کھڑی ہو گئی۔

”اچھا گیتا میں جارہی ہوں۔“ کہتی ہوئی بکھری ہوئی رائے کے دانے پر پیر رکھ کر گزرتی چلی گئی اس کے پیچھے گیتا مکارانہ انداز میں ہنستی ہوئی اٹھ کر وہاں سے چل دی۔

کامنی نے میک اپ کی ٹینک کی اور کمرے کے سامنے آ گئی کہ اچانک کامنی چچین مارتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ ”اس کے پیر کے ٹکڑوں پر گہرے گہرے کٹ موجود تھے جن سے خون رسنے لگا تھا پھر کامنی کے کانوں سے خون بہنے لگا۔ روکٹی حیران پریشان تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پھر کامنی کو زور دار ابکانی آئی اور اس نے خون کی الٹی کر دی یہ تو شروعات تھی۔ ایک کے بعد دوسری..... خون کی الٹیاں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی



تھیں اور اسپتال جانے سے پہلے ہی کاٹھی خون تھوکتے تھوکتے مر گئی۔ سب کو ساپ سونگھ گیا کہ پل میں کیا سے کیا ہو گیا۔ کاٹھی کی ماں بھی اس کی موت کی خبر سنتے ہی بھگوان کو پیاری ہو گئی۔

تین دن بعد گیتا ڈائریکٹر شام جی کے گھر گئی اور ان کی فلم کے رکنے اور کاٹھی کی موت پر افسوس کرنے لگی۔ پھر اس نے آنکھ پچا کر ایک پڑیا میں موجود سفوف شام مکر جی کی جانے میں ملا دیا اور اس کے وہاں سے اٹھنے سے پہلے ہی اس کے عمل نے اثر کر دیا اور شام مکر جی نے جیتا کو کاٹھی کی جگہ فلم کی ہیروئن چن لیا۔ گیتا ڈھٹائی سے کاٹھی کی جگہ لے کر خوش تھی اور اسے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

دوسرے دن گیتا کنوئیں کی منڈیر پر چڑھی کہہ رہی تھی۔ ”تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا کیلاش! میں اپنے پرانے تیاگ کر تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گی، نہیں رہنا چاہیے اس سنسار میں۔“

”کٹ ڈائریکٹر نے شات اوکے کر دیا۔ گیتا مسکراتی ہوئی کنوئیں کی منڈیر سے اترنے لگی اور بے دھیانی میں اس کا پیر پھلا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ پہلے اس کا سر کنوئیں کی منڈیر سے ٹکرایا اور وہ کنوئیں میں جا پڑی۔

جب گیتا کو باہر نکالا گیا تو وہ مر چکی تھی۔ فلم پھر رک گئی۔ ڈائریکٹر نے پھری ہیروئن تلاش کی مگر شوٹنگ کے پہلے ہی روز شیٹ پر آگ لگ گئی، ہیروئن کی ساڑی نے بھی آگ پکڑ لی وہ جان بچانے کے پکڑ میں ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور پھر منہ کے بل گری اور لڑھکتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے آ گئی۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئی۔

شام مکر جی اپنا سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور پھر فون پر خوش خبری سن کر کہنی لڑکی مل گئی ہے۔ ان کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا ابھی انہوں نے ریسپورڈ رکھا ہی تھا کہ ان کے بال پیچھے سے اڑے، ہوا کا ایک تیز جھونکا گزرا تھا، ان کی پشت پر، وہ سمجھے کہ کھڑکی

کھلی ہے، انہوں نے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی بند تھی، وہ سر جھٹک کر سگار جلانے لگے، پھر انہیں اپنی گردن کے گوشت پر گرم ہوا محسوس ہوئی، ساتھ ہی کسی کے سانس لینے کی آواز بھی آئی، انہوں نے پھر پلٹ کر دیکھا اس بار ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، ایک دم انہیں اپنے سینے میں شدید تکلیف کی ایک لہر محسوس ہوئی انہوں نے بے اختیار اپنے دل کے مقام کو اپنے ہاتھ سے تھام لیا۔ تکلیف شدید سے شدید تر ہو گئی اور وہ زمین پر گر پڑے اور ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور یوں وہ پر لوک سدا ہار گئے۔

شام مکر جی نہ رہے تو فلم بند ہو گئی اور اس کا اسکرپٹ شام مکر جی کے گھر والوں نے ان کے سامان میں رکھ دیا۔ ان کے گھر والوں کو فلم سے کوئی دلچسپی نہ تھی، شام مکر جی کی پتی غیر ملکی تھی اور اپنے بچوں کے ساتھ باہر ہی رہتی تھی۔ یوں شام مکر جی کے ساتھ ان کی فلم بھی چلی گئی۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ شام مکر جی کا بنگلہ بننے لگا۔ ”آپ بنگلہ دیکھئے پھر فیصلہ کیجئے گا۔“ ایجنٹ نے گاڑی سے اترتے ہوئے روی سے کہا۔ ”سرسری! آپ سے پہلے جو مالک تھے انہوں نے بڑے شوق سے خریدا تھا اس بنگلے کو، یہ ہے ہی اتنا خوب صورت پارسی دور کی طرز تعمیر ہے اس بنگلے کی مگر مالک کی زندگی نے وفاندگی جو وہ زیادہ عرصے اس بنگلے میں رہتے آپ کو پتا بھی ہے وہ کون تھے؟“ ایجنٹ نے روی کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں معروف ڈائریکٹر شام مکر جی۔“ روی نے لا پرواہی سے لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ ایجنٹ چند لمحے خاموش ہوا پھر بولا۔ ”شام مکر جی نے اپنی زندگی کا آخری وقت اسی بنگلے میں گزارا تھا۔“

”تم شام مکر جی کو چھوڑو، میری بات سنو۔“ روی نے روکھے انداز میں کہا جو اس کی شہرت کے باعث اس کے الفاظ میں رجسٹر گیا تھا۔ ”جی!“ ایجنٹ سنبھل کر بولا۔

”بنگلہ مجھے پسند آ گیا ہے! پیپر ریڈی کر کے

لے آؤ، بے منٹ ہاتھ کے ہاتھ ہو جائے گی۔“ روی نے کہا۔

”پیپر ریڈی ہیں، آپ کہیں تو آج شام کو ہی لے آؤں۔“ ایجنٹ نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

”نہیں آج میں بہت مصروف ہوں! تم میرے سیکریٹری کو فون کر کے وقت طے کر لینا۔“ اور یہ کہہ کر روی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ روی چوڑا جانا مانا ڈائریکٹر تھا۔ اس کے کریڈٹ پر بے شمار سپر ہٹ فلمیں تھیں۔ پرسکون ماحول میں چھپاں گزارنے کے لئے اس نے اس بچے والے بنگلے کو خرید لیا تھا۔ ویسے تو وہ اپنی چھپاں ملک سے باہر گزارتا تھا مگر انڈسٹری کے بکھیڑوں سے بچنے کے لئے اس نے کچھ دن سکون سے گزارنے کے لئے اس بنگلے کو چنا تھا۔ روی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اس کے پہلے والے بنگلے میں اس کی فیملی رہتی تھی۔ کام کے لئے یہ جگہ موزوں تھی۔ معاملات طے ہو جانے کے بعد شغل کام کام ہو رہا تھا۔

”سرسری! بچے سے کچھ سامان ملا ہے۔“ ”اچھا میں دیکھتا ہوں۔“ روی نے ایجنٹ کو فون ملا یا تو اس نے کہا۔ ”سرسری دراصل یہ سامان شام مکر جی کا ہے۔ ان کی مرتبہ کے بعد سے یہ بنگلہ کسی کے استعمال میں نہیں رہا۔ ان کی پوری فیملی باہر ہے۔ اب انہیں پیسے کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے اس کو بیچنے کا ارادہ کر لیا اور میں کل آ کر لے جاؤں گا سامان۔“

فون بند کر کے روی بولا۔ ”کتنا بولتا ہے یہ شخص۔“ روی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اپنے اسکرپٹ میں مصروف ہو گیا تو ڈیویر بعد ملازم آ کر بولا۔ ”صاحب کھانا لگا دوں۔“

”ہاں لگا دو۔“ روی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور کاغذات سمیٹنے لگا۔ جب وہ نیچے آیا تو کھانا ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ روی نے پوری توڑی اور منہ چلانے لگا۔ ابھی وہ کھانا کھا ہی رہا تھا کہ سامنے سے دو بندے ایک گرین کٹر کا باکس لے جا رہے تھے۔ روی نے ہاتھ روک کر کہا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”صاحب نیچے سے نکالا ہے پرانے مالک کا ہے۔“

”اسے میرے کمرے میں رکھ دو، میں دیکھتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر روی دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانا ختم کر کے روی اپنے روم میں آیا اور سگریٹ سلگانے لگا پھر اس کی نظر گرین باکس پر پڑی تو باکس کے پاس اکڑو بیٹھ کر اسے کھولنے لگا۔ باکس میں کاغذات بھرے ہوئے تھے، کاٹریکٹ، بلز اور جانے کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ پرانی اداکاراؤں کی تصویریں بھی تھیں۔ روی نکالتے نکالتے تھک گیا اور سر ہلانے لگا۔

”مجھے بھی کیا سوچھی جو اس کاٹھ کو دیکھنے کی کوشش کی۔“ اور کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر باکس میں نیچے سے جھانکتی ہوئی ایک ہیروئن مکر جی فائل پر پڑی۔ روی نے جھک کر اسے کھینچا اور باہر نکال لیا۔ اس نے فائل کو کھولا وہ کسی فلم کا اسکرپٹ تھا۔ اس نے اسے پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ آدھی رات بیت چکی ہے۔ اسکرپٹ ختم کر کے روی نے مسکرا کر کہا۔ ”مان گئے آپ کو شام مکر جی! اتنا بہترین اسکرپٹ صرف آپ کے کلیئر کا ہی ہے۔“

اگلے روز روی نے ایجنٹ سے شام مکر جی کی فیملی کا نمبر لیا اور ان سے اسکرپٹ کو خرید لیا۔ اب وہ روی چوڑا کا اسکرپٹ تھا۔ پھر اس نے اس فلم سے جڑے لوگوں سے بھی بات کی تاکہ بعد میں کوئی آکر اسے پریشان نہ کرے، روی فلم کی تیاریوں میں لگ گیا، اسپانسرز، لوکیشن، کاٹس سب فائل ہو گیا۔ ہیروئن کے لئے روی نے ایک نئے چہرے کا انتخاب کیا، اس نے ایک دو کرشنلزمیں اسے دیکھا تھا۔ لڑکی کا نام ”سارہ“ تھا۔ اس سے بھی روی نے معاملات طے کر لئے۔

شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے روی نے ایک بے حد شاندار لائٹنگ پارٹی رکھی جس میں شوہر کی دنیا کی بڑی چھوٹی سب ہی شخصیات شریک تھیں۔ پارٹی پورے عروج پر تھی۔ روی اپنی ہیروئن سے سب کو متعارف کروا رہا تھا۔













## زندگی

### اقصی رباب- فیصل آباد

اچانک نوجوان کے سامنے گاڑھا گاڑھا دھواں نمودار ہوا جسے دیکھ کر نوجوان کی گھگھی بندھ گئی مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے منہ ہی منہ میں سورہ جن پڑھ کر سامنے پھونک ماری تو ایک خوفناک.....

### دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی ایک ناقابل یقین عجیب و غریب حیرت انگیز ڈراؤنی کہانی

**زندگی** کا ہر رنگ انوکھا ہے، اس کے آنچل میں کہیں ناامیدی کے سکریزے ہیں تو کہیں خوشیوں کے دستکے ہیرے، کبھی سامنے موجود یقین کے منزل کو یہ وہم و گمان میں اور نارسائی میں بدل دیتی ہے اور کہیں راستے کو ہی منزل میں بدل دیتی ہے۔ شاید زندگی کو انسان کی آنکھوں میں چمکتے حیرتوں کے دیئے بہت پسند ہیں۔ اسی لئے یہ کبھی یقینی رہوں کہ میرے ہونے سے ہی تم ہو۔ اور میں کبھی تمہیں

”یہ ہٹ دھرمی ہے تیری ہے کیونکہ تو نے جو پایا ناجائز ذریعے سے پایا، پاپ کے اوپر پاپ کر کے تو نے دوسروں کا حق چھینا ہے اور آج بھی اسے اپنا ہی حق سمجھ رہا ہے، جا چلی جا اور چھوڑ دے زردوش لوگوں کی جان“۔ مہاراج نے کہا۔

”جو کوئی میری جگہ لینے کی کوشش کرے گا وہ تو اپنی جان سے اوش جائے گا“۔ آتما نے غرا کر کہا۔

”ٹھیک ہے یہی ہے ناں جڑ، یہی چاہئے ناں تجھے، لے یہ لے“۔ اتنا کہہ کر مہاراج نے فلم کا اسکرپٹ اپنے سامنے اچھال کر پھینک دیا گیتا کی آتما اپنی جگہ سے غائب ہوئی اور جھٹ سے اسکرپٹ کے پاس حاضر ہو گئی۔ مہاراج نے آنکھیں بند کیں اور ہونٹوں کو حرکت دی تو اسکرپٹ میں آگ بھڑک اٹھی۔

”یہ تو نے کیا کر دیا؟“ گیتا کی آتما چٹکھڑائی ہوئی مہاراج کی جانب لپکی مگر کنڈل کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ بہت خوشوار ہو رہی تھی۔

”اب تیری باری ہے۔“ مہاراج نے اتنا کہہ کر آنکھیں بند کیں۔ لمحہ بھر میں گیتا کی آتما آگ میں گر گئی۔ اور چھین مارتی ہوئی جلنے لگی اور پھر غائب ہو گئی۔ اسکرپٹ کے تمام کاغذات جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

روی اور آتما بند بابو دونوں نئی فلم کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ روی نے فلم کو شروع کرنے سے پہلے مہاراج کو بلا کر ایک ہون کر دیا۔

رات کو روی اپنی ٹیبل پر بیٹھا اپنے نئے اسکرپٹ کو پڑھ رہا تھا۔ پچھلے جو دن اس نے گزارے تھے وہ سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے اور روی نے ان سب کو اپنے اسکرپٹ میں قید کر لیا تھا اور اس نے اپنے اوپر بیٹے ہوئے حالات پر ایک ہار فلم بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ اپنی نئی فلم ”ہیر وٹن“ کی شوٹنگ اشارت کر کے بہت خوش تھا۔ اس نے فائل بند کی اور اپنے ہونڈ پر لیٹ گیا۔

”ہاں بڑے جگرے والی تھی۔“ مہاراج نے کہا۔

”تو کامی ان کی وجہ سے مر رہی تھی؟“ آتما بند بابو نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

”کامی کے مرنے سے اس نے فلم تو حاصل کر لی، مگر اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کی محنت بے کار جائے گی اور ایک حادثے کے نتیجے میں اس کی موت ہو جائے گی۔ وہ مرنے لگی مگر اس کا جنون، اس کی اچھا پوری نہ ہونے کے کارن اس کی آتما نہ تھوڑی ہو سکی، اور وہ اپنی جگہ کی کوئیں لینے دے گی، اسی کارن وہ اس فلم کو بننے نہیں دے رہی اس کا ماننا ہے کہ اس میں کام کرنا صرف اس کا حق ہے اور کوئی نہ تو اس کی جگہ لے سکتا ہے اور نہ اسے شامل کئے بغیر اس فلم کو مکمل کر سکتا ہے۔ اور جس نے بھی ایسا کرنے کی کوشش کی وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے گی اور وہ ایسا ہی کر رہی ہے اور آگے بھی ایسا ہی کرے گی۔“ اتنا کہہ کر مہاراج خاموش ہو گئے۔

”مہاراج! اس کا کوئی تو پاپے ہوگا؟“ روی نے پوچھا۔

”ہاں صرف ایک ہی پاپے ہے۔“ اور مہاراج نے روی کو بتادیا۔ روی سوچ میں پڑ گیا تو مہاراج بولے۔ ”بالک جس کام میں اتنی رکاوٹیں آجائیں اس کو نہ کرو تو ہی اچھا ہے۔“

”ٹھیک ہے مہاراج! جیسے آپ کی اچھا۔“ روی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

اگلے روز سب اس کنوئیں کے پاس آ گئے جہاں گیتا کی مرتی ہوئی تھی۔ مہاراج نے اپنے گرد کنڈل کھینچا اور آگ روشن کر کے منٹروں کا چاپ کرنے لگے ٹھوڑی ہی دیر بعد گیتا کی آتما حاضر ہو گئی۔

کیوں رکی ہوئی ہے یہاں؟“ چلی جا، اس سنسار میں تیری جگہ نہیں۔“ مہاراج نے گرج کر کہا۔

”مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے پنڈت! جو میری چیز ہے مجھے اس سے مطلب ہے اور اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“ گیتا کی آتما بولی۔





Price : 300/-

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پرنکٹن ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تک و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت، ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ نکھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مندر بننے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دار لکتب

قدانی مارکیٹ اردو بازار لاہور

اس آدمی نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اندازہ نہیں کر پایا کہ وہ میری بات پر سوچ رہا ہے یا اسے میری مداخلت ناگوار کر رہی ہے۔

بہر حال وہ خاموش تھا یا شاید خالہ کی مروت میں چپ تھا۔ میں نے اس عورت سے کہا۔ ”مجھے بچہ پڑائیں۔ اس عورت نے بغیر کچھ کہے بچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں بچے کو لے کر وہاں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا اور سورہ جن، آیت الکسری اور موزن پڑھ کر بچے پر پھونکنے لگا۔ حیرت انگیز طور پر بچے کی حالت سدھرنا شروع ہو گئی اور بچے کا لرزنا ختم ہو گیا۔

بہر حال میں کافی دیر تک بچے پر پڑھ کر پھونکتا رہا۔ اب بچہ معصومیت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بچے کا منہ چوما اور اس کی ماں کی طرف بڑھا دیا۔

بچے کی درست حالت دیکھ کر شاید ایک دم میں اور میری بات ان لوگوں کے لئے معتبر حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس آدمی نے دونوں آدمیوں کو واپس بھیج دیا اور معصومیت سے پوچھنے لگا۔ ”اب پھر کیا کرنا چاہئے ہمیں آپ بتادیں؟“

اس کا سوال سن کر میں سوچنے لگا کیونکہ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے بھی کچھ کرنے کا ہو سکتا ہے۔ اچانک ایک بات میرے ذہن میں آ گئی اور میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”آپ ایک آسان کام کریں۔ بلند آواز سے کہیں۔“ ”آپ لوگ بھی یہاں رہتے ہیں اور ہم بھی۔“

ایک چمڑی سے ایک کونے سے کچھ حصہ چھوڑ کر نشان لگا دیں اور بلند آواز سے کہیں۔ ”یہ جگہ آپ کی ہوئی اور باقی ہماری نہ ہم آپ کو تنگ کریں گے نہ آپ لوگ ہمیں تنگ کریں۔“

”ایسا کرنے سے کیا وہ لوگ مان جائیں گے؟“ اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

”ہاں بالکل۔“ میں نے اسے یقین سے جواب دیا۔ مگر اندر سے مجھے خود پورا یقین نہیں تھا۔ بس ایک درخواست تھی۔ ہو سکتا ہے کام کر جائے۔ اس آدمی نے

کے پیر صاحب کو بلایا۔ پیر صاحب کا کہنا ہے کہ گھر میں آسب کا سایہ ہے۔“

آسب کا نام سنتے ہی میرے اندر کی صلاحیتیں اور موجود سارا جوش ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا۔

”پھر خالہ! اس پیر صاحب نے کیا حل نکالا؟“

”حل کیا نکالنا، پیر صاحب نے یہ برآمدہ گرانے کا حکم دیا ہے کہ اس کو گرا دو بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ خالہ نے جواب دیا۔

میں اس حل پر ششدر رہ گیا۔ جنت کو بھگانے کا یہ طریقہ تو میں نے نہیں نہیں پڑھا تھا۔ جن اور آسب سے تعلق ہر پڑھی کتاب میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اتنے میں ان کے گھر دو لوگ داخل ہوئے۔

چوہلے کے پاس بیٹھا آدمی انہیں داخل ہوتے دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور برآمدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اسے گراتا ہے۔“ جتنی جلدی ہو سکے۔“

مجھ سے رہا نہ گیا اور تیزی سے میں بولا۔ ”رکھو زور!۔۔۔۔۔“

خالہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں تیزی سے چھت سے نیچے کی طرف اتارا کہ ان کے گھر جاسکوں۔ خالہ بھی میرے پیچھے لپکیں۔ ”ارے بھال الدین رکھو!۔۔۔۔۔ بات تو سنو میری!۔۔۔۔۔ ارے رکھو!۔۔۔۔۔“ مگر میں خالہ کی بات ان سنی کرتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہو گیا۔

وہ سب لوگ بیچ جن میں کھڑے تھے۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر عورت بھی بچہ کو دو میں لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”آپ کے گھر میں بس ایک کمرہ اور ایک یہ برآمدہ ہے جسے آپ ہو سکتا ہے جانوروں کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ وقت بے وقت خود بھی یہاں بیٹھتے ہوں گے۔ اس کو گرا دیں تو پھر؟ کیا آسب بس انتظار میں ہے کہ اسے آپ گرائیں تو وہ یہاں سے فوراً نکل جائے؟“

اپنا آپ بھلائے نہیں دوں گی۔“ ہاں ایسا ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی موقع پر۔۔۔۔۔ ہم سب کے ساتھ۔ اگر ثبوت انداز میں ہو تو ہمیں لگتا ہے۔ ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔ اور اگر برے انداز میں اور مٹنی رنگ میں ہو تو ہم قسمت کو ہی ”برا“ کہنے لگتے ہیں۔

میری زندگی کا یہ واقعہ بھی ایسا ہی ہے جس نے مجھے حیران کر دیا۔ میں شاید کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا میری زندگی میں بھی ہو سکتا ہے۔ جو آپ کو سنانے جا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے سب پڑھنے والے اس واقعہ کے حیران ضرور ہوں گے۔ یہ واقعہ بہت خوفناک نہیں مگر حیران کن ضرور ہے۔

میرا نام جلال الدین ہے۔ مجھے ہمیشہ سے مافوق الفطرت باتوں میں دلچسپ رہی ہے۔ امتحانات سے فارغ ہوا تو اپنی خالہ کے گھر چلا گیا۔ میری خالہ فیصل آباد کے پاس ہی ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔ میں اپنی خالہ کے ساتھ چھت پر گھومتے ہوئے خلاف عادت ساتھ والوں کے گھر میں جھانکنے لگا۔ اس گاؤں میں ابھی گیس نہیں پہنچی۔ اینٹوں کے بنے چولہے میں آگ جلا کر اس کے گرد ایک خاتون بیٹھی تھیں جن کی گود میں ایک بچہ تھا۔ ایک بوڑھی عورت پاس بیٹھی تھیں اور اس بوڑھی عورت کے ساتھ ایک درمیانی عمر کا آدمی بھی تھا، پورا گھر ایک کمرہ، ایک برآمدہ، پر مشتمل تھا اور کافی کھانا جن تھا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے بچہ ہر تھوڑی دیر بعد جھٹکے کے انداز میں اپنی ٹانگیں زور سے ہلاتا ہے۔ کیونکہ عورت کی گود میں ہونے کی وجہ سے اور عورت کی میری طرف پیٹھ ہونے کی وجہ سے بچے کی بس ٹانگیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے خالہ سے کہا۔ ”خالہ! بچے کو کیا ہوا؟ بچہ ٹھیک تو ہے نا؟“

خالہ نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”نہیں! پہلے تو ڈاکٹر ز سے چیک اپ کرواتے رہے۔ کسی ٹیسٹ میں کسی بیماری کا پتہ نہیں چلا۔ جب آرام نہیں آیا تو یہاں



ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد میں خالہ کے ساتھ گھر آ گیا۔  
خالہ بالکل خاموش تھیں۔

”.....خالہ..... کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہیں؟“  
”جمال الدین تمہیں اس چکر میں نہیں پڑنا

چاہئے تھا۔“ خالہ نے افسردگی سے جواب دیا۔  
”خالہ اگر بچے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں کبھی اتنا  
جذباتی نہ ہوتا۔ آپ نے دیکھا ناں کہ بچہ ٹھیک ہے۔“  
میں نے جوش سے جواب دیا۔

”ہاں! اس پر مجھے بھی خوشی ہے۔ مگر..... اگر  
فائدے کی جگہ نقصان ہو جاتا تب کیا ہوتا؟ یہ بھی سوچا تم  
نے؟ تم نے بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔“ خالہ  
نے خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔

”خالہ! سوچا تو مجھ میں نہیں میں نے..... مگر برا  
نہیں ہوا کچھ..... تو کیا غمی سوچنا؟“

میں نے خوش ہو کر کہا۔ خالہ نے ”پگلا“ کہہ کر  
پیار سے میرے سر پر چپت لگادی اور ہم دونوں ہنسنے  
لگے۔ مگر میری ہنسی میں حیرت بھی شامل تھی۔ خوشگوار  
حیرت۔ میں ایک ہفتہ خالہ کے گھر رہا۔ ہمسائے بھی  
خوش تھے۔ انہیں اب کوئی مسئلہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں  
سکون سے واپس لوٹ آیا۔

☆.....☆.....☆

میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اچانک مجھے  
اپنے سر پہ دھواں سا محسوس ہوا میں نے جلدی سے سورہ  
جن پڑھ کر خود پر پھونک ماری اگرچہ پھونک مارنے میں  
مجھے کافی دقت ہوئی۔ خوف کی وجہ سے پھونک خود پر  
ماری نہیں جا رہی تھی۔ بہر حال میں نے کافی مشکل کے  
بعد پھونک ماری لی خود پر۔ پھر میں نے ایک بار سورہ  
جن پڑھ کر دھوئیں پر پھونک ماری تو وہ دھواں ایک  
انسانی شکل میں نمودار ہو گیا اور ڈرتے ہوئے بولا۔  
”تمہیں نہیں..... اور نہ پڑھنا۔ میں نقصان کرنے کے  
ارادے سے نہیں آیا۔ میں تو اطلاع دینے آیا تھا۔“  
”کیسی اطلاع؟“ میں حیران رہ گیا۔  
”یہ کہی کہ جو آپ نے گاؤں میں حفاظتی حد

کروائی تھی۔ وہ دائرہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ جنتاں وہاں  
سے نکل آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ سایہ غائب ہو گیا۔ اور  
میں غبی آفت میں پھنس گیا۔ اسے کہتے ہیں آئینل مجھے  
مار۔ ان کو منع بھی کیا تھا کہ ادھر نہ جائیں۔

میں خود سے الجھتا ہوا گھر والوں سے کہہ کر خالہ  
کے پاس چلا گیا۔ مگر خالہ میرے آنے کے مقصد سے  
قطعی بے خبر تھیں۔ میں نے گھر پہنچ کر ذرا سا آرام کیا  
اور پھر ساتھ والوں کے گھر میں چلا گیا۔ ان لوگوں نے  
کافی خوب صورت گھر بنالیا تھا۔ مجھے کافی حیرت ہوئی۔  
پوچھنے پر بتا چلا کہ پہلے جنتاں ان کا بہت نقصان کرتے  
تھے۔ فصل تباہ کر دیتے اس لئے گھر میں غربت کا رواج  
تھا۔ مگر اب خوشحالی ہے۔ اس وقت سے۔

میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”انکل میں نے  
آپ لوگوں کو منع کیا تھا کہ انہیں اس کوٹنے میں رہنے  
دیں۔ اس طرف آپ لوگ پاؤں بھی نہ رکھیں۔ مگر پھر  
بھی آپ لوگوں نے وہ حصار توڑ دیا۔ وہ لوگ پھر نکل  
آئے وہاں سے۔“

وہ آدمی حیران رہ گیا اور مجھے لے کر اس دیوار  
کے پاس گیا۔ ”یہ دیکھیں! ہم نے یہ دیوار بھی ترچھی  
بنائی کہ کہیں بچہ کسی وقت غلطی سے ادھر نہ چلا جائے۔“  
حصہ ہی دیوار سے باہر کر دیا اور دیوار کے باہر باؤل لگادی  
کہ کوئی اور غلطی سے اس طرف نہ جائے۔“ جب ہم  
دونوں باہر نکلے تو وہ باؤل ٹوٹی ہوئی تھی۔

نجانے کون انجانے میں باؤل توڑ گیا تھا۔  
ہم دونوں پریشان اندر کی طرف بڑھ گئے۔  
سب پریشان ہو گئے یہ سن کر کہ ”جنتاں اب پھر نکل  
کر سکتے ہیں۔“

میں نے ان لوگوں پر سورہ جن پڑھ کر حصہ  
باندھنا کہ وہ سب محفوظ رہیں۔ خود پر سورہ جن پڑھ کر  
پھونک ماری اور ایک بار پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک  
کر چہرہ پر پھیر لیا اور سورہ جن پڑھ کر سامنے پھونک  
ماری تو ایک جن انسانی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ وہ کافی  
صحت مند تھا اور اس کے پیچھے ایک کمزور اور ضعیف

انسانی وجود لئے جن کھڑا تھا۔

میں نے ایک دائرہ بنایا اور ان دونوں کو کہا۔  
”اس دائرے میں آ جاؤ۔“ مگر جن نے فوراً بات مان  
لی مگر صحت مند جن نے انکار کر دیا۔ میں نے اس پر سورہ  
جن پڑھ کر پھونک ماری تو جیسے اس کے جسم پر لرز طاری  
ہو گیا فوراً دائرے کے اندر آ گیا۔

اتنے میں مجھے پھر سفید دھواں دکھائی دیا۔ میں  
نے اس پر سورہ جن پڑھ کر پھونک ماری تو وہ بھی ایک  
نوجوان کی صورت میں میرے سامنے آ گیا۔ اتنے میں  
دائرے میں موجود جن نے اشارے سے بیڈیٹ  
دائرے کے اوپر پھیلادی اور اس پر چلتا ہوا باہر آ گیا۔  
میں حیران رہ گیا۔

دھوئیں والا جن بولا۔ ”اس نے بیڈیٹ پھیلانے  
کا ذرا نہ کیا ہے۔ ایک بار حصار ٹوٹ جائے تو پھر ہمیں قید  
نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس کے بغیر بھی باہر آ سکتا تھا۔“

میں حیران رہ گیا۔ وہ جن تو انسانوں کی طرح  
مذاق کر رہے تھے میرے ساتھ۔ میں نے اس بیڈیٹ  
کے ذریعے نکلے ہوئے جن پر سورہ جن پڑھ کر پھونک  
ماری اور اسے دائرے میں جانے کو کہا۔ اس کے  
دائرے میں جاتے ہی میں نے دائرے کے ارد گرد سورہ  
جن پڑھ کر پھونکنا شروع کر دی۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا  
تو میں نے اس دھوئیں کے بنے جن سے کہا۔ ”چلو تم  
بھی دائرے کے اندر۔“

وہ جن بولا۔ ”تم کون ہو؟ جو لوگ ہمارے نام  
پر احق لوگوں سے پیہر کھاتے ہیں ان میں تو تمہیں کبھی  
نہیں دیکھا۔“  
”کیا تمہیں ان سب کا معلوم ہے؟“ میں نے  
حیرت سے کہا۔

”ہمارے نام پر لوگوں کو لوٹتے ہیں تو کیا ہمیں  
ان کا معلوم نہیں ہوگا؟ سب کا علم ہے۔“ اس جن نے  
گردن اگڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے سورہ جن پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو  
میں حیران رہ گیا کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ النادہ زور

زور سے ہنسنے لگا۔ اور یہ دیکھ کر میرا تورنگ فق ہو گیا۔  
”میں مسلمان جن ہوں۔ وہ مسلمان نہیں تھے  
اس لئے ان کے ساتھ ایسا ہوا..... اب کیا کرو گے؟  
جس سورہ کو پھیرا بنا کر استعمال کر رہے تھے مجھ پر  
پھونک کر اسے خود تم نے میرے لئے ڈھال بنادیا۔“  
جن نے فخر سے کہا۔ مجھے اس دن اندازہ ہوا کہ  
ہاتھوں کے طوطے اڑنا کسے کہتے ہیں۔

میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں سورہ جن کا  
عامل ہوں۔ اچانک بلا سوچے سمجھے میں نے سورہ جن  
اور سو دتین پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک ماری  
اور اللہ کے نام کا ورد کرتے ہوئے اس جن کی گردن کو  
جا پکڑا۔ وہ جن حیرت سے بولا۔ ”ایسی ہمت تو آج  
تک کسی انسان نے نہیں کی۔“ میں بات کا جواب دینے  
بغیر اللہ کے نام کا ورد کرتے ہوئے اس کی گردن پر دباؤ  
بڑھاتا گیا۔

اب وہ لا چاری سے بولا۔ ”مجھے اللہ کے واسطے  
معاف کر دو، میں تو ان جنتاں کے ہاں مہمان آیا ہوں۔  
واپس جا رہا ہوں، پھر کبھی نہیں آؤں گا۔“

اس کی بات سن کر میں مطمئن ہو گیا۔ اور حیرت سے  
پوچھا۔ ”مہمان؟“ تم لوگ بھی مہمان آتے جاتے ہو؟“  
”کیوں تم انسان ہی مہمان آ، جا سکتے ہو؟“  
اس نے ہنس کر جواب دیا۔

”کیسے یقین کروں کہ اب دوبارہ ادھر نہیں  
آؤ گے؟“

اس نے قسم کھائی حضرت سلیمان بن داؤد کی تو  
میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میرے چھوڑتے ہی اس نے  
وہاں سے بھاگنے میں غایت جانی۔

میری زندگی نے مجھے وہ دکھایا اور مجھ سے کروا  
ڈالا جس کا میں نے گمان تک نہیں کیا تھا۔ اب یقیناً  
زندگی میری اور آپ سب پڑھنے والوں کی آنکھوں  
میں حیرت کے ٹمٹماتے جگنو دیکھ کر مسکرا رہی ہوگی۔





خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کھانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچھے میں ذاتی حیرت انگیز اور تیراگیز کہانی

### وسکن ڈیزل کے جانے کے بعد میں

اور صوفیہ دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ صوفیہ نے کہا۔

”بے حد ذہین انسان ہے۔ میں ایک بات جانتی ہوں۔ قدرت نے ہر انسان کے لئے انتظام کیا ہے، ہم لوگ ان حالات کا سامنا کیسے کر سکتے تھے۔

”ایک بات بڑی دلچسپ ہے سٹر۔ وہ یہ کہ آپ بڑی مشکل کا شکار ہو گئیں میری وجہ سے۔“

”ایسے نہ کہو..... میرے سر پرست، میرے استاد نے تمہارے لئے زندگی کی بازی لگادی۔ اور پھر

میں تو اب تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔“

”میں ہنس کر خاموش ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے لگا۔ دل پر ایک خوف طاری تھا۔ اس لئے ہوٹل سے کیا

کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے۔ البتہ وسکن ڈیزل جب ہمارے پاس آئے تو انہوں نے کہا۔

”تم لوگوں نے اپنے آپ کو قیدی کیوں بنالیا ہے بے بی۔“

”بس احتیاطاً انکل۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے تم آرام سے میڈرڈ کی سیر کر سکتی ہو، اس سے مجھے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ میں

اندازہ لگا سکوں گا کہ کوئی تمہاری نگرانی تو نہیں کر رہا۔“

”آپ کا قیام کہاں ہے انکل۔“

”تم سے دور نہیں ہوں۔ تمہاری نگرانی بھی کر رہا ہوں۔ مطمئن رہو۔“

ہم نے وسکن ڈیزل کی ہدایت پر عمل کیا اور دوسرے دن سے آوارہ گردی شروع کردی۔ حسین موسم، حسین مناظر میں خوب دل لگ گیا تھا۔ پھر کئی دن کے بعد سٹر ڈیزل کا فون موصول ہوا۔

”کہو ناشٹیک ہو۔“

”جی انکل۔“

”کل شام سات بجے مارشل روانہ ہو رہا ہے۔ کل ٹھیک چار بجے تم ہوٹل چھوڑ دوگی۔ میں نے سارا

انتظامات کر لئے ہیں۔“

سمندری سفر کا تصور ہی انوکھا تھا۔ میں اور صوفیہ دیر تک اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن چار بجے ہم تیار تھے اور ڈیزل کی طرف سے

اطلاع کا انتظار کر رہے تھے کہ انکل ڈیزل خود ہی آگئے۔ ضروری کارروائیوں سے گزر کر آخر کار ہم نے

سمندر کے سینے پر چپکولے کھاتی عمارت میں قدم رکھا۔ سمندر کے سینے پر آباد اس چھوٹے سے شہر کا میں نے





کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ہر چیز حیران کن تھی۔ ہمیں برابر، برابر کے دو کیمین دیئے گئے تھے صوفی بھی اس جہاز کی خوبصورتی سے بے حد متاثر تھی۔

ہمارے کیمین بھی فائو اشار ہوٹل کے پر آسائش کروں جیسے تھے۔ صوفیہ میرے ہی کیمین میں تھی۔ سات بجے جہاز نے لنگر اٹھا دیئے۔ شروع شروع میں طبیعت متلانے لگی۔ ایک سروٹ نے ہمیں خوب صورت ریپر میں گولیاں پیش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ یہ گولیاں چوس لیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے میرا نام جم بارلو ہے۔ آپ صرف مجھے جم کہہ سکتی ہیں۔ میں آپ کو سفر کے دوران سرو کروں گا۔ گولیوں نے واقعی بہت سکون دیا تھا۔ ہم پھر اس سفر کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ سسٹر صوفیہ نے کہا۔

”ایک بات بتاؤ نشا۔ تمہیں پامسٹری سے کوئی دلچسپی رہی ہے۔“

”اتفاق سے نہیں..... کیوں.....؟“

”ایک بار ایسے میں ایک سڑک پامسٹ نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ میں زندگی میں سمندری سفر ضرور کروں گی۔“ میں ہنس کر خاموش ہو گئی۔

”پتہ نہیں..... یہ سب کیا ہے؟“ میں نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ پتہ نہیں کیا بجا تھا جب انکل و سکن ہمارے کیمین میں آ گئے۔

”کیا ہے بھئی۔ تم لوگ آخر اتنی خوفزدہ کیوں ہو۔ وہاں عرشے پر دن لٹکا ہوا ہے۔ جہاز کے سارے مسافر سفر کی پہلی رات کا جشن منارہے ہیں اور تم دونوں خوفزدہ چوہوں کی طرح چھپی بیٹھی ہو۔“

”ہم کیا کریں انکل۔“ میں نے پوچھا۔

”چلو..... میرے ساتھ آؤ۔“ ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے۔ واقعی زبردست ماحول تھا۔ اتنی تیز روشنی جل رہی تھیں کہ واقعی دن لٹکا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر طرف لوگ نکھرے نظر آ رہے تھے۔ عرشہ کی ریلنگ کے ساتھ بہت سے لوگ ٹکے ہوئے

سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ جگہ جگہ اوپن ریسٹوران بنے ہوئے تھے جن میں رنگین کرسیاں اور میزیں بھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں انکل ڈیزل کے ساتھ بہت دور نکل آئے۔ وہ ہمیں جہاز کے مختلف حصے دکھا رہے تھے اور ان کے بارے میں بتا رہے تھے، یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا، سسٹر صوفیہ کے چہرے سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ مارشل کا یہ سفر انہیں بہت پسند آیا ہے۔ ریلنگ کے پاس آ کر سمندر دیکھا، تاحہ نگاہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جو آخر کار تاریک آسمان سے جا ملتا تھا، میں نے متاثر لہجے میں کہا۔

”ہم زمین سے بہت دور نکل آئے ہیں انکل۔“

”ہاں بہت دور.....“ و سکن ڈیزل نے پر خیال لہجے میں کہا۔ پھر ہم ان رنگین کرسیوں پر آ بیٹھے اور ویز نے میڈیو سامنے رکھ دیا، اس میں حلال گوشت کی ڈشز الگ تھیں جن کے سامنے مسلمان باورچیوں کے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ وہی کھانے منکوائے گئے رات بار بجے عرشہ خالی ہونے لگا۔ کلب میں رونق ہو رہی تھی۔

”نہیں بے بی، کلب ٹھیک جگہ نہیں ہے، میرے خیال میں اب تم لوگ آرام کرم چلو واپس چلے جی۔“ اور ہم اپنے کیمین میں واپس آ گئے، اپنے بستر پر لیٹ کر میں نے سسٹر صوفیہ سے کہا۔

”کیا آپ کو یقین آتا ہے کہ ہم زمین اور فضا کے دور پانی کے سینے پر ہیں اور ہمارے ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔“

”سمندر، اس کائنات کی ایک انوکھی روایت۔“ ہم دیر تک سمندر کے بارے میں باتیں کرتے رہے، پھر سو گئے، اور صبح ہی آنکھ کھلی، چند لمحوں کے بعد ہمارے ائینڈنٹ نے کیمین کے دروازے پر دستک دلا اور اندر آ کر ہمیں صبح کا سلام کیا۔

”ہیلو جم۔“

”ہیلو میڈم، میں آپ کو یہ اطلاع دینے کے لئے آیا تھا کہ عظیم ریسٹر و سکن ڈیزل کیپٹن روڈرگس

کے ساتھ برج پر موجود ہیں اور آپ کے لئے ہدایت دے گئے ہیں کہ آپ چاہیں تو باہر نکل آئیں۔“

ہم لوگ ضروری تیاریوں کے بعد باہر آ گئے، عرشے پر پہنچے ناشتہ کیا، سسٹر ڈیزل کا کوئی پتہ نہیں تھا، ناشتے کے بعد ہم ریلنگ کے پاس کھڑے سمندر پر لوہوں کو دیکھتے رہے، اب سمندر سے دشت نہیں ہو رہی تھی، چنانچہ ہم جہاز کا جائزہ لینے لگے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ سمندر نے ایک پورے شہر کو اپنے سر پر اٹھایا ہوا ہے۔ ایک دواں دواں شہر کون اچھا ہی گزرا تھا، کافی لوگ سمندر سے لطف لے رہے تھے، خود جہاز پر اتنی تقریحات موجود تھیں کہ کچن بات یہ ہے کہ خوب دل لگ رہا تھا۔ شام ہوئی سورج ڈوبنے کا منظر بھی بے مثال تھا۔ رات کو پھر دیر تک عرشے پر چہل قدمی ہوئی رہی، انکل ڈیزل بھی کئی بار ہمارے پاس آئے تھے اور ہماری خبریت پوچھتی تھی۔

ادھر ہمارا ائینڈنٹ جم بھی دلچسپ آدمی تھا اور ہم اس سے جہاز کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے تھے۔ وہ ہمیں ملکوں ملکوں کی کہانیاں سناتا رہا تھا، آج کا دن کافی پرسکون گزرا تھا۔ لیکن رات پرسکون نہیں تھی، کوئی دو بجے کا وقت تھا میں سوئی ہوئی تھی کہ ایک انوکھی کھڑ بڑا ہٹ سنائی دی تھی اور بے مقصد ہی آنکھ کھلی گئی، لیکن آنکھ بے مقصد ہی نہیں کھلی تھی، کیمین کے ایک روشن دان میں دو چراغ جل رہے تھے۔ ہلکی نیلی روشنی لے، انتہائی بھیا نک چراغ جو حرکت کرتے اور ادھر ادھر مل رہے تھے۔ میں نے آنکھیں میچھ کر غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ دو آنکھیں ہیں جو ہمیں دیکھ رہی ہیں، پھر چراغوں میں تحریک ہوئی اور وہ تھوڑے سے آگے آئے، یہی میرے بدن میں شدید یکپہلی دوڑ گئی۔

وہ ملی تھی، وہی منحوس ملی جو ایک طویل عرصے سے میرا تعاقب کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ہی روشنائی کا خیال آیا اور میرے بدن نے ٹھنڈا پسینہ چھوڑ دیا، یہ وہم نہیں تھا، وہم یہ پتہ نہیں کیوں اسی

وقت سسٹر صوفیہ بھی جاگ گئی۔ میرے دہشت زدہ چہرے کو دیکھ کر اس نے میری نگاہوں کا تعاقب کیا، بلی روشن دان سے اندر آ گئی تھی اور کیمین کی دیوار پر پتے جما کر نیچے اتر رہی تھی، اسے دیکھ کر سسٹر صوفیہ کے حلق سے ایک دہشت بھری چیخ نکل گئی اور ایک حیرت انگیز منظر لگا ہوں کے سامنے آ گیا، دیوار پر نیچے جما کر نیچے اترتی ہوئی بلی دیوار ہی پر واپس چلی اور ایک دم سے روشن دان میں داخل ہو کر غراب سے باہر نکل گئی۔ سسٹر صوفیہ اپنی جگہ لیٹی کانپ رہی تھی اور میں اپنی جگہ..... بلی غائب ہو گئی تھی، صوفیہ نے بھی کچن آواز میں مجھے پکارا۔

”نن..... نن..... نن..... نشا.....“

”ہاں میں جاگ رہی ہوں سسٹر۔“

”بب..... بب..... ملی۔“

”ہاں..... ملی.....“

”تم نے اسے دیکھا؟“ سسٹر صوفیہ بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ میں بھی اٹھ گئی تھی، پورا دن جیسے اٹھ رہا تھا، ایک عجیب سا خوف دل میں جا گزین تھا، میں نے کھٹی آواز میں کہا۔

”اس کا مقصد ہے کہ روشنائی بھی جہاز پر موجود ہے، روشنائی کی شکل میں یا اس بھیا نک عورت کی شکل میں۔“

بہت بری حالت ہو گئی تھی ہماری، صوفیہ بھی بری طرح متاثر تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اب کیا ہو گا نشا؟“

”پتہ نہیں کیا ہو گا، پتہ نہیں۔“ میں نے زچ لہجے میں کہا۔ صوفیہ بھی نروس تھی، عقل و ہوش ساتھ چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ بلی کی یہاں موجودگی بہت برے خیالات کو جنم دیتی تھی۔ پھر بھلا باقی رات نیند کہاں سے آتی، طبیعت بری طرح گری گری تھی، کیمین سے نکل بھاگنے کو دل چاہ رہا تھا، روشنی خوب ہو گئی اور ناشتے کا وقت ہو گیا تو ہم دونوں تیاریوں کے بعد باہر نکل آئے۔ عرشے پر پہنچے ہی تھے کہ و سکن ڈیزل ہمارے



پاس آتے ہوئے نظر آئے۔

”ہیلو بے بی کیا بات ہے، کل جیسی تازگی تمہارے چہرے پر نہیں ہے، آؤ ناشتہ کرتے ہیں۔“

”جی انکل۔“

”اوپن ایئر رستوران جگہ جگہ موجود تھے جہاز کے مسافروں کے لئے ہر طرح کے انتظامات موجود تھے۔ ناشتہ ہمارے سامنے آ گیا اور ڈیزل نے کہا۔

”ہاں بھئی، کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے تم لوگوں کی، غالباً جہاز پر کچھ طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

”نہیں انکل! ایک بہت بھیانک بات ہوئی ہے۔“

انکل ڈیزل کا ہاتھ ناشتہ کرتے کرتے رک گیا، وہ بولے۔

”کیا مطلب؟“

”انکل رات کو وہ خوفناک بلی جو روشاق کا ٹریڈ مارک ہے اور اس کے پاس ہی نظر آتی رہی ہے، میں نے آپ کو تفصیل بتائی تھی، وہ رات کو ہمارے کیمپ میں جھانک رہی تھی، پھر وہ روشن دان سے نیچے اتر آئی۔“

میں نے پوری تفصیل انکل کو بتائی اور انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے صوفیہ کی طرف دیکھا، صوفیہ نے فوراً ہی تائید میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... میں نے بھی اپنی آنکھوں سے یہ پورا منظر دیکھا ہے۔“

”اوہ اس کا مقصد ہے کہ یہ وہ نہیں ہے، میں نے تو یہ سوچا تھا کہ شاید نشاء کے ذہن پر بلی اور روشاق کا خوف سوار ہے تو اسے وہم ہو لیکن تم بھی اس کی تصدیق کر رہی ہو۔“

”سو فیصدی، سو فیصدی، میں نے بلی کو اچھی طرح دیکھا تھا۔“

انکل ڈیزل سوچ میں ڈوب گئے پھر انہوں نے کہا۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میری ساری کوششیں حماقت ثابت ہوئیں، روشاق ہمارے فریب میں نہیں آیا، وہ کامیابی سے ہمارا تعاقب کر رہا ہے، لیکن مجھے ایک بات بتاؤ، کیا وہ بلی اس کی نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں انکل، اس کا میری زندگی سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، میں اچھی طرح پہچانتی ہوں اسے۔“

”بڑی تشویش کی بات ہے لیکن تم لوگ فکر نہ کرو، میں نے تمہاری تمام فکریں اپنے ذمے لے لی ہیں، میں اسے تلاش کرتا ہوں۔“

”فرض کیجئے انکل، وہ جہاز پر ایک مسافر کی حیثیت سے موجود ملتا ہے تو آپ اس کا کیا بگاڑ لیں گے؟“

”بالکل ٹھیک سوال کیا تم نے، بالکل ٹھیک سوال کیا، اس سلسلے میں مجھے روڈرگس کا سہارا لینا پڑے گا، میں اسے بتاؤں گا کہ وہ ایک پراسرار آدمی ہے، ایک ہولناک مجرم جو مارشل پر ہم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”ہم لوگوں کے ذہنوں پر تو ایک اور خوف بٹا ہوا ہے انکل۔“

میں نے کہا۔

”کیا؟“

”میں نے آپ کو اسے ہمدانی صاحب کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔“

خدا نخواستہ کہیں وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔“

وسکن ڈیزل نے پوری سنجیدگی سے یہ بات سنی اور بولے۔

”ہاں اس بات کے امکانات ہیں، لیکن بہر حال میں کوشش کروں گا اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ روڈرگس کو کس طرح روشاق کے خلاف آباد کیا جاسکے گا اگر وہ جہاز پر موجود ہے تو، روڈرگس صرف اتنا جانتا ہے کہ ہم اس کے جہاز میں الجھناڑ جا رہے ہیں، اس نے ہمیں ہر طرح کی مراعات کی پیشکش کر دی ہے، بس اسے کسی طرح کی جھوٹی سچی کہانیاں سنانی ہوں گی، یہ ایک بہت بڑا پوائنٹ ہے کہ روشاق اگر قانونی طور پر اس جہاز کا مسافر ہے تو ہم اسے کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں جب تک کہ وہ کوئی جرم نہ کر ڈالے۔“

”انکل میں بہت نروس ہو گئی ہوں۔“

”نہیں بے بی نہیں، میں نے بار بار تم سے

بات کہی ہے کہ جو ذمے داری ہارون دانش نے میرے سپرد کی ہے۔ اب وہ تمہاری نہیں میری ذمے داری ہے اور میں اسے پورا کروں گا، ہاں اگر تم بہت زیادہ پریشان رہیں تو یہ بات میرے لئے پریشانی کا باعث ہو جائے گی۔ میں ایک بار پھر تم سے کہتا ہوں کہ بے فکر رہو، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”انکل! ہم خود سے زیادہ آپ کے لئے پریشان ہیں۔“

”نہیں بے بی تمہاری سوچ غلط ہے، اگر تمہارے ذہن میں ہمدانی کا خیال ہے تو ان کا معاملہ دوسرا تھا، تمہاری کہانی یہ ہے کہ روشاق کو ہارون دانش کی تلاش ہے اور اسے کے ہمدانی ان کے بارے میں جانتے تھے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لئے اسے ان پر انتہائی تشدد کر ڈالا تھا، میری طرف سے بے فکر رہو، بے شمار پراسرار طاقتیں میرا تحفظ کرتی ہیں، اذکے۔“

وسکن ڈیزل نے ناشتے سے فراغت حاصل کی اور کھڑے ہو کر بولے۔

”مجھے اگر کوئی چیز پریشان کرے گی تو وہ ہے صرف تمہارا خوف، تمہارے بے سکونی بس یہ اضطراب ہے مجھے۔“

”نہیں انکل، ہم آپ پر بھروسہ کرتے ہیں۔“

”اوکے ڈیزر، اب میں روشاق کی تلاش کے لئے کیپٹن روڈرگس کو شیشے میں اتارتا ہوں، البتہ تم بھی جہاز کے مسافروں پر نگاہ رکھنا ہو سکتا ہے وہ تمہیں نظر آ جائے۔“

یہ کہنے کے بعد انکل وسکن ڈیزل وہاں سے چلے گئے، ہم دیر تک کچھ نہیں بول سکے تھے، بمشکل تمام ہمارے حواس درست ہوئے تو صوفیہ نے کہا۔

”ایک بات بتاؤ نشاء، اگر روشاق ہمارے تمام پروگرام سے واقف رہا ہے اور اس جہاز تک آ گیا ہے تو کیا اس بات کے امکانات ہیں کہ عسکری جو اس کے لئے کام کر رہا تھا اس کے ساتھ ہو۔“

میں نے حیرت زدہ نگاہوں سے سسٹر صوفیہ کو دیکھا، ابھی تک مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا، لیکن صوفیہ

نے ایک عجیب بات کی طرف نشاندہی کی تھی میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے۔“

”خیر، میں وسکن ڈیزل کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ہمیں ہمت سے کام لینا ہے، تم جانتی ہو کہ کوئی لالچ مجھے یہاں تک نہیں لایا میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں، چنانچہ جو کچھ میں کہوں اسے مان لینا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“

”میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر عسکری مل جائے تو تھوڑی سی اداکاری کر کے اس کا ساتھ قبول کر لینا۔“

”کیا؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں جانی، مصلحت۔“ اب تک وہ تمہیں بیوقوف بناتا رہا ہے، اب تم اسے بیوقوف بناؤ گی۔“

”لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا؟“

”بعض اوقات حالات کا رخ اس طرح بدلتا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا، ممکن ہے ہم اسے روشاق کے خلاف ہی استعمال کر ڈالیں ممکن ہے وہی ہمارے لئے روشاق کے خلاف جاسوس بن جائے۔“

صوفیہ نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گئی، مجھے اس شخص سے بے پناہ نفرت ہو گئی تھی، یہ نفرت محبت میں نہیں بدل سکتی تھی، مثیل کا چہرہ میری نگاہوں میں آ جاتا تھا وہ اسے چاہتی تھی اس کیلئے دھوکے باز کو، لیکن لیکن لیکن.....

”کیا سوچنے لگیں؟“ صوفیہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”کوئی خاص بات نہیں.....“

”یہ صرف ایک مفروضہ ہے، ہو سکتا ہے وہ جہاز پر نہ ہو، لیکن اگر وہ نظر آ جائے تو اس کے ذریعے ہم روشاق کو بہت سے دھوکے دے سکتے ہیں۔“

”میں سمجھ رہی ہوں، اگر وہ یہاں ہوا تو میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گی۔“

”مسٹر ڈیزل بھی یہی چاہتے ہیں، ہمیں ہمت



سے کام لینا ہوگا۔“

بہر طور میری زندگی تو اب یہی رہ گئی تھی، کیا کروں اور کیا نہ کروں تھوڑی دیر کے بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے، اس کے بعد پورا دن کوئی واقعہ نہیں پیش آیا تھا۔ دوپہر کے بعد موسم بھی ابر آلود ہو گیا، آسمان پر گھٹائیں چھانیں لگیں اور جہاز کے خلاصی بارش سے بچاؤ کے انتظامات میں مصروف ہو گئے، لیکن رات تک بارش نہیں ہوئی البتہ آسمان بدستور گہرے بادلوں سے ڈھکا رہا تھا، جم ہمارے پاس آیا اور اس نے انکل کا پیغام دیا۔ رات کے کھانے کے لئے انہوں نے ہمیں ایک شیک میں بلوایا تھا، وہ مطمئن نظر آ رہے تھے۔

”ہیلو انکل۔ کوئی خاص بات۔“ صوفی نے فوراً پوچھا۔

”بے حد خاص۔“ مسٹر ولسن ڈیزل نے کہا اور ہم دونوں چونکے ہو گئے، مسٹر صوفی نے سوالیہ انداز میں ولسن ڈیزل کو دیکھا تو اس نے ایک ملازم کی طرف اشارہ کر دیا اور اسے کھانے کا آرڈر دینے لگے، کھانے کے دوران خاموشی طاری رہی تھی، پھر کافی پیتے ہوئے مسٹر ڈیزل نے کہا۔

”روشن جہاز پر موجود نہیں ہے۔“

”اوہو، کیسے انداز ہوا؟“

”روڈرگس ایک دلچسپ آدمی ہے، بہت ہی دہمی اور توہم پرست، میں نے اسے اس بلی کی کہانی سنائی جو ایک پراسرار روح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے پس منظر میں ایک شخص ہے روحوں کا رکھوالا اور روڈرگس اب اس شدید خوف کا شکار ہو گیا ہے کہ کہیں کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے۔“ ولسن ڈیزل مسکرا دیے۔

”روشن جہاز کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل

سکا۔“

”نہیں مسافروں میں اس نام کا کوئی مسافر نہیں ہے۔“

”مجھے ایک بات یاد آئی ہے انکل۔“

اچانک ہی میں نے کہا اور ولسن ڈیزل میری جانب متوجہ ہو گئے، ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے انہیں عدنان ثنائی کے بارے میں بتایا اور ان کی تحقیق کا تذکرہ کیا، ولسن ڈیزل گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر انہوں نے کہا۔

”واقعہ واقعی سنسنی خیز ہے، کیا کہا جاسکتا ہے کہ آگے کے حالات کیا ہوں، صورت حال شدید پر اصرار ہو گئی ہے، خیر روشن جہاز کا تو کوئی سراغ نہیں ملا، لیکن میں نے جب پراسرار روح اور بلی کی کہانی سنائی تو اس کے جواب میں بیوقوف کپتان نے مجھے ایک اور کہانی سنا دی اور یہ کہانی واقعی قابل ذکر ہے، جہاز میں البرونوس نامی ایک شخص سفر کر رہا ہے جو ماریطانیہ تک جا رہا ہے، اس کے ساتھ دو تابوت ہیں جنہیں ماریطانیہ لے جا رہا ہے۔“

”تابوت“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں مصری طرز کے تابوت جن میں میاں

ہیں۔“

”اوہ مائی گاڈ، کیا کیپٹن روڈرگس نے وہ تابوت

کھول کر دیکھے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ہاں پوری چھان بین کی گئی ہے ان کی

منشیات اور ہتھیار وغیرہ کے سلسلے میں ان کی پوری حلقہ

لی گئی ہے کیونکہ اس کے بغیر انہیں جہاز میں جگہ نہیں دی

جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اسپین گورنمنٹ نے اپنا

ادبی جاری کیا ہے، خیر یہ بات اپنی جگہ ہے لیکن میں نے

روڈرگس کو تیار کر لیا ہے کہ کسی بھی مناسب وقت وہ مجھے

ان تابوتوں کی میاں دکھائے، میں جنہیں بھی ساتھ

رکھوں گا۔“

”آپ نے میرے ذہن میں شدید تجسس

کر دیا ہے انکل، آپ نے البرونوس کو دیکھا ہے۔“

”ہاں ایک پستہ قامت سگی سا آدمی ہے، جس

بھی دکھاؤں گا، ویسے روشن جہاز کا پورا حلیہ مجھے بتاؤ

تو اسے اچھی طرح دیکھا ہے نا۔“

”بہت اچھی طرح، وہ تینوں میں ہمارے ساتھ

تھا بلکہ ہمارے ساتھ ہی تینوں تک گیا تھا۔“

”مجھے اس کا حلیہ بتاؤ۔“ ولسن ڈیزل نے کہا اور میں نے اسے روشناس کا سارا حلیہ بتا دیا ولسن ڈیزل سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

”نہیں وہ کسی بھی طرح البرونوس نہیں ہو سکتا، دے اس کا تعلق اٹلی سے ہے، وہ ایک پستہ قامت اٹالین آدمی ہے، ایسے ہی میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ ممکن ہے روشن جہاز بدلے ہوئے نام سے سفر کر رہا ہو۔“

”میں نے بھی یہ سوچا تھا انکل ڈیزل، آپ کو اس کا اندازہ کیسے ہوا؟“

انکل ولسن ڈیزل کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے پھر انہوں نے کہا۔

”تم نے فوراً سوال کیا تھا کہ کیا میں نے البرونوس کو دیکھا ہے۔“

”جی انکل۔“

”اس بات کے امکانات ہیں کہ روشن جہاز بدل کر سفر کر رہا ہو۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے انکل۔“

نہیں جہاز کے ہر مسافر پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ لیکن یہ ایک ناممکن بات ہے۔ ہم کسی بھی طرح ہر مسافر کا جائزہ نہیں لے سکتے۔“

بات ٹھیک تھی۔ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ ولسن ڈیزل چلے گئے۔ آسمان پر بدستور گہرے بادلوں کا راج تھا۔ ہلکی ہلکا باندی ہونے لگی تو موسم بے حد خوب صورت ہو گیا۔ اس موسم سے متاثر نہ ہونا ایک غیر انسانی عمل ہوتا۔ ہم عرشے کے ایک پرسکون گوشے کی طرف چل پڑے۔ لوگ اس موسم سے پوری طرح

لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہمارے سامنے پکراں سمندر تھا۔ جہاز کے عملے کو شاید بارش کی توقع تھی یہ لوگ موسموں کے باہر ہوتے ہیں چنانچہ وہ کھلی ہوئی روشنیوں کو شیشی کور سے ڈھکنے میں مصروف تھے۔ ہم سے کچھ

فاصلے پر ایک شخص آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سیاہ لباس میں

لباس تھا اور اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اچانک اس نے رخ بدلاتو میری نظر اتفاقاً طور پر اس کی طرف اٹھ گئی۔ دوسرے لمحے میرا بدن تھرا گیا۔ سارے بدن میں شدید سنسنی دوڑ گئی۔ وہ عسکری تھا۔ اب وہ براہ راست میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”غضب کا موسم ہے نشاء۔ سمندری سفر کے بارے میں سنا تھا کہ وہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ لوگ توہنی مون کے لئے یہ سفر کرتے ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو صوفی نے چونک کر مجھے دیکھا اور آواز دی۔ ”نشاء۔ کہاں ہو تم۔“

”مسٹر۔۔۔۔۔ میں نے کبھی گھٹی آواز میں کہا۔

”کیا ہوا جان۔“

”عسکری۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”ایں۔“ صوفی نے بے اختیار کہا۔ اور پھر عسکری کو دیکھا۔ پھر بولیں۔ ”یہ عسکری ہے۔“

”ہاں۔“

”پورے وثوق سے کہہ رہی ہو۔“

”صوفی صدی۔“

”میری ہدایت یاد ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ابھی میں نے یہ جملے پورے ہی کئے تھے کہ دفعتاً عسکری نے اپنی جگہ چھوڑ دی وہ سیدھا ہماری طرف آ رہا تھا۔

قریب پہنچ کر اس نے بغیر کسی ہتھکڑی کے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ جہاز پر میری موجودگی سے واقف ہیں اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ آپ مجھ سے کبھی مخاطب نہیں ہوں گی۔“

”آپ واقعی چیخیں ہیں مسٹر عسکری۔“

”آپ مجھے چند منٹ دے سکیں گی۔“

”جی فرمائیے۔“

”تھوڑی دیر کے لئے تنہائی چاہتا ہوں۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”اس طرف۔“



”جاؤ نشاء لو۔ صوفیہ نے کہا اور میں عسکری کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ چند گز کے فاصلے پر جا کر ہم رک گئے۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

”میں نے تم سے کہا تھا نشاء کہ میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں زندگی کی بازی لگا کر تمہاری حفاظت کروں گا۔“

”شکریہ، شکریہ مسٹر عسکری۔ ہاں یہ تو بتائیں آپ کا آقا و رشتا بھی جہاز پر موجود ہے یا نہیں۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے؟“

”ہاں وہ جہاز پر ہی ہے۔“

”ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ آپ اس کی پناہ میں رہ کر میری حفاظت کر رہے ہیں۔“

”اب میں تم سے کوئی التجا نہیں کروں گا نشاء۔ اگر تم پسند کرو تو تھوڑی سنجیدگی سے میری بات سن لو۔“

”کیا تمہارے آقا کی طرف سے میرے لئے کوئی پیغام ہے۔“

”وہ میرا آقا نہیں ہے۔ تم کیوں مجھے ذلیل کر رہی ہو.....“ وہ جھلا کر بولا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا۔

”غلطی کسی انسان سے ہو سکتی ہے۔ میں مالی پریشانیوں کا شکار ہو کر اس کا ساقی بن گیا تھا۔ مگر مجھے بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ خیر مجھے اندازہ ہے کہ میں تمہارا اعتماد کھو چکا ہوں۔ لیکن اب میں تمہارے التفات کے لئے نہیں بلکہ اپنا کفارہ ادا کرنے کے لئے سب کچھ کر رہا ہوں۔ میں تم سے مخاطب نہ ہوتا۔“

عسکری کے لئے میرے دل میں زہری زہر تھا لیکن صوفیہ نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس کا بھی خیال رکھنا تھا۔ چنانچہ میں خاموش رہی۔ وہ کہنے لگا۔ ”روشتا تمہیں کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔“

”خوشخبری ہے میرے لئے۔ پھر وہ کیا چاہتا ہے؟“

”یقین کرو۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس تمام کارروائی کا پس منظر بے حد پراسرار ہے۔“

”نہیں۔ وہ کہیں اور ہے لیکن جہاز پر ہی ہے۔ میں نے اسے دوبارہ اس کے پاس دیکھا ہے۔ پھر وہ نظر نہیں آئی۔“

”ایک بات اور بتا دو عسکری۔ کیا وہ تمہیں کبھی عورت کے روپ میں نظر آیا۔“

”کبھی نہیں۔ اب میں تم سے ایک بات پوچھوں۔“

”ہاں پوچھو۔“

”ابروٹس کون ہے۔“

میرا چونکا فطری تھا۔ میں نے عسکری کو دیکھا تو اس نے کہا۔ ”روشتا کی پوری توجہ ابروٹس پر ہے جو دو تابوت لے کر سفر کر رہا ہے۔ روشتا کا خیال ہے کہ وہ وسکن ڈیزل کا آدمی ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ ممکن ہے وہ روشتا کا شکار ہو جائے۔“

میں تشویش سے ہونٹ سکڑ کر خاموش ہو گئی۔

”روشتا ان تابوتوں میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ خیر۔ میں تو ہر طرف نگاہ رکھ رہا ہوں۔ صرف تمہارے لئے نشاء۔ میں اپنی کوتاہی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں تم سے کچی محبت کرتا ہوں اور اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتا۔“

”تم نے مثل کے بارے میں نہیں سوچا عسکری۔“

”ہاں نشاء۔ انسان محبت میں بے حد خود غرض ہو جاتا ہے۔“

”وہ تم سے محبت کرتی ہے۔“

”میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں۔ چلو چھوڑو۔ میں چلتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو گی تو تم سے ملتا رہوں گا کیونکہ روشتا بھی یہی چاہتا ہے۔ لیکن میں صرف تمہارے لئے اس سے رابطہ رکھتا ہوں۔ خدا حافظ۔“ وہ واپس پلٹ گیا۔ تب مسٹر صوفیہ میرے پاس آئیں۔

”آؤ چلیں۔“ انہوں نے کہا اور ہم اپنے کمبین جانے کے لئے چل پڑے۔

دوسری صبح جاگے تو شدید بارش ہو رہی تھی۔

عرشے پر پہنچے تو سارا ماحول جل تھل ہو رہا تھا۔ انکل ڈیزل جیسے پہلے سے منتظر تھے۔ کیوں کی چھتیں کھل گئی تھیں۔ ایک ریسٹوران میں بہترین کافی کے سب لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ”انکل آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”ہاں ضرور۔“

میں نے انہیں روشتا اور عسکری کی پوری کہانی سنادی۔ ان کے چہرے پر فکر کے آثار ابھر آئے۔ وہ کافی دیر خاموش رہ کر بولے۔

”ہمیں کسی بھی طرح البروٹس کو دوست بنانا ہوگا۔“

”وہ خطرے میں ہے۔“

”اس سے تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔“

”بتائے کیا کیا جائے۔“

کچھ لمحے سوچنے کے بعد ڈیزل نے کہا۔ ”آؤ برج پر چلتے ہیں۔ ہم برج پر پہنچے تو روڈرکس بہت پریشان نظر آیا۔ اس نے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ پھر بولا۔

”میں بہت پریشان ہوں۔“

”کیا ہوا؟“

”بادلوں کا رنگ دیکھ رہے ہو۔ وہ آسمان پر ساکت ہیں۔ جیسے ہواؤں کا انتظار کر رہے ہوں۔ سمندر پر چھائے ہوئے ایسے بادل طوفان کا پیش خیمہ ہوتے ہیں، اور ان بادلوں کے نیچے سمندری سفر پر سکون نہیں رہتا۔“

”کیا تم نے کوئی خواب دیکھ لیا ہے؟“

”شاید جاگتی آنکھوں کا خواب، میں نے دیکھا کہ میں جہاز پر سفر کر رہا ہوں اور برج پر کھڑا اور بین سے سمندر میں دیکھ رہا ہوں کہ اچانک سمندر کے پانی کا ایک حصہ کھولنے لگا اور پھر اس سے ایک آتش فشاں نے منہ نکال کر جھانکا اور بلند ہوتا چلا گیا، بس اس خواب نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

”یار کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔ سچ بتاؤ۔“



وسکن ڈیزل نے پریشان لہجے میں کہا۔

”ویسے ایک بات کی پیشگوئی میں کرتا ہوں مائی ڈیزل پکتان، اس جہاز پر کم از کم ایک شخصیت ایسی ضرور ہے جو انتہائی پراسرار اور خوفناک کبھی جاسکتی ہے۔“

روڈرگس نے براسامند بنایا اور بولا۔  
”تمہاری انہی دل دہلا دینے والی باتوں نے میرے ذہن کو خراب کیا ہے میں نے تو ابھی تک پورے جہاز پر کوئی بلی نہیں دیکھی اور نہ بلی والا۔“  
”مگر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس پراسرار بلی کا مالک روشاق ہے ایک انوکھا انسان اور وہ تمہارے جہاز پر موجود ہے، محض اس شخص بلی کے۔“

”بکواس..... میرا اٹاف مستعد ہے اور کسی نے پورے جہاز پر نہ کوئی بلی دیکھی اور اس نام کا کوئی شخص بھی نہیں۔“ روڈرگس نے اٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ واقعی کافی پریشان نظر آ رہا تھا، وسکن ڈیزل کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے پھر انہوں نے کہا۔

”تو پھر سنو مائی ڈیزل، میں تمہیں اپنی تحقیق بتاتا ہوں۔ جس شخص کا نام میں نے روشاق لیا ہے وہ فرضی نام سے سفر کر رہا ہے، اور کین نمبر سات سو میں مقیم ہے، اس کا نام حارث سلامہ ہے۔“  
کینٹن روڈرگس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وسکن ڈیزل سے مختصر الفاظ میں روشاق کے بارے میں بتانے لگا، پکتان روڈرگس تھوڑی دیر تک تو کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔

”اگر اس نے حارث سلامہ کے نام سے پاسپورٹ حاصل کر لیا ہے اور اسی پاسپورٹ پر یہ سفر کر رہا ہے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ الجزائر میں ایک میکریشن کے حکام کو اس کی نشاندہی کر دیں۔ اسے جہاز پر کوئی نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔“

”اور اگر وہ البر ونوس کو کوئی نقصان پہنچا دے تو۔“

”جہاز پر اگر اس نے معمولی سا جرم بھی کیا تو

میں اسے گرفتار کر سکتا ہوں، ہمارے پاس باقاعدہ قید خانہ ہے، بلکہ قیدی بھی ہیں۔“

”قیدی۔“  
”ہمارے نہیں، بلکہ اسپین حکومت کے قیدی جن کی تعداد آٹھ ہے، اور اسپینش انفر اینٹیں گرفتار کر کے الجزائر لے جا رہے ہیں۔ جہاں شاید انہیں موت کی سزا دے دی جائے، تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر وہ البر ونوس کو نقصان پہنچائے گا تو میں اسے گرفتار کر لوں گا یہ تو بہتر ہوا کہ اس کی نشاندہی ہوگی، ہمیں مجرم نہیں تلاش کرنا پڑے گا۔“

”اور اگر البر ونوس کو نقصان پہنچ گیا تو؟“  
”بھلا اس کی پیش بندی کیسے کی جاسکتی ہے، تم اگر چاہو تو میں البر ونوس کے تحفظ کا بندوبست کر دوں۔“  
”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وسکن ڈیزل نے پریشان لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔

”اور ان باتوں کو دکھانے کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟“

”تاہم جہاز کی ٹخلی تہہ میں مال خانے میں محفوظ ہیں، آج رات کو ان کا جائزہ لے لیا جائے گا، ویسے ایک بار البر ونوس اجازت لے کر میرے دو آدمیوں کے ساتھ وہاں جا چکا ہے۔“

”رات کو کس وقت چلو گے؟“  
”گیارہ بجے کا وقت مناسب رہے گا، گیارہ بجے کے بعد مال خانے پر پہرہ لگ جاتا ہے اور کوئی وہاں نہیں جاسکتا۔“

آخر کار میں صوفیہ اور وسکن ڈیزل کینٹن کے پاس سے واپس آ گئے، آسمان کی وہی کیفیت تھی، صوفیہ نے کہا۔

”کالے بادل پہلے بھی دیکھے ہیں مگر اتنے گہرے سیاہ بادل کبھی نہیں دیکھے، ممکن ہے سمندر پر ان کی سیاہی زیادہ محسوس ہوتی ہو۔“

”ہاں ممکن ہے۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔  
مجھے ان کالے بادلوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا،

البتہ شام کو میں نے صوفیہ سے کہا۔

”کیا خیال ہے سسٹر، کیا کین نمبر سات سو کو تلاش کیا جائے؟“

”کیوں؟“ صوفیہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔  
”ہم خود روشاق سے ملیں، میں تمہیں مختصر تفصیل بتا چکی ہوں، تینس ہم ساتھ ہی گئے تھے، دو کردار اور تھے جن کا اب نام و نشان نہیں ہے۔“  
”مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“

”ہو سکتا ہے وہ ہمارے اس طرح سامنے آجائے خوفزدہ ہو جائے۔“  
”نہیں نشا نہیں۔ اپنے آپ کو خطرے کے منہ تک لے جانا مناسب نہیں ہے۔“

”یونیوں دل میں خیال آیا تھا۔“  
”اس کے برعکس میں ایک اور تجویز پیش کروں، اگر اس طرح ملنا ہے تو پھر البر ونوس سے کیوں نہ ملا جائے۔“

عجیب سی بات تھی، میں چونک کر سسٹر صوفیہ کو دیکھنے لگی، پھر میں نے کہا۔

”لیکن تو ہم اسے پہچانتے ہیں اور نہ اس کے کین نمبر معلوم ہے، پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس قسم کا انسان ہے، نہیں سسٹر ایسا کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں ہے جس سے خطرہ پیدا ہو، ہمیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا۔“

”او کے او کے، میں کب منع کرتی ہوں؟“  
”باتوں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا، کوئی نیا موضوع بھی نہیں تھا، دل پر ہمیشہ ایک بوجھ سا طاری رہتا تھا، انوکھے حالات میں وقت گزر رہا تھا۔“

”کینٹن میں گھسے گھسے کیا کریں، چلو عرشے پر بیٹھتے ہیں۔“

سسٹر صوفیہ کو عرشے سے واقعی کافی دلچسپی ہو گئی تھی۔ دلچسپی تو مجھے بھی تھی، بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا، ہر طرف نیکراں سمندر اور پر کھلا آسمان، بس یوں لگتا تھا جیسے ایک الونکی دنیا ہو، کسی سیارے پر اٹلے ہوں، ہم

بہر حال عرشے پر آ گئے، آسمان کا وہی عالم تھا، کالی گھٹائیں تلی کھڑی تھیں، ماحول سے حد بوجھل ہو رہا تھا، رات کی بارش کے بعد پورا دن بارش نہیں ہوئی تھی، لیکن اس وقت سماں کچھ اور تھا، ابھی ہم عرشے پر بیٹھے تھے کہ اچانک آسمان سے پانی کی دھاریں پھوٹ پڑیں، عرشے پر موجود مسافروں میں بالکل گنجائی، لوگ بری طرح نیچے بھاگنے لگے، ہم دونوں نے ایک محفوظ جگہ پناہ لے لی، ویسے بھی مارشل انتہائی خوب صورت جہاز تھا، راہداریوں اور برآمدوں میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ دوسرے درجے کے کینٹن کے ساتھ لائبریری تھی جس میں لاتعداد کتابیں بھی ہوئی تھیں۔

باروم اور کھیلوں کے لئے وسیع کمرے تھے، عرشے پر حسین پب بنے ہوئے تھے جن کی کیفیت بڑی خوشنما تھی، تمام فرسٹ کلاس کینٹن ایئر کنڈیشنڈ تھے، ایک طرف جہاز کے اعلیٰ افسروں کے اور انجینئروں کے کینٹن تھے، انہی کینٹنوں کے اوپری حصے میں روڈرگس کا وہ کینٹن تھا جسے ہم اندر سے دیکھ چکے تھے، بارش کی وجہ سے علیٰ کے افراد نے ایسی چیزوں پر خوشنما پھول دار تریال ڈھک دیئے تھے، جن کو پانی سے نقصان پہنچ سکتا تھا جگہ جگہ مسافروں کے لئے خصوصی ہدایات درج تھیں، کھلے سمندر میں یہ اہتمام بھی بہت عجیب لگتا تھا۔ خاص طور سے اس وقت جب سمندر دیکھا جائے تو پھر تو یہ سارا اہتمام ناقابل یقین محسوس ہوتا تھا، بارش طوفانی جھکڑوں کے ساتھ شروع ہوئی تھی اس لئے شاید زیادہ خطرناک تصور کی گئی تھی۔ جہاز کالا ڈاؤن سیکر کھینچا تھا۔

”براہ کرم عرشے پر کوئی مسافر موجود نہ رہے، سب لوگ نیچے چلے جائیں۔“

”چلو، وائی اوہ میرے خدا، ذرا سمندر دیکھو۔“  
صوفیہ نے کیکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، دھواں دھار بارش کے ساتھ چاروں طرف سمندر ابلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، دیوہیکل لہریں جہاز کی طرف لپکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی خوفناک عفریت جہاز کو نگل لینا چاہتا



ہو، میں بھی سہم گئی اور سسٹر صوفیہ کے ساتھ اپنے کیمین میں واپس آ گئی۔

”خدا کی پناہ کیسا ہولناک منظر ہے، دل لرز رہا ہے۔“ میں نے کہا اور ایک دم خاموش ہو گئی، جہاز کو کئی زور دار جھٹکے لگے تھے، وہ ان مہیب لہروں کے نرسے میں جھکولے کھانے لگا تھا، پھر بڑی عجیب سی آوازیں سنائی دینے لگیں، ایسا لگا جیسے گولیاں چل رہی ہوں، ہمارے کیمین میں شیشے لگے ہوئے تھے لیکن ان کے دوسری طرف گھب اندھیرا تھا، البتہ بارش کا ہولناک شور اور بادلوں کی گرج صاف سنائی دے رہی تھی، میں نے خوفزدہ لہجے میں سسٹر صوفیہ کو پکارا۔

”نہیں ڈیڑ ڈرو نہیں، ہم تنہا نہیں ہیں بے شمار لوگ ہیں، اگر تم کہو تو میں سسٹر وِسکن ڈیزل کو بلا لاؤں؟“

”کیا وہ اپنے کیمین میں ہیں؟“

”پتہ نہیں۔“

”ارے دیکھو ذرا کیمین کس بری طرح ہل رہا ہے۔ کیا آپ کھڑی ہو سکتی ہیں صوفیہ۔“

”کوشش کرتی ہوں۔“ صوفیہ نے کہا اور پھر وہ کسی نہ کسی طرح باہر نکل گئی۔ میں بستر سے چٹھی ہوئی انتظار کرتی رہی، کچھ دیر کے بعد سسٹر صوفیہ گرتی پڑتی اندر آ گئی۔ ”وِسکن ڈیزل اپنے کیمین میں نہیں ہے۔“

صوفیہ نے کہا میں نے کوئی جواب نہیں دیا، رفتہ رفتہ جھکولوں میں کی آنے لگی، شور بھی کم ہو گیا تھا، پھر طوفان ٹل گیا، ایک کیمین کا دروازہ کھلا اور وِسکن ڈیزل کیمین میں داخل ہو گئے، وہ مسکرا رہے تھے۔

”نیلو بہادر لڑکیو! کیا لایڈ ونچر ہے یہ؟“

”آپ اسے ایڈ ونچر کہہ رہے ہیں انکل، ہم نیم مردہ ہو گئے ہیں۔“

”اوہ نہیں بے بی، سمندری سفر میں ایسے معمولی طوفان آتے رہتے ہیں۔“ وِسکن ڈیزل نے لا پرواہی سے کہا۔

”یہ معمولی طوفان تھا۔“

”بالکل معمولی، روڈرگس کہتا ہے کہ ایسے طوفان بالکل بے ضرر ہوتے ہیں۔“

”خدا کی پناہ ہمیں کیا معلوم، ہماری تو جان ہی نکل گئی تھی۔“

”تم نے کھانا کھالیا۔“

”خاک، اندر کا نظام تو الٹ پلٹ ہو گیا ہے، ایسے میں کھانے کا ہوش کسے ہو سکتا ہے۔“

”میں کھانا منگواتا ہوں۔“

”نہیں انکل اس وقت کچھ نہیں کھا سکوں گی، کم از کم میں کچھ نہیں کھا سکوں گی، سسٹر اگر آپ کھانا چاہیں۔“

”نہیں بھی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

لیکن وِسکن ڈیزل نے ہمارے ہی کیمین میں کھانا منگوا دیا اور خوب ڈٹ کر کھلایا، ان کے اس اطمینان سے ہمیں بھی ڈھارس ہوئی تھی، وِسکن ڈیزل کافی دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے، پھر ہمیں تسلی دیتے ہوئے اٹھ گئے۔

”اب تم لوگ آرام سے سو جاؤ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اوکے سسٹر ڈیزل۔“ صوفیہ نے کہا اور کیمین کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ہم دونوں بستروں پر چالیں، وِسکن ڈیزل کی ان تسلیوں کے بعد طبیعت کافی پرسکون ہو گئی تھی اور کچھ دیر خاموشی طاری رہی تو نیند آ گئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک ہی جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور میں جاگ گئی، کانوں میں زبردست گڑ گڑاہٹ ابھر رہی تھی۔ کیمین میں نجانے کیوں اندھیرا پھیل گیا۔ پھر یوں لگا جیسے باہر لوگ چیخ چلا رہے ہوں۔ ذہن صحیح طور سے کام نہیں کر رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹی ذہن کو نیند کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگی، اچانک یوں محسوس ہوا جیسے بستر فضا میں معلق ہو رہا ہو۔ پھر وہ اسی تیزی سے نیچے آیا اور میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں بستر سے نیچے آ گئی، اسی وقت صوفیہ کی

گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔

”نہیں..... نہیں میری جان نشاء ڈرو نہیں، یہ طوفان لگ رہا ہے۔“

ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک اور خوفناک جھٹکا لگا اور میں وہاں سے بھی اچھل کر نجانے کہاں جا گری۔ کیمین زیادہ بڑا نہیں تھا اس لئے میرا بدن صوفیہ کے بدن کو چھونے لگا اور میں اس سے چٹ گئی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے سس..... سسٹر.....؟“

”حوصلہ رکھو نشاء حوصلہ رکھو۔“

”کیا جہاز تباہ ہو جائے گا؟“ میری دہشت بھری آواز ابھری۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو، بس معمولی سا طوفان ہے، سسٹر ڈیزل بتا نہیں رہے تھے کہ معمولی سا طوفان ہے۔“

”نہیں سسٹر مجھے تو یوں لگا تھا جیسے وہ ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہے ہوں۔ یہ طوفان یہ طوفان ضرور جہاز کو تباہ کر دے گا، یہ دوبارہ کیوں آ گیا۔“

”نشاء ایسی باتیں مت کرو پلیز۔“ صوفیہ کا چہرہ بھی خوف میں ڈوبا ہوا تھا، کیمین کے بند دروازے کے دوسری طرف انسانی چیخیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں، میں نے سسٹر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”میرا دم گھٹ رہا ہے سسٹر، میری سانس بند ہوتی جا رہی ہے، باہر چلے خدا کے لئے باہر چلے۔“

وہ ایک لمحے تک تو کچھ نہ بولیں پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”جہاز کو جھٹکے لگ رہے ہیں اور پھر یہ اندھیرا، کیسے ہم زخمی نہ ہو جائیں، اچھا شہرہ، سسٹر ڈیزل کے کیمین میں چلتے ہیں، لیکن ذرا مضبوطی سے قدم جما کر چلنا، اوہ میرے خدا، یہ جھٹکے کس قدر خوفناک ہیں آؤ ذرا مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لو۔“

ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کیمین کے دروازے سے باہر نکل آئے۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی انسانی شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ مسافر

شدید افراتفری کا شکار تھے اور اندھیرے میں ایک دوسرے سے الجھتے پھر رہے تھے، ٹکرا ٹکرا کر گر رہے تھے۔ اوپر نیچے بھاگتے پھر رہے تھے، ہم لوگ کیمین کی دیوار سے ٹک گئے۔ وِسکن ڈیزل کے کیمین کا فاصلہ ہی کتنا تھا، کھٹکے کھٹکے دروازے تک پہنچے، لیکن ان کے کیمین کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صوفیہ نے انہیں کئی آوازیں دیں، لیکن ان کی آواز سنائی نہ دی، اس کا مطلب تھا کہ وہ کیمین میں نہیں تھے، انسانوں کی بھاگ دوڑ سے بچنے کے لئے ہم نے انہی کے کیمین میں پناہ لی اور اس کے بعد ہماری وہاں سے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ رات کا بقیہ حصہ ہم نے انکل ڈیزل کے کیمین میں ہی انتظار کرتے ہوئے گزارا، یہ طوفان تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا پھر رفتہ رفتہ سکون چھاتا چلا گیا، لیکن جہاز کے مسافر نجانے کیوں دیوانوں کی طرح بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے اور اس کان پڑے شور میں دل مسلسل الٹا رہا تھا، یہاں تک صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی اور اس ہولناک سیاہ رات کے ٹل جانے کا احساس جاگ اٹھا۔

اب بھاگ دوڑ بھی ختم گئی تھی لیکن انسانی شور اور چیزوں کے گرنے پڑنے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں، میں نے ایک بار پھر صوفیہ کو باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے مجبور کیا اور وہ تیار ہو گئیں۔

ہمارے اعصاب کشیدہ تھے، نجانے کس طرح ہم عرش پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک قیامت برپا تھی۔ مرد عورتیں نوجوان سب یہاں موجود تھے، بعض عورتیں بچوں کو سینے سے لپٹائے رو رہی تھیں۔ مرد خواس باختہ کھڑے ہوئے تھے ان سب کے چہروں پر موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ خلاصی ادھر سے ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ عرش پر ہر چیز ٹوٹی پھوٹی پڑی تھی، کچھ لوگ ریلنگ سے جھانک رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ رات کو اپنے کیمینوں سے باہر نکل کر عرش سے صورت حال کا جائزہ لینے والے بہت سے افراد سمندر میں گر گئے ہیں۔ ڈیگر پر لگی ہوئی موٹر بوٹس بھی سمندر کے اندر جا پڑی ہیں۔ نجانے کس طرح بچتے



بچاتے ہم دونوں بھی اہنی کٹہرے کے پاس پہنچ گئے وہاں سے سمندر کو دیکھا تو چکر آ گیا، انسانی لباس پانی پر تیر رہے تھے، جگہ جگہ پانی کے گولوں میں انسانی لبو کی سرخ لکیریں نظر آرہی تھیں، چھوٹی بڑی آدم خور مچھلیاں انسانی گوشت کھانے میں مصروف تھیں، ان میں شارک مچھلیاں بھی تھیں، میں نے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رخ تبدیل کر لیا سسر صوفیہ نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

”آؤ نشاء چلو، آؤ چلو کیمین میں واپس چلیں۔“  
نجانے سسر ڈیزل کہاں غائب ہو گئے ہیں اور پھر ٹھیک ہی تو ہے وہ کہاں تک ہمارا تحفظ کریں گے۔“  
”آہ..... کتنے لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے۔“  
میرے خدا وہ خونخوار مچھلیاں ان کے جڑے کتنے بھیانک تھے۔ میرے خدا نا تو ان انسانی جسم۔“ میرے بدن پر شدید کیکڑی طاری تھی، اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔

”نشاء تم خیریت سے تو ہو۔“  
اس شناسا آواز کون کر میں چوکی، میں نے گرد گھما کر دیکھا۔ عسکری تھا اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی جس میں خون کا دھبہ نمایاں تھا۔ وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ میرے بجائے سسر صوفیہ نے کہا۔

”انہیں سنبھالنے سسر عسکری، براہ کرم انہیں سنبھالنے، یہ بہت خوفزدہ ہیں۔“

”نہیں نشاء ہولناک طوفان گزر گیا ہے اس نے جو تباہ کاریاں کرنی تھیں وہ کر چکا ہے، اب سمندر پرسکون ہے۔“ عسکری نے کہا۔

”آپ زخمی ہو گئے ہیں سسر عسکری۔“ صوفیہ بولی۔

”ہاں افسوس، میں بچھلی شام جب پہلا طوفانی جھککا آیا تھا ایک چھوٹے سے حادثے کا شکار ہو گیا، مجھے بے ہوشی کے عالم میں جہاز کے اسپتال میں رکھا گیا تھا۔ ورنہ طوفان کے دوران میں نشاء کی خبر لینے ضرور آتا۔“

”اب تو طوفان نہیں آئے گا۔“ میں نے سہمے

ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”سمندر کے ماہر یہی کہتے ہیں، ویسے بھی دیکھئے آسمان پر نیلا نہیں نمایاں ہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ صوفیہ نے کہا۔

”لیکن طوفان نے جہاز کو بے حد نقصان پہنچایا ہے، ٹھیک طور پر معلومات نہیں حاصل ہو سکیں، پتہ چلا ہے کہ جہاز کے انجنوں کو نقصان پہنچا ہے۔“

”اوہو..... کیا جہاز رک گیا ہے؟“ صوفیہ نے چونک کر پوچھا۔

”رات ہی کو اس کے انجن بند ہو گئے تھے، آپ نے محسوس نہیں کیا؟“

”غور نہیں کیا تھا۔“

”جہاز کھلے سمندر میں لنگر انداز کر دیا گیا ہے۔“

”اب کیا ہوگا؟“ میری رندھی ہوئی آواز ابھری۔

”نشاء خود کو سنبھالے رکھئے، آپ دیکھ رہی ہیں کتنے مسافر ہیں جہاز پر، ویسے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے کیمین میں آرام کریں، میں کچھ دیر کے بعد واپس آپ کے پاس آؤں گا، میڈم آپ انہیں لے جائیں، یہاں بڑے دلزدہ مناظر بکھرے پڑے ہیں، مس نشاء ان کی تاب نہ لائیں گی، پلزز جائیے۔“ مس نشاء میں کچھ دیر کے بعد آپ کے کیمین میں آؤں گا۔“ وہ آگے بڑھ گیا، میں اسے دیکھتی رہی، صوفیہ نے کہا۔

”اس کا دم غنیمت ہے ہمیں اس کی ضرورت ہے، آؤ کیمین میں چلیں۔“

”نہیں سسر وہاں جا کر کیا کریں گے، نجانے انکل ڈیزل کہاں گئے؟ کہیں وہ بھی لوگ اپنے اپنے ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے، آہستہ آہستہ دل کو قرار آنے لگا۔ خوف کا مرحلہ گزر چکا تھا۔ ٹھکن ہو گئی دل و دماغ پریشان تھے، کیمین ہی کی طرف چل پڑے، وہاں پہنچے تو عسکری موجود تھا ہسکت، پیڑ، خشک خوراک کے بہت سے ڈبے ڈرائی فروٹس کافی تعداد میں لے آیا تھا اور وہاں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

”ارے یہ کیا ہے؟“ سسر صوفیہ نے اس انبار کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

”ضرورت کی چیزیں ہیں۔“

”کہاں سے لائے؟“

”اسٹور میں گھس گیا تھا خاموشی سے، مجھے اندازہ ہے کہ اب بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی، یہ کولڈ ڈرنک کے ڈبے ہیں، آپ دونوں ان میں سے اشیاء منتخب کر کے ناشتہ کر لیجئے۔“

”کیا مشکلات پیدا ہو جائیں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”جس قدر ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سنبھالنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے جہاز کا عملہ مسافروں کو صحیح طور پر خوراک نہ مہیا کر سکے، آپ لوگ یہ اشیاء محفوظ کر لیجئے۔“

”شکر یہ عسکری، تم نے جس طرح اپنا بیت کا ثبوت دیا ہے ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے، نشاء چلو کچھ کھا لو یہ ضروری ہے۔“

میں خاموش رہی، حالانکہ جو مناظر دیکھ کر آئی تھی اس کے بعد کھانے پینے کا ہوش کسے رہتا ہے، لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ بھوک نہ رہ سکوں گی، البتہ اس وقت میں نے نرمی سے کام لیا اور اس نرمی میں کوئی فریب نہیں تھا، میں نے عسکری کو بھی اپنے ساتھ شریک ہونے کی دوت دی، بسکٹوں کے چند ڈبے کھولے اور انہیں کولڈ ڈرنک کے ساتھ معدے میں اتار لیا۔ صوفیہ نے عسکری کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور پکی ہوئی اشیاء کو احتیاط سے کیمین کے ایک محفوظ حصے میں اسٹور کر دیا۔ عسکری کچھ دیر کے بعد باہر چلا گیا۔ صوفیہ اپنے بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور مجھے دیکھتی رہی۔ میرے ہونٹوں پر پھسکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی، وہ بھی مسکرا دی۔

”کیا سوچ رہی ہیں سسر؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“

”پھر بھی۔“

”بس انہی حالات کے بارے میں.....“

صوفیہ نے جواب دیا۔

”بس کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، آپ یقین کریں کہ میں آپ سے بھی شرمندہ ہوں، اچھی خاصی زندگی گزار رہی تھیں آپ، میرے لئے زندگی کو مصیبت میں ڈال دیا۔“ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور سسر صوفیہ جلدی سے اٹھ کر میرے پاس آ گئیں۔

”میری محبت کی تو ہین مت کرو۔“

”نہیں سسر، یہ سچ ہے میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”پاگل ہو فضول باتیں کر رہی ہو، چلو آؤ باہر چلتے ہیں۔“

”ہمت نہیں پڑ رہی سسر، پتہ نہیں کتنے مسافر موت کا شکار ہو گئے۔“

”چلو پھر لیٹ جاؤ، تھوڑی دیر سونے کی کوشش کرو وقت بھی کٹ جائے گا اور پھر اس کے بعد دیکھیں گے کہ آگے کیا ہوتا ہے، جب انسان کے بس میں حالات نہ رہیں تو پھر غمزدہ اور فکر مند ہونے سے کیا حاصل، بے شمار مسافر ہیں جو سب کا حال سو ہمارا۔“

انہوں نے زبردستی مجھے لٹا دیا، لیکن بھلا نیند کسے آ سکتی تھی، نجانے کیا کیا سوچتی رہی، پھر غنودگی طاری تھی کہ کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی اور میں اٹھ کر بیٹھ گئی، سسر صوفیہ جو سر پکڑے ہوئے بیٹھی تھیں میرے اٹھنے پر چونکیں اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں، تب میں نے دیکھا کہ کچھ اور اشیاء سامنے میز پر رکھی ہوئی ہیں۔

”عسکری لے کر آیا تھا، ویسے میں تم سے ایک بات کہوں، اس سے نرم رویہ ہی رکھو، بعض اوقات دشمن بھی کام آ جاتا ہے۔“

”سمندر کے سینے پر کتنا وقت گزار سکتے ہیں ہم، اس کے بعد تو مرنا ہی ہوگا۔“

”خدا نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہو نشاء، کیا تمہارے خیال میں انسان نہیں ہوں، مجھ سے ایسی



باتیں کر کے مجھے خوفزدہ کر دیتی ہو، ہم ایک دوسرے کو ڈھارس دے کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔“

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ کیمین کا دروازہ کھول کر ولسن ڈیزل اندر آ گئے، چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور سخت پریشان اور افسردہ، کہنے لگے۔

”یہ نہ سمجھنا بچپو کہ میں تمہیں نظر انداز کئے ہوئے ہوں، ہم بہت بڑی بد نصیبی کا شکار ہو گئے ہیں۔ طوفان واقعی ہولناک نہیں تھا لیکن اس کے نقصانات غیر متوقع ہوئے ہیں۔“

”جہاز کے انجن ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اگل۔“  
”انجن تو خیر خراب ہوئے ہی ہیں لیکن اس سے ہولناک بات یہ ہے کہ چاروں بڑے انجینئر ہلاک ہو گئے ہیں۔“

”کیا؟“ صوفیہ کے حلق سے آواز نکلی۔  
”ہاں وہی بڑے انجینئر تھے، کچھ ایسے ہلاک ہوئے کہ اوہ! بائی گاڈ۔“

”تو اب ان انجنوں کو ٹھیک کرنے والا کوئی نہیں ہے۔“ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ لیکن اگل ڈیزل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اب کیا ہوگا اگل؟“  
”خدا جانے۔“

”ہم سب تو سمندر میں قیدی بن گئے۔ کیا ہمیں اسی جہاز پر دم توڑنا ہوگا؟“

”کیپٹن روڈرگس کیا کہتے ہیں؟“  
”روڈرگس۔“ ولسن ڈیزل نے گہری سانس لے کر کہا۔

”روڈرگس بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ طوفان سے بچاؤ کے انتظامات کرتے ہوئے ایک بلند جگہ سے سر کے بل گرا اور ہلاک ہو گیا۔ میرا دوست روڈرگس۔“

”مارشل ایک عظیم الشان مسافر بردار جہاز تھا جس پر لاتعداد انسان سفر کر رہے تھے طوفان کا شکار ہو کر کھلے سمندر میں لاوارث ہو گیا تھا، اس کا کپتان مرچکا تھا، انجن خراب ہو گئے تھے۔ انجینئر بھی زندہ نہیں تھے

اور وہ لوگ کسی نامعلوم مقام پر لوہے کی زنجیروں میں بندھے ہوئے لنگروں کے سہارے پر قاحم تھا، کوئی اور طوفان سے با آسانی ان لنگروں کی قید سے آزاد کر کے موجوں کے دوش پر بے لگام کر سکتا تھا، لیکن ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی ہوا اس وقت سے جب سے میں آشنائی کے دشت میں داخل ہوئی تھی، پراسرار اور ناقابل یقین واقعات نے اس طرح حملے کئے تھے کہ عقل سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا، سوچوں کی حد ختم ہو گئی تھی۔ میں اخبار پڑھتی تھی۔ ہر طرح کے حادثے کی خبریں ہوا کرتی تھیں، لیکن ایسے کسی واقعے کے بارے میں میں نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ ولسن ڈیزل نے کہا۔

”روڈرگس کی موت نے اس وقت ایک شدید ذہنی بحران سے دو چار کر دیا ہے، بے شمار مرد و عورتیں بچے موت کے چال میں گرفتار ہو گئے ہیں، ابھی سب زندہ ہیں لیکن کیفیت ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ ان کی موت یقینی ہے۔“

”کیا جہاز کے تمام مسافروں کو کپتان کی موت کا علم ہو چکا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں، صرف چند لوگ جانتے ہیں جن میں سینڈ انجینئر اور ریڈی افسران شامل ہیں۔ روڈرگس کی لاش کو اس کے کیمین میں پوشیدہ کر دیا گیا ہے۔“

”مم..... مگر یہ تو چل ہی جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”ظاہر ہے، لیکن یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ اس سے مسافر خوفزدہ ہو جائیں گے اور ان کا نجانے کیا رد عمل ہو۔“

”چھپانا بھی تو مناسب نہیں ہوگا۔“  
”ہاں کتنی دیر چھپایا جاسکتا ہے؟“ ولسن ڈیزل نے متاثر کن لہجے میں کہا۔

”سٹر صوفیہ بالکل خاموش تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور ان کے چہرے پر موت جیسی زردی طاری تھی، ولسن ڈیزل نے کہا۔

”میں بہت زیادہ مذہبی انسان نہیں ہوں، لیکن

انتہا ضرور جانتا ہوں کہ جب انسان بے بسی کی آخری منزل میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر معجزے ضرور ظہور پذیر ہوتے ہیں، ہر انسان کی موت کا طریقہ تم ہوتا ہے، ممکن ہے اس جہاز میں کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جن کی تقدیر میں سمندری موت نہ ہو، قدرت ان کے لئے کوئی سامان ضرور کرے گی اور کون جانے کس کے ویسے سے زندگی مل جائے اس لئے میری رائے ہے کہ مایوس نہ ہونا بلکہ تقدیر کے لکھے کا انتظار کرنا، میں باہر جا رہا ہوں، بہتر ہے کہ تم لوگ بھی کیمین میں قید نہ رہو، آرام سے گھومو پھرو، اس وقت سب اپنی اپنی مشکل کا شکار ہیں، کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا اوکے۔“ یہ کہہ کر ولسن ڈیزل باہر چلے گئے، میں نے ایک بار پھر شرمندہ نگاہوں سے سٹر صوفیہ کو دیکھا اور پکارا۔

”سٹر صوفیہ۔“

”آ..... آں..... ہاں..... بولو۔“ وہ جیسے چونک سی پڑی۔

”میں کیا بولوں آپ سے؟“

”انہوں نے جلدی سے آنکھیں خشک کیں اور زبردستی مسکرا کر بولیں۔“ پائل ہو گئی ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، دیکھو انسانی ذہن کتنا پراسرار ہے، حالانکہ ولسن ڈیزل نے روڈرگس کو بلی کی نحوست کی کہانی صرف اس لئے سنائی تھی کہ وہ روشاق کے خلاف ہو جائے اور اس بلی کو ہلاک کرنے پر آمادہ ہو جائے لیکن تمہیں اس کا خواب یاد ہے۔“

”ہاں۔“

”مجھے اس کی موت کا بے حد افسوس ہے، خیر نجانے کون کون مر گیا، چھوڑو اس تیرے کو آدھا ہر چلے، یہاں رہ کر تو بس یہی احساسات ہمیں خوفزدہ کرتے رہیں گے۔“

”چلے۔“ میں نے کہا۔

”حلیہ تو ٹھیک کر لو، عجیب ہو رہی ہو۔“ سٹر صوفیہ نے خود میرے بال سنوارے، اپنا حلیہ درست کیا اور ہم کیمین سے باہر نکل آئے، باہر کا منظر وہی تھا، مرد

عورتیں بچے بدحواس ہو رہے تھے۔ جہاز کے عملے کے لوگوں کو ہر جگہ گھیر لیا تھا، لوگ ان سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے، جگہ جگہ لوگ جمع تھے، رونے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں، ایک جگہ بہت سے نوجوان کھڑے ہوئے شور مچا رہے تھے۔

”وہ گوشہ خالی ہے سٹر وہاں چلیں۔“ میں نے عرشے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کر کے کہا اور سٹر نے مجھ دیکھ کر کہا۔

”وہاں سے سمندر نظر آئے گا۔“

”تو پھر۔“

”مجھ سے انسانی زندگی کا یہ انجام نہیں دیکھا جاتا۔“ سٹر صوفیہ نے کہا۔

”آئیے سٹر، یہ نہیں آئندہ نجانے کیا کیا دیکھنا پڑے، آئیے۔“ میں نے کہا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اس خالی حصے کی جانب چل پڑی، واقعی سمندر اتنا ہی ہولناک ہو رہا تھا کہ اسے دیکھنا بہت مشکل کام تھا۔

خونخوار مچھلیاں بھیا یک جہڑے کھولے بھوکے نظروں سے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ نوجوان مسلسل شور مچا رہے تھے، کچھ دیر کے بعد لاؤڈ اسپیکر پر آواز ابھری۔

”براہ کرم خاموش ہو جائیے، براہ کرم خاموش ہو جائیے۔“ نوجوان خاموش ہو گئے، آواز پھر ابھری۔

”میں سینڈ افسر بول رہا ہوں، طوفانی توڑ پھوڑ میں کپتان روڈرگس زخمی ہو گئے ہیں آپ لوگوں کو بے شک شدید مشکلات سے گزرنا پڑ رہا ہے، لیکن اس مشکل وقت میں جہاز کے عملے کو آپ کا تعاون درکار ہے، ہمارا سب سے پہلا مسئلہ خوراک ہے، عملے کے افراد کچن میں پہنچ گئے، چند کھوں میں آپ کو کھانا فراہم کر دیا جائے گا، ہم سب کو زندگی بچانے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہوگا۔ براہ کرم عدم تعاون سے گریز کیجئے۔“

لاؤڈ اسپیکر خاموش ہو گیا۔

”انہوں نے کپتان کی موت کا اعلان نہیں کیا۔“ سٹر صوفیہ نے کہا۔

”مصلحت۔“ میں نے جواب دیا۔ ہم دونوں



وہیں کھڑے رہے، ہمارے سامنے ہی لوگوں کو کھانا پیش کیا گیا۔

بھوک زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے، لوگ پریشان تھے لیکن بھوک بھی تھی، کافی حد تک امن قائم ہو گیا، مارشل پرسکون سمندر میں اپنا وقار برقرار رکھنے میں مصروف تھا، شام ہو گئی اور سمندر پر اندھیرے اترنے لگے۔ رات کے کھانے کے بعد مسافروں سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی آرام گاہوں میں چلے جائیں، عملے کے لوگ مارشل کو قابل سفر بنانے میں مصروف ہیں۔ خستہ حال مسافروں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ہم لوگ بھی اپنے کمپن میں آگئے، کوئی دس بجے ولسن ڈیزل نے کمپن کے دروازے پر دستک دی اور اندر آگئے، انہوں نے ہمیں دیکھ کر کہا۔

”تم لوگ پہلے کی نسبت پرسکون ہو۔“  
”کر بھی کیا سکتے ہیں مسٹر ڈیزل۔“ صوفیہ

بولی۔

”حوصلہ قائم رکھو، تماشائی بن جاؤ، یوں سمجھ لو کہ تم ایک سنسنی خیز فلم دیکھ رہی ہو۔“  
”اور پھر خود بھی اس فلم کا ایک کردار بن جائیں۔“

”ہاں..... جب موت تمہارے قریب آئے تو اسے بھی دلچسپی سے دیکھو اور مر جاؤ۔“ ولسن ڈیزل نے کسی قدر بے رحمی سے کہا ان کے لہجے میں کسی قدر ناخوشگواری تھی جسے ہم دونوں نے محسوس کیا۔ پھر میں نے کہا۔

”یہ لوگ کپتان کی موت کو چھپا رہے ہیں۔“  
”ضروری ہے ورنہ لوگ دہشت زدہ ہو جائیں گے۔ ابھی کچھ اور وقت اس کی موت کو چھپائے رکھنا مناسب ہوگا۔“  
”لیکن فائدہ اٹکل؟“

”کسی قدر سکون سے اس مشکل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔“ ولسن ڈیزل نے کہا پھر مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

”میں عموماً تمہارے سامنے دل دہلا دیتے والے انکشافات کرتا ہوں، ایک اور انکشاف ہے تمہارے لئے، سننا پسند کرو گی۔“

”کیا؟“ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی، صوفیہ بھی تھکی نظر آ رہی تھیں اور ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے۔

”میں جہاز کے مال خانے میں اترتا تھا اس جگہ کپتان کے کہنے کے مطابق وہ تابوت تھے جنہیں البرونوس نے بک کرایا تھا، تابوت وہیں تھے لیکن.....“  
”لیکن کیا؟“

”تابوتوں کے پاس البرونوس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ نیلی لاش، اتنی نیلی جیسے نیلی روشنائی ہوئی ہے، ہاتھ پاؤں چہرہ سب ایک جیسا، وہ کہیں سے زخمی نہیں تھا لیکن مر چکا تھا اور اس سے دونٹ کے فاصلے پر کپڑے کی موی بیٹیوں کے دو ڈھیر پڑے ہوئے تھے، الگ الگ بیٹیوں کے انبار۔“

صوفیہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں انہوں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اور وہ تابوت۔“

”تابوت اپنی جگہ پر ہیں۔“  
”کیا وہ کھلے ہوئے تھے؟“

”ہاں دونوں کے ڈھکن کھلے ہوئے تھے، ان میں تالے بھی پڑے ہوئے تھے کیونکہ ان کے نزدیک کھلے ہوئے تالے نظر آرہے تھے۔“

”انکل ہم آپ کو آپ کو بتا چکے ہیں کہ.....“  
”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”کیا آپ کے خیال میں؟“  
”نہیں، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“  
”انکل میں ان تابوتوں کو پہچانتی ہوں میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا۔  
”نہیں بے بی سوری اس وقت ممکن نہیں۔“

”کیوں انکل؟“  
”مسافروں کو ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے اس وقت کوئی ہمیں راہداری سے باہر نہیں جانے

دے گا۔“

”لیکن انکل۔“

”ستائیس مسافروں کی لاشیں ٹھکانے لگانی ہیں جہاز کے عملے کو، اس کے علاوہ روڈرگس کی لاش بھی، ظاہر ہے ان جموں کو چھپایا گیا تھا نیلیں اور یہ منظر ہر لحاظ سے ہولناک ہوگا، مگر اس کے سوا اور کچھ ممکن بھی تو نہیں ہے۔“

سسر صوفیہ نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے، اس کا بدن ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ میں نے کہا۔  
”کیا البرونوس کی لاش بھی عملے کے علم میں آگئی ہے؟“

”ہاں سیکنڈ آفیسر کو پتہ چل چکا ہے۔“  
”لیکن اس کی موت کا کچھ پتہ چلا کیسے ہوئی؟“  
”اس وقت کوئی اس کے بارے میں سوچنے کو تیار نہیں ہے۔“ میں خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر کے بعد ولسن ڈیزل چلے گئے، میں نے کہا۔

”کیا یہ وہی تابوت ہو سکتے ہیں سسر صوفیہ، وہ بھی دو تھے اور ان میں تالے پڑے ہوئے تھے اور بیٹیوں کے ڈھیر، میرا بڑا دل چاہ رہا ہے میں دیکھنا چاہوں۔“

صوفیہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی تھی، لیکن میرے ذہن میں نجائے کیا کیا چل رہا تھا۔ کارچوک کی پہاڑیوں کے اندر عمارتوں میں وہ تابوت بھی یاد آ رہا تھا جس میں خود میری اپنی لاش پڑی ہوئی تھی اور پھر وہ دو تابوت جنہیں دیکھنے کے لئے میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری صبح بھی جہاز کے مسافروں کے شور سے ہی آنکھ کھلی تھی، صوفیہ بھی جاگ گئی تھی، شور کافی بلند تھا۔

”شاید کوئی نئی بات ہوگئی۔“  
”شاید۔“  
”کیا ہو سکتا ہے جہاز تو پرسکون ہے۔“  
”باہر چلیں۔“ سسر صوفیہ نے پوچھا۔

”چلئے یہاں بھی کیا کریں گے اور اگر موقع ملا تو ہم وہ تابوت بھی دیکھ لیں گے۔“

”منہ ہاتھ دھو، میری رائے ہے کہ تھوڑا سا کھا پی بھی لیا جائے، زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔“ میں نے گردن ہلا دی۔ ہاتھ روم سے باہر نکلی تو عسکری پر نگاہ پڑی سامنے ہی کافی کے برتن بچے ہوئے تھے، صوفیہ نے ناشتہ لگا لیا۔

”ہیلو نشاء۔“ وہ بولا۔

”ہیلو کیسے ہو؟“

”آؤ ناشتہ کرلو۔“ اس نے کہا اور میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”کافی کہاں سے ہاتھ لگ گئی؟“  
”خود بنا کر لایا ہوں جانے کیسی بنی ہے۔“ وہ پچھلی میسرکھٹ سے بولا۔

”سوری عسکری تمہیں ہماری وجہ سے آؤ ناشتہ کرو یہ باہر شور کیوں ہو رہا ہے کوئی خاص وجہ ہے، کیا کمپین روڈرگس کی موت کا اعلان کر دیا گیا ہے؟“

”اس سے بھی زیادہ سنگین صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔“ عسکری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”کیا؟“ ہم دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔  
”رات کو جہاز پر مسافروں کے لئے کرفیو لگا دیا گیا تھا، مسافروں کو کمپینوں میں بند کر کے جہاز کا سیکنڈ آفیسر پورے عملے کے ساتھ کئی لائف بوٹس لے کر فرار ہو گیا۔“

”اوہ مائی گاڈ۔“ صوفیہ کے منہ سے نکلا۔ ”گویا اب جہاز سمندر کے پتھوں بچے یا رمد دگا رہے۔“

”چند خلاصی جو کسی خاص وجہ سے فرار نہیں ہو سکے لوگوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں انہوں نے انہیں مار مار کر ادھر مارا کر دیا ہے۔“ عسکری نے بتایا اور ہم پر مردنی چھا گئی۔ صوفیہ بولی۔ ”ظاہر ہے وہ لوگ مارشل سے مایوس ہو گئے تھے، مسافروں کا دباؤ بھی انہیں ہی برداشت کرنا پڑ رہا تھا اس لئے وہ جہاز چھوڑ کر فرار ہو گئے۔“ عسکری نے جواب نہیں دیا اور خاموشی سے



گھبراہٹ ہونے لگی تو میں نے کہا۔

”جلے سسر صوفیہ باہر چلتے ہیں۔“

عسکری بھی ہمارے عرشے پر آ گیا تھا۔ اس وقت عرشے پر قیامت برپا تھی، عورتیں چیخ کر رہ رہی تھیں ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا ہم سبے ہوئے ایک گوشے کھڑے ہو گئے، اچانک ہی جہاز کے اسپیکر پر تھرا تھرا آواز پھر ایک آواز ابھری۔

”براہ کرم خاموش ہو جائیے، خاموشی اختیار کیجئے براہ کرم خاموش ہو جائیے، میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، براہ کرم خاموش ہو کر میری بات سن لیجئے۔“

”بہت بار یہ درخواست سن گئی اس کے بعد لوگ خاموش ہو گئے۔ بولنے والے نے کہا۔

”میں بھی آپ ہی کی طرح ایک عمر رسیدہ مسافر ہوں، برٹش فوج کا ریٹائرڈ میجر ہوں، میرا نام پیٹرک واسکوڈی ہے، آپ مجھے واسکوڈی کے نام سے مخاطب کر سکتے ہیں زندگی میں لاتعداد حادثات سے گزر چکا ہوں۔ خدا کے لئے جو کچھ میں کہوں غور سے سنئے۔ مارشل انوکھے حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔

اس کا کیپٹن روڈرکس مر چکا ہے اس کی لاش اس کے کیمین میں موجود ہے جہاز کے وہ انجینئر بھی مر چکے ہیں جو اس کے تباہ شدہ انجنوں کو درست کر سکتے تھے اور اس کے بعد جہاز کے دوسرے افسر یہ محسوس کر کے کہ جہاز کو سنبھالنا اب ان کے بس کی بات نہیں ہے بحرمانہ طور پر اپنی ذمہ داریوں سے روگردانی کرتے ہوئے

لائف بوٹس لے کر فرار ہو گئے ہیں، گویا اب اس وقت اس جہاز کا سرپرست کوئی نہیں ہے، جو بیچارے خلاصی باقی رہ گئے ہیں ان کے دل میں ایک ہی جذبہ تھا کہ وہ مسافروں کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے بلکہ ان کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے، لیکن آپ لوگوں نے جوش جذبات میں ان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ مارشل کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، ہمیں ان لحاظ میں ان کی اشد ضرورت تھی ہم نے انہیں ان کے نیک جذباتوں کے صلے میں ذمہ دیئے ہیں، دوستو! بعض

اوقات زندگی اس طرح موت کے چنگل میں پھنس جاتی ہے، اب اگر ہم جی چھوڑ کر ایک دوسرے کو نوچنا اور بھنبھوڑنا شروع کر دیں تو ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ہم آخری سانس تک زندگی کی جدوجہد کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے نظم و ضبط ضروری ہے۔ آپ لوگ بھجھکاری سے کام لیجئے، اتنی افراتفری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے خدا سے زندگی مانگئے اور اپنے طور پر جدوجہد کیجئے، اگر آپ لوگ مجھ سے اتفاق کریں تو میں آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھے ہاتھ اٹھا کر اجازت دیں اگر آپ لوگ اجازت دیں گے تو میں آگے بات کروں گا ورنہ خاموش ہو جاؤں گا۔“

تقریباً تمام ہاتھ بلند ہو گئے تھے۔ تب اسپیکر سے آواز ابھری۔ ”بے حد شکر ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ نو جوان ٹولیاں بنا کر مختلف ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ سب سے پہلے ہمیں جہاز پر خوراک کے ذخائر کا جائزہ لینا ہے۔ اس کی ذمہ داری نو جوانوں کی ایک ٹولی کو سنبھالنی ہوگی۔ کچھ نو جوان چکن کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ کچھ سے جہاز کی صفائی کا کام لیں گے اور آپ لوگوں میں کچھ ڈاکٹر بھی ہوں گے جہاز پر ڈپنٹری موجود ہے وہ اپنی ڈیوٹی سنبھالیں گے۔ ہم لوگوں میں اگر کچھ انجینئر ہوں تو وہ انجن روم میں اپنے کام سرانجام دیں۔ اگر تقدیر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگی تو یقیناً ہم زندگی تلاش کر لیں گے۔ آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔ آپ مجھے اپنی رائے دیں۔“

جواب میں ہر طرف سے تائیدی شورا ابھرنے لگی۔ ”اب میں کچھ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہر شعبہ سے متعلق لوگوں کو بلا کر ان سے ان کی تجاویز لیں اور ان کی خدمات کا تعین کریں۔ میں خود بھی آپ کے درمیان آتا ہوں۔ وہ ایک شاندار شخصیت کا مالک فوجی تھا۔ اسے بہت احترام دیا گیا۔ ایک گوشے میں میز کرسیاں لگائی گئیں جنہیں ایک پ سے اٹھایا گیا

تھا۔ ایک بہترین ماحول بن گیا تھا۔ صوفیہ نے کہا۔

”جو کچھ ہو رہا ہے ہم اسے زندگی تو نہیں کہہ سکتے۔ کم بخت جہاز کے عملے نے کیسی غدار کی ہے۔“ میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کام شروع ہو گیا۔ میجر کی ہدایت کے مطابق ٹولیاں بنا شروع ہو گئیں اور لوگ اپنے اپنے بارے میں بتانے لگے۔ گیارہ ڈاکٹر تھے جن میں پانچ خواتین تھیں یہ سب مغربی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سی خواتین نے خود کو زبوں کی حیثیت سے پیش کر دیا تھا۔ جہاز پر بے شمار بچن تھے جن میں خاص اشیاء تھیں اس طرح سمندر کی آبادی میں جہا

زایک انسانی جزیرہ بن گیا تھا۔ جہاں سب ایک دوسرے کے دھردتے تھے۔ مخلص تھے۔ ماحول بے حد خوب صورت ہو گیا تھا۔ ہر طرف سے تجاویز موصول ہو رہی تھیں۔ ایس او ایس سنگلنگ کا بندوبست کیا گیا تاکہ اگر کوئی جہاز کے قریب سے گزرے تو مدد حاصل ہو سکے۔ یہ تجویز پوری سنجیدگی سے سنی جا رہی تھی ایک شخص جو بڑی اچھی شخصیت کا مالک تھا اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

”میرا نام ساون اوگلے ہے۔ آپ لوگوں سے اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اور ایک بے حد کام کی بات بتانا چاہتا ہوں۔“

یہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے تب اس نے کہا۔ ”میرا تعلق فرانسیسی پولیس سے ہے۔ اور سی ایٹ ڈپارٹمنٹ سے میرا تعلق ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ممکن ہے آپ لوگوں نے کبھی اوتارے گارساں کا نام سنا ہو جو کئی ملکوں کے سمندروں میں ایک ہیبت ناک غفریت کی حیثیت رکھتا تھا وہ نہ صرف بحری قذاق تھا بلکہ ایک دہشت گرد کی حیثیت سے بھی مشہور تھا۔ بے شمار انسانوں کا قاتل۔ کوئی چودہ سال تک اس نے بحری قذاق کی۔ لاتعداد جہاز لوٹے۔ الجزائر میں اس نے خوفناک دہشت گردی کی اور ایک سو ساٹھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حکومت الجزائر نے فرانس کے اشتراک سے پرتگال سے درخواست کی تھی کہ اس

کو گرفتار کیا جائے۔ یہ ذمہ داری مجھے سونپی گئی اور میں نے اس کے گرد جال بچھا کر اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ تو دوسرے افراد جو اس کے خاص ساتھی تھے پکڑے گئے اور یہ سارے کے سارے بہترین جہاز راں، اور بہترین شپ انجینئر ہیں کیونکہ ساری زندگی سمندروں سے بھٹکتے رہے ہیں۔ خود کارساں انتہائی شاندار کپتان اور انجینئر ہے۔

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جناب اوگلے۔“ ایک شخص نے پوچھا۔

”ویسے بتا رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے کارساں اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا ہے اور اب میں اسے حکومت الجزائر کے حوالے کرنے کے لئے جا رہا تھا۔“

”اس جہاز سے۔“

”ہاں۔“

”گویا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ.....“

”ہاں۔ وہ سب اس جہاز پر قیدیوں کی حیثیت سے لے جائے جا رہے تھے۔“

”وہ کہاں ہیں۔“

”جہاز کے قید خانے میں بند ہیں۔ اور اس وقت ہم ان سے جہاز کی درنگی کا کام لے سکتے ہیں۔“

یہ اتنا پرکشش اور انوکھا انکشاف تھا جس نے سمندر کے قیدیوں کو خوشی سے دیوانہ کر دیا۔ ہر شخص اپنی زبان بولنے لگا۔ سارن اوگلے سے فرمائش کی جانے لگی کہ فوراً اس کام کو سرانجام دے۔ انکشاف تو زندگی کی روشنی دکھاتا ہے۔

”ہم انہیں پیشکش کریں گے کہ اگر وہ خود بھی زندگی چاہتے ہیں تو یہ کام سرانجام دیں ورنہ ہمارے ساتھ انہیں بھی مرنا ہوگا۔“

سارن اوگلے ہیرو بن گیا تھا۔ اس کی شخصیت بھی شاندار تھی اور وہ بے حد سخت گیر انسان معلوم تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ”یہ زندگی کی طرف ایک قدم ہے لیکن میں یہ بھی بتادینا چاہتا ہوں کہ کارساں شیطان زادہ





## قاتل

شائستہ سحر - راوی پٹنڈی

سلاخوں میں قید انسان لفظ "پاگل" سنتے ہی اچانک بیپھر گیا اس کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں اس کی تیوری پر بل پڑ گئے اور پھر وہ خوفناک انداز سے اپنے سامنے بیٹھے نوجوان پر جھپٹا لیکن پھر اچانک.....

دُوروں پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے والے اکثر زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ سبق آموز کہانی

"یہ خبی انسان ہر وقت یہی جملے دہراتا رہتا ہے۔" ڈاکٹر سیاد نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک پستہ قدرتی جوان سے کہا۔  
وہ پستہ قدرتی شخص ایک اخباری رپورٹر تھا۔  
ڈاکٹر سیاد اس خبی شخص کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی نرم لہجے میں بولے۔ "عمر یہ شیراز صاحب ہیں روزنامہ سچ کے کرائم رپورٹر، تمہارے ٹیکس پر رپورٹ تیار سے بڑبڑا رہا تھا۔"

"مجھے" اس چیز کا دکھ نہیں کہ میں ایک قاتل ہوں، میں نے کبھی بڑی کے وحشیانہ وار کے لیک شخص کو بے دردی سے قتل کیا ہے اور نہ ہی اس چیز کا افسوس ہے کہ قتل ہونے والا شخص میرا گام بھائی تھا، دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں نے اپنی ہوس کے چکر میں سب کچھ داؤ پر لگا دیا..... اپنا سب کچھ۔" وہ گھٹنوں میں سر دیئے روانی سے بڑبڑا رہا تھا۔

"خود کو پرسکون رکھیں۔ ہو سکتا ہے تقدیر ہمیں زندگی دیدے۔"  
"جی۔"  
"آپ اب تک ناراض ہیں۔"  
"ناراض؟"

"جی۔" اس کے اداس لہجے میں کہا۔  
"براہ کرم مجھ سے یہ سوال نہ کریں جس کے جواب سے آپ کی دل آزاری نہ ہو۔ ان لحاظات میں کسی ذاتی احساس کو نمایاں کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ آپ نے خاص طور سے جہاز پر جس طرح ہمارا ساتھ دیا ہے۔ اس کا شکریہ نہیں ادا کیا جاسکتا۔"  
عسکری ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔  
دوسری طرف فرانسیسی ایجنسی کے افراد اپنے افسر کی سرکردگی میں قیدیوں کو اوپر لانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اسی وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ مجھے وہ پراسرار شخص البر ونوس یاد آیا جو دو تابوت لے کر الجزار جا رہا تھا۔ یہ تابوت بھی تو جہاز کے نچلے حصے میں تھے۔ مجھے اس پراسرار گھر کے وہ تابوت یاد تھے جن سے میری زندگی کے گہرے راز وابستہ تھے۔

بے اختیار امیر اداں چاہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں ان تابوتوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں۔ میں نے ایک لمحہ سوچا پھر عسکری سے بولی۔  
"کیا تم ایک کام کر سکتے ہو۔"

"دل سے تیار۔"  
"تمہیں البر ونوس کے بارے میں معلوم ہے جو پراسرار طور پر مر چکا ہے اور جو دو تابوت لے کر جا رہا تھا۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔"  
"میں وہ تابوت دیکھنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا اور عسکری حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔  
سسر صوفیہ بھی میری اس انوکھی فرمائش پر دنگ رہ گئی۔  
(جاری ہے)

ہے۔ یہ لوگ بدترین قاتل، خطرناک دہشت گرد اور خطرناک شیطان صفت ہیں۔ ہم انہیں آزادی نہیں دے سکتے بلکہ ان پر تشدد کر کے ہی ہم ان سے کام لیں گے۔ انہیں آزادی دینا پورے مسافروں کے لئے خطرناک ہوگا۔

دوسری حکومت میں بھی وہ ہمارے لئے خطرناک ہوں گے۔

اس کے لئے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔  
"ٹھیک ہے یہ حق آپ کو دیا جاسکتا ہے۔ آپ ان سے کب بات کریں گے؟"

"فوراً۔" میرے ساتھ میری ایجنسی کے بیس افراد موجود ہیں جو انہیں کنٹرول کر رہے ہیں۔ میں انہیں کے ذریعے انہیں قابو کروں گا۔

"مجھے اعتراض ہے سر۔" ایک شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ "میں برٹش عدلیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس وقت جب کہ جہاز مصیبت میں گھرا ہوا ہے اور یہ شخص موت کا انتظار کر رہا ہے دنیا کے کسی ملک کا قانون کی کوتراست میں رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اس وقت ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "میں بھی پیرسٹر ہوں۔ بیشک ان لحاظات میں یہ شخص آزاد ہے۔ لیکن ان حالات کا اپنا قانون ہے اور خطرناک لوگوں کو قانون کا تحفظ دے کر باقی لوگوں کو عذاب میں گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔"

"گویا آپ چاہتے ہیں۔"  
"ہاں۔ ان سے کام لینے کے لئے ان پر تشدد غیر مناسب ہوگا۔"  
"بالکل۔"

"آپ کے فیصلے پر مجھے اعتراض نہیں۔"  
"یہ بحث جاری تھی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے قریب آ کھڑا ہوا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ عسکری تھا۔ "آپ ٹھیک ہیں نشاء۔"  
"ہاں شکریہ۔"



کرنا چاہتے ہیں۔“

عمر نے یکدم اپنا سر اوپر اٹھایا اس کی کئی راتوں سے جاگی ہوئی آنکھوں میں خوفناک قسم کی جنونیت اور سفاکی تھی، وہ شعلہ بار نظروں سے اس اخباری رپورٹر کو گھورتے ہوئے ناگوار سی بولا۔

”اس گدھے کو اب خیال آیا ہے رپورٹ لکھنے کا، میں پچھلے پانچ سالوں سے تمہارے اس زندان نما اسپتال میں مڑ رہا ہوں۔“

وہ اخباری رپورٹر عمر کے منہ سے اپنے لئے ”گدھے“ کا لفظ سن کر بھڑک اٹھا۔ ”یہ شخص تو انتہائی بدتمیز ہے۔“

ڈاکٹر سجاد قحطل سے بولے۔ ”سوری مسٹر شیراز! ہمارے یہ مریض اپنے حواسوں میں کب ہوتے ہیں، یہ ہر قسم کی تیز کوفراموش کر بیٹھتے ہیں۔“

اخباری رپورٹر جواباً بولا۔ ”میں جانتا ہوں یہ پاگل ہوتے ہیں۔“

رپورٹر کے منہ سے عمر نے اپنے لئے ”پاگل“ کا لفظ سن کر پھر گیا اور غصے سے اس پر جھپٹ پڑا۔ ”تو نے مجھے پاگل کہا..... میں پاگل نظر آتا ہوں تجھے۔“ عمر اس کا گریبان نوچتے ہوئے غرایا۔ ”پاگل تو تم لوگوں نے مجھے بنایا ہے..... میں پوچھتا ہوں پہلے کہاں تھے تم جب میں یہاں زبردستی قید کیا گیا تھا۔ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں مجھے جانے دو مگر میری بات کسی نے نہ سنی اب جب میں ختم ہو گیا ہوں تو تم اب میرا کیس لوگوں کے سامنے لانے کے لئے آئے ہو، اب کیا فائدہ؟ سب لے اڑے وہ سب کچھ۔“

وہ اخباری رپورٹر کا گریبان جھنجھوڑ کر چیخ رہا تھا، قریب تھا کہ وہ اس کا گلا ہی دبا دیتا، ڈاکٹر سجاد نے اپنی مدد کے لئے اسپتال کے دیگر عملے کو بلالیا۔ بڑی مشکل سے اس اخباری رپورٹر کو عمر کے ہاتھوں کی گرفت سے نکالا گیا۔ تین چار بندے عمر کو گھسیٹتے ہوئے وارڈ میں لے گئے۔ عمر بدستور چیخ دیا کر رہا تھا۔

ڈاکٹر سجاد شیراز کو اپنے روم میں لے آئے۔ شیراز

اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے میرے منہ سے کچھ ایسا نکل گیا جس نے اس جنونی کو اشتعال دلا دیا۔“

ڈاکٹر سجاد شرمندگی سے بولے۔ ”میں بہت معذرت چاہتا ہوں، بہت کم ایسا ہوتا ہے جو عمر اس قسم کے رد عمل کا اظہار کرے زیادہ تر بالکل پرسکون ہی رہتا ہے۔“ شیراز ایک خیال کے تحت بولا۔ ”مجھے یہ شخص پاگل نہیں لگتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شدید قسم کے صدمہ کی وجہ سے اس پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔“

ڈاکٹر سجاد جیسے لہجے میں بولے۔ ”اگر یہ لڑکا پاگل نہ ہوتا تو یوں آپ پر حملہ کرتا؟ دراصل اس لڑکے کو جو بھی پاگل کہتا ہے اس پر وحشیانہ انداز سے جھپٹ پڑتا ہے۔“ شیراز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”قمر کا مڈر کیس کافی مشہور مڈر کیس ہے مگر اس کے اصل حقائق آج بھی لوگوں سے پوشیدہ ہیں۔“

”مجھے بڑا تجسس ہے میں اس کیس کے اصل حقائق کو جان سکوں اب جبکہ میں نے ایک اخبار کو کرائم رپورٹر کی حیثیت سے جوائن کر لیایا ہے تو سب سے پہلے اپنے اس تجسس کو ختم کرنے آیا ہوں۔“

ڈاکٹر سجاد فوراً بولے۔ ”شیراز صاحب عمر کو اس اسپتال میں آئے ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں، عدالت کی طرف سے یہ مجرم ثابت ہو چکا ہے تاہم یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ عمر ایک جنونی قسم کا خطرناک ذہنی مریض ہے۔ اگر اس وقت اس کے لئے کوئی آگے بڑھتا تو شاید اصل حقائق سامنے آجی جاتے مگر اب میرا نہیں خیال کہ کچھ فائدہ ہوگا۔“

شیراز سنجیدگی سے بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب عمر نے ایک قتل کیا ہے یہ ثابت بھی ہو چکا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ عمر ایک قاتل ہے مگر اس نے قتل کس وجہ سے کیا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جبکہ عمر اور اس کے مقتول بھائی قمر کی کوئی خاص جانشیداد بھی نہیں تھی۔ دونوں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔“

ڈاکٹر سجاد نے بے ساختہ کیا۔ ”میرا نہیں خیال کہ

ایک ذہنی مریض کو قتل کرنے کے لئے کوئی وجہ درکار ہوتی ہے، دورے کی حالت میں وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ شیراز نے تائید میں سر ہلایا۔ ”بالکل ٹھیک کہا آپ نے اب ذرا یہ بھی بتائیے ان پانچ سالوں میں کسی اور نے بھی اس کیس کو کریدنے کی کوشش کی؟“

ڈاکٹر سجاد ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ”نہیں کسی نے بھی کوشش نہیں کی جب میرا ٹرانسفر اس اسپتال میں ہوا تھا تب عمر کو اس اسپتال میں لگ جھگ دو سال ہو چکے تھے اس سے پہلے کسی نے کوشش کی ہوتو الگ بات ہے کم از کم میری موجودگی میں تو آپ پہلے شخص ہیں جو اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں، اور ایک بات میں ضروری سمجھتا ہوں آپ کو بتانا، میں جب اس اسپتال میں آیا تو یہاں کے عملے ہی نے مجھے بتایا کہ مجھ سے پہلے جو ڈاکٹر یہاں تعینات تھا وہ عمر کو کبھی کے جھگے اور دیگر تکلیف دہ طریقوں سے گزارتا رہتا تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ عمر حد سے زیادہ جنونی فطرت کا تھا اور مجھے بھی عمر سے محتاط رہنے کا کہا گیا، جب میں عمر سے ملا تو میں نے اسے اکثر ایک ہی بات دہراتے ہوئے سنا ہے جو آپ بھی سن چکے ہیں اگر عمر کو پاگل کہا جائے تب اس پر بیجان طاری ہو جاتا ہے اور شدید بیجانی کیفیت میں یہ چیخا چلاتا ہے حتیٰ کہ قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کا عملی مظاہرہ آپ اپنے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔“

شیراز ایک نکتہ بولا۔ ”جی ہاں! دیکھ بھی چکا ہوں اور سمجھ بھی چکا ہوں، آپ نے غور نہیں کیا، عمر کے لہجے میں شکوہ تھا کہ میں دیر سے آیا ہوں یعنی وہ کسی ایسے بندے کا انتظار کر رہا تھا جو اس کی حالت زار کو لوگوں کے سامنے لائے۔“

ڈاکٹر سجاد ایک گہرا سانس لے کر بولے۔ ”شیراز صاحب آپ بہت عجیب انسان ہیں، وہ بندہ آپ پر قاتلانہ حملہ کر چکا ہے اور آپ کو پھر بھی اس سے امید ہے کہ وہ آپ کو اپنے متعلق کچھ بتائے گا۔“

شیراز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی بالکل یقین ہے کیونکہ میں مایوسی کو گناہ سمجھتا ہوں اگر اس مریض سے

کچھ جاننے کی کوشش کی جائے تو وہ ضرور بتا دے گا۔“ ڈاکٹر سجاد شیراز کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ ”آپ کا کیا خیال ہے کہ عمر سے کچھ جاننے کی کوشش پہلے نہیں کی گئی ہوگی؟ میں نے بہت کوشش کی اگلاوے کی پیار سے نرمی سے سختی سے مگر ٹس سے مس نہ ہوا۔“

شیراز قحطل سے بولا۔ ”آپ کا اپنا انداز ہے ڈاکٹر صاحب اور یقیناً بہت بہتر ہوگا لیکن میرا انطریقہ ہے، صرف ایک بار مریض سے اکیلے میں مجھ کو ملنے کا موقع دیا جائے۔“

”کیا اکیلے میں؟ ناممکن..... آپ نہیں جانتے یہ سب کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر سجاد یکدم گھبرا کر بولے۔

شیراز ڈاکٹر سجاد کو قاتل کرتے ہوئے بولا۔ ”میں سب جانتا اور سمجھتا ہوں اگر کوئی بھی مسئلہ ہوا یا قمر نے مجھ پر حملہ کر دیا تو میرے شور سے آپ لوگوں کو پتہ چل ہی جائے گا البتہ مجھے یقین ہے اس بات کی نوبت ہی نہیں پیش آئے گی۔“

ڈاکٹر سجاد پریشانی سے بولے۔ ”یہ رسک آپ اپنی ذمہ داری پر لے رہے ہیں۔“

شیراز مسکرا کر بولا۔ ”بالکل میں خود ذمہ دار ہوں گا۔ ہر طرح کے حالات کا۔“

شیراز کو ڈاکٹر سجاد کی طرف سے عمر سے اکیلے میں ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی تو وہ خوش تھا۔ اگلے دن شام چار بجے وہ منٹل ہاسٹل پہنچا ڈاکٹر سجاد نے پہلے سے ہی عمر سے ملاقات کا بندوبست کر دیا تھا۔ شیراز بڑے جوش و خروش سے ایک کمرے میں بیٹھا تھا، درمیان میں ایک میز تھی۔ جس کے اوپر نوٹ بک اور پین رکھے تھے، شیراز بڑے غور سے سامنے دیکھ رہا تھا کیونکہ سامنے والی کرسی پر عمر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”یو کی سر جھکائے بیٹھے رہے ہو گے۔“ شیراز دھیمی مسکراہٹ سے بولا۔ ”مگر عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔“

”مجرم نہیں ہو تو سراٹھا کر بات کر دو چپ کیوں ہو؟“ شیراز اسے جواب دینے پر کساتے ہوئے بولا۔



عمر نے آہستگی سے اپنا سر اٹھایا اور شیراز کو خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے نفرت سے بولا۔ ”میں مجرم ہوں میں نے انکار نہیں کیا..... خونیں ہوں میں، ایک قتل کیا ہے میں نے! جانتے ہو کس کا؟ اپنے گے بھائی کا مگر..... مگر میں پاگل نہیں ہوں..... نہیں ہوں میں پاگل۔“

”میں جانتا ہوں تم پاگل نہیں ہو عمر۔“ شیراز کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا۔ ”کیا پتہ تمہیں پاگل بنادیا گیا ہو مگر کیوں؟ میں یہی جاننے آیا ہوں۔“

”بہت دیر ہو چکی ہے، اب تم جاؤ یہاں سے مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ عمر قدرے غصے سے بولا۔

”میں نے یہ کب کہا کہ تمہیں میری ضرورت ہے؟“ شیراز سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ مگر جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے وہ منظر عام پر آنا چاہئے کیا ہے اسے جان کر کئی لوگوں کی زندگی جاہ ہونے سے بچ جائے کیا تم چاہو گے کہ تمہاری طرح کئی اور عمر جنم لیں اور یوں قید خانے میں اپنی زندگی کا بہترین وقت برباد کر دیں۔ تم چاہو گے ایسا؟“

عمر جواباً چپ رہا تو شیراز انتہائی غصے سے اٹھ کر بولا۔ ”ٹھیک ہے تم مت بتاؤ مجھے، جو راز تمہارے سینے میں دفن ہیں ان رازوں کو اپنے ساتھ لے کر قبر میں چلے جانا اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ میں آج چلا جاؤں گا پھر میرے بعد یہاں کوئی اور تمہارے حقائق جاننے نہیں آئے گا۔“

یہ بات کہہ کر شیراز نے عمر کا رد عمل جاننے کے لئے بڑے غور سے اسے دیکھا، عمر بدستور کسی بے جان مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔

شیراز نے گہرا سانس لے کر فوسناک انداز میں عمر سے کہا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پلٹنے لگا تو یک لخت عمر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ”ٹھہرو۔“

شیراز نے پلٹ کر عمر کی طرف دیکھا۔ عمر کے وجود

پر لرز اٹھاری ہو گیا، ایک شدید دکھ کی لہر اس کے چہرے پر واضح تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی وہ کچھ پائپاٹ ہوئے لیوں سے بولا۔ ”بیٹھو۔“

شیراز انتہائی خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ خاموشی میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میں یعنی عمر، میرا مقتول بھائی قمر دونوں جڑواں بھائی تھے، ہمارے

پیدائش کے وقت ہی ہماری والدہ کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا تھا تاہم دونوں بھائیوں نے بد قسمتی سے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا تھا جو ایک مدت سے غربت و افلاس

کی خوفناک پرچھائیاں کا شکار تھا جہاں ایک گہری مایوسی تھی اور اس مایوسی میں ہمارے غربت زدہ ذہن کی کچھ بیٹھوسے تھے کہ ہماری حالت کبھی نہیں بدل سکتی، ہمارا زندگی کی بہترین آسائشوں پر کوئی حق نہیں، ہمارا مقدر صرف موت

مشقت کر کے دو وقت کی روٹی کھانا ہے اور یوں زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھتے ہوئے موت کی منزل تک پہنچ جانا ہے، ہم میں اپنی حالت سدھارنے کا کوئی جذبہ نہ تھا،

بہت چھوٹی عمر میں ہم دونوں بھائی محنت و مزدوری پر تل گئے تھے اور یوں محنت و مشقت کرتے ہوئے ہم دونوں بھائیوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔

میں نہیں چاہتا تھا میرے والد اس بوچھاڑ میں مزدوری کریں مگر وہ ایک خوددار انسان تھے انہیں خدا کے سوا کسی کا محتاج ہونا پسند نہ تھا اور پھر ایک دن اسی خودداری

کی لالچ رکھتے ہوئے وہ موت سے جا ملے، کام کے دوران ہی ان کو دل کا جان لیوا دورہ پڑا اور یوں باپ کا سایہ بھی ہمارے سر سے اٹھ گیا۔

باپ کے مرنے کا ہم دونوں بھائیوں کو بہت دکھ تھا کافی دن تک ہم بے دلی سے زندگی کے دن گزارتے رہے، وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے، آہستہ آہستہ ہمارے

صدمہ بھی کم ہونے لگا اور ہم دونوں بھائی پہلے کی طرح زندگی جینے کی جدوجہد میں خوب محنت اور مشقت کرنے لگے۔

قمر کی عجیب عادت تھی وہ جو کما تھا اس میں کچھ نہ کچھ ضرور اپنے پاس جوڑ کر مختلف قسم کے انعامی بانٹ لیتا

رہتا تھا اور پانچ وقت کی نماز میں ان کے نکلنے کی خصوصی دعا لگا کرتا تھا۔ عقیدہ پختہ ہو تو انسان جو چاہتا ہے وہ ایک دن ضرور پالیتا ہے اسے بھی بھروسہ تھا خدا پر۔

ایک دن میری طبیعت ٹھیک نہ تھی میں اس روز کام پر نہ جا سکا اور سارا دن چار پانی پر پڑا رہا، شام کے وقت اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور قمر اس میں سے نمودار ہوا، وہ خوشی سے سرشار! آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ ”تو کہتا تھا میں بے وقوف ہوں میرا انعامی بانٹ کبھی

نہیں نکلے گا مگر یہ دیکھ۔“ اس نے میرے سامنے اپنا انعامی بانٹ اور اس کی قرعہ اندازی والی سلیٹ لہرائی۔ ”پورے دس لاکھ کا انعام نکلا ہے میرا۔“

میں حیرت سے اٹھ بیٹھا اور خورسٹ کو پکڑ کر دیکھا جہاں مطلوبہ نمبر کے نیچے قمر نے لائن لگا رکھی تھی۔ قمر نے فوراً اپنا انعامی بانٹ والا نمبر دکھایا، اس کا واقعی دس لاکھ کا انعام نکلا تھا۔

دس لاکھ میرے لئے بہت بڑی رقم تھی۔ قمر نے مجھ سے مجھے منع کیا کہ میں انعام والی بات کا ذکر کسی سے نہ کروں کیونکہ اس نے خود بھی میرے علاوہ کسی کو بھی اس بات کا نہیں بتایا تھا۔

میں پوری دنیا سے یہ بات چھپا سکتا تھا مگر ایک ہستی ایسی تھی جس سے میں اپنی زندگی کی کوئی بات نہیں چھپا پاتا تھا، اسے میں اپنے دل و جان سے چاہتا تھا وہ بھی میرے تباہی کی انکوئی بیٹی مینا۔

میں بچپن سے ہی مینا کو بہت پسند کرتا تھا اور جوانی میں یہی پسندیدگی محبت میں بدل گئی۔ مینا سے میری محبت سچی ہوئی نہ تھی اور مینا بھی مجھ سے اس طرح سے پیش آتی تھی جیسے وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہو مگر اپنی اس محبت کا اظہار اس نے کبھی مجھ سے نہ کیا تھا۔

تاہم ہم دونوں تقریباً روز ہی شام کے وقت جمیل کے کنارے بیٹھ کر کافی دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نے انعامی بانٹ کے نکلنے والی بات مینا کو بتائی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”کیا ج!۔“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”تو کیا میں تیرے ساتھ جھوٹ بولوں گا؟“ میں جان بوجھ کر ہلکی سی ہنسی سے بولا۔

”نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا مگر قرآنی بڑی رقم کا کیا کرے گا؟“ مینا فوراً بولی تو میں کندھے اچکا کر بولا۔

”مجھے کیا پتہ شاید کوئی کاروبار شروع کرے۔“ وہ بھڑکی بولی۔ ”وہ جیسا بھی ہے کم از کم تم سے تو سمجھدار ہی ہے۔ اس نے اپنے لئے کچھ کیا تو ہے۔“ میں مسکرا کر بولا۔ ”اس نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا میری جان! اس کی قسمت ساتھ دے گئی ہے۔“

وہ منہ پھلا کر بولی۔ ”جو بھی ہے تم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا۔“ میں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”چھوڑو ان باتوں کو ہر کوئی اپنی قسمت کے مطابق سب کچھ حاصل کرتا ہے، قمر کی قسمت اچھی تھی میری اتنی نہیں ہے مگر کیا پتہ زندگی میں کبھی میں بھی اس کی طرح اتنی بڑی رقم کا مالک بن جاؤں۔“

مینا سر جھٹک کر بولی۔ ”تم بس خواب ہی دیکھتے رہنا اور لوگ عملی کوشش کر جاتے ہیں۔ مجھے ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔“ اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا سوچنا پڑے گا؟“ میں حیرت سے سوالیہ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”سوچ کر بتاؤں گی۔“ وہ مجھے شش و پنج میں مبتلا کر کے کسی ہرئی کی طرح فلاںچیں بھرتی ہوئی دور نکل گئی اور میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

قمر دس لاکھ کا انعام فوراً حاصل کرنا چاہتا تھا اس لئے اگلے دن ہی انعام لینے کے لئے گھر سے نکل گیا مگر بد قسمتی سے راستے میں اس کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ اس حادثے میں اس کی جان تو بچ گئی مگر ٹانگ پر گہرا زخم آیا۔

ڈاکٹر نے قمر کو کم از کم ایک ہفتہ تک آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ قمر بھی بڑی مشکل سے دو قدم چل پاتا تھا۔ اس لئے میں ہی قمر کا خیال رکھتا تھا۔ قمر کو انعامی رقم لینے کی جلدی تھی مگر وہ اس معاملے میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر رہا تھا حتیٰ کہ مجھ پر بھی نہیں۔ حالانکہ میں اسے کئی بار کہہ چکا تھا کہ

انعامی رقم مقررہ مدت سے پہلے میں خود اسے لا دیتا ہوں



مگر وہ مانتا سب ناں!

نہیں۔

اس دن میں کام سے ذرا جلدی واپس آیا تھا، دل چاہا تو تحصیل کے کنارے چلا آیا، میں نے دور ہی سے مینا کو اپنا منظر پایا۔ پہلے میں اس کے انتظار میں وہاں ٹھہلا کرتا تھا۔ آج وہ میرے انتظار میں بے چینی سے وہاں ٹھہل رہی تھی میں آتے ہی بولا۔ ”آج تو بڑا سہانا دن ہے جو چاند ہمارے انتظار میں پریشان ہے۔“

مینا میری بات سن کر غصے سے سرخ ہو گئی۔ ”تمہیں اپنی فضول قسم کی باتوں سے فرصت نہیں! اور یہاں میں سوچ سوچ کر نڈھال ہو رہی ہوں۔“

”کیوں ایسا کیا ہو گیا؟ جو تم پریشان ہو۔“ میں گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں دس لاکھ کے متعلق سوچ رہی ہوں۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”کیا یہ دس لاکھ تمہارے دماغ پر سوار ہو چکے ہیں؟ میں نے بہت بڑی غلطی کی جو تمہیں بتا دیا۔“ میں غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں اتنا ناراض ہو رہے ہو؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ہمارا مستقبل شاندار ہو۔“ مینا بدستور سخت لہجے میں بولی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو صاف صاف بات کرو۔“

میرے لہجے میں یہ بات کہتے ہوئے سختی آتی تو وہ اچانک میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور انتہائی نرم لہجے میں بولی۔ ”مجھے غلط مت سمجھو عمر، میں یہ چاہتی ہوں تمہاری زندگی سنور جائے وہ دس لاکھ تمہیں مل جائیں اور تم کوئی اچھا کام دھندہ کر کے اپنی زندگی بناؤ اگر تم اچھا کمانے لگو گے تو یقیناً میرے لبا اور اماں بھی فوراً راضی ہو کر تمہیں میرا رشتہ دے دیں گے اور پھر ہم ایک خوب صورت زندگی کی ابتدا کریں گے مجھے یقین ہے تم جو کام بھی شروع کرو گے اس میں اپنی محنت کی وجہ سے خوب ترقی کرو گے۔“

میں گہرا سانس لے کر بولا۔ ”تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ دس لاکھ، میں کیسے حاصل کروں گا۔“ قمر اپنے جیتے جی تو وہ رقم مجھے دے گا

مینا فوراً بولی۔ ”یہی تو میں کہہ رہی ہوں قمر اپنے جیتے جی تو وہ رقم نہیں دے گا تو بہتر ہے تم اسے قتل کر دو۔“ مینا کے منہ سے اتنی بڑی بات آسانی سے سن کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ”کیا تم مجھے اپنے سگے بھائی کو قتل کرنے کا بول رہی ہو؟ تم ہوش میں تو ہو؟“ میں قدرے غصے سے بولا تو وہ جواباً سخت لہجے میں بولی۔ ”اور کیا کرو گے تم، کوئی اور تدبیر ہے تمہارے دماغ میں، رقم حاصل کرنے کی تو بتاؤ مجھے۔“

میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے صرف اتنا پتہ ہے میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا وہ میرا بھائی ہے، میں اپنے بھائی کو کیسے مار دوں، وہ گہری نظروں سے میرا بازو لے کر بولی۔ ”تمہارا بھی فیصلہ ہے کیا؟ میں اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تم مجھے بھول جاؤ۔“ وہ اٹھنے لگی تو میں نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا اور بے بسی سے بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو! کیا میں تمہیں بھول سکتا ہوں؟“ وہ سر دھچکے میں بولی! ”اگر تم مجھے سے محبت کرتے ہو تو سب کچھ کر سکتے ہو تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔“ اس نے انتہائی غصے سے میرے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔

”کیسی بات نہیں ہے مینا۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تمہارے واسطہ اور ہے ہی کون؟ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں مگر کسی کا قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔“

میرے ڈھیلے لہجے کو دیکھ کر اس کا انداز پھر سے انتہائی نرم ہو گیا اور وہ پھر سے بیٹھ کر مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”تم فکر مت کرو یہ سب بہت آسان ہے، تم قمر کو رات سونے سے پہلے دودھ پاچا پائے میں بے ہوشی کی دوا دے دینا اور جب وہ بے ہوش ہو جائے گا تو رات کو ہی کلبھاڑی کے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دینا اور وہ کلبھاڑی کچے گھن میں مٹی خود کوفن کر دینا اور ہاں خود کو زخمی کرنا مت بھولنا اور بے ہوش ہونے کی اداکاری کرنا، میں صبح اسی ابو کو لے کر قمر کی عیادت کے لئے آؤں گی اور اپنی حالات خود ہی سنجال لوں گی۔ تم نے ہی تو بتایا تھا چند روز

قبل قمر کا اپنے ساتھ کام کرنے والے ایک شخص کے ساتھ جگڑا ہوا تھا اور اس شخص نے سب لوگوں کے سامنے قمر کو جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی تھی، تو بس ہمارا کام مزید آسان ہو گیا تم پولیس کو بیان دینا کہ تمہیں اس بندے پر شک ہے اسی نے رات کے کسی پہر تمہارے گھر میں گھس کر قمر کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا اور جب تم شور مچا کر جا گے اور اسے روکنا چاہا تو تمہیں بھی اس نے زخمی کر دیا اور فرار ہو گیا۔

چند دن بعد وہ دس لاکھ ہمارے ہو جائیں گے۔“ وہ انتہائی شاطرانہ انداز سے قمر کے قتل کا منصوبہ مجھے بتا رہی تھی اور میں جی رانی سے اس کے معصوم چہرے کو دیکھ رہا تھا جس پر مجھے کہیں بھی عیاری نظر نہیں آ رہی تھی۔ ”بولو کیا منصوبہ ہے؟“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ داغ طلب انداز سے بولی۔

میں بے دلی سے مسکرا دیا۔ ”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا تم اتنی چالاک ہو سکتی ہو، تم فکر نہ کرو، میں کوشش کرتا ہوں کہ آج ہی یہ کام ہو جائے اور تم صبح اپنے والدین کو لے کر پہنچ جانا۔“

”کیا کچ۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے میرے ہاتھوں کو چوم لیا، تم بہت اچھے ہو عمر، اچھا اب میں چلتی ہوں، بہت دیر ہوئی ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں فوراً بولا۔ ”مینا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی گزربوند ہو جائے۔“

مینا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”ممت ڈرو کچھ نہیں ہوگا، بس تم اپنا کام کرو بات کے حالات میں سنجال لوں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

مگر مجھے وہ ایک بہت بڑی آزمائش میں مبتلا کر گئی تھی جس پر ہر حال میں مجھے پورا اترنا تھا۔ گھر آ کر میں سبدم ہو کر چار پانی پر گرا پڑا مینا کی کبی ہوئی ایک ایک بات میرے دماغ میں گونج رہی تھی۔ مجھے دس لاکھ کالا لاج نہیں تھا صرف اور صرف طلب تھی تو مجھے مینا کی محبت کی، میں مینا کی طرح بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اپنی دائیں جانب دیکھا جہاں قمر

چار پانی پر بے سدھ پڑا سو رہا تھا کتنا معصوم لگ رہا تھا اس وقت مجھے اس کا چہرہ، وہ میرا بھائی تھا سگے بھائی میرا خون۔

اور دوسری طرف مینا بھی جو زندگی تھی میرا روشن مستقبل! میرے اندر دل و دماغ کی ایک جنگ جاری تھی، دماغ نہیں چاہتا تھا کہ میں قمر کو قتل کر دوں جبکہ دل نہیں چاہتا تھا کہ مینا مجھ سے دور چلی جائے اور پھر وہی وہاں محبت جیت گئی وہ قمر کے لئے میرے اندر موجود تمام تر جذلوں پر غالب آگئی اور میرا دماغ میرا ضمیر ہار گیا، میں قمر کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے دودھ میں بے ہوشی کی دوا ملا کر قمر کو پلا دی تھی۔ قمر دودھ پیتے ہی دنیا و فانیہ سے خیر ہو گیا تھا۔ رات کے کسی پہر میں ایک انتہائی سفاکانہ فعل کو سر انجام دینے کے لئے اٹھ گیا۔

ہاتھ میں کلبھاڑی تھاتے ہی میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا قمر کی چار پانی کے قریب پہنچ گیا اور دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے کلبھاڑی کو پکڑ کر قمر پر وار کیا مگر میری بد قسمتی کہ پہلے وار میں ہی قمر جاگ گیا، وہ دوسرے کہہ لیا اور ایک زوردار بھیاں کچاں اس کے منہ سے خار بن ہوئی، وہ نہ جانے کیسے بے ہوشی سے جاگ گیا تھا، شاید بے ہوشی کی دوا کا اثر زائل ہو چکا تھا، تاہم قمر کے یوں چیختے پرنے میں بری طرح سے گھبرا چکا تھا، میں نے اگلا دار انتہائی تیزی سے کیا ضرب کاری تھی قمر کا سر ٹکرتن سے جدا ہو گیا۔

خدا جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا کہ میں انسان سے بالکل درندہ بن چکا تھا، میں وحشی درندے کی طرح مسلسل قمر کی لاش پر وار کرتا گیا یہاں تک کہ قمر کا وجود کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا تھا۔

دھنچکا مجھے باہر سے دروازہ پٹینے کی آواز آئی، میرا دماغ بالکل سن ہو چکا تھا، پھر مجھے جن میں کسی کے کونڈے کی آواز سنائی دی اور چند ہی لمحوں میں کمرے کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور میرا دماغ گویا سامنے دیکھ کر چمکا سا گیا کیونکہ میرے سامنے میرے بچپا اور ان کا بیٹا احمد کھڑے تھے۔

میرے بچپا ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ اپنے بچپا اور کزن کو سامنے دیکھ کر



میں دنگ رہ گیا، مجھے سمجھ نہ آئی وہ کیسے جاگ گئے تھے اور کیسے عین موقع پر پہنچ گئے تھے؟

دماغ نے یہی کہا کہ قمر جو زوردار آواز میں چیخا تھا تو یقیناً وہی چیخ ان کو صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے یہاں پہنچا لائی تھی۔

میرے ہاتھوں میں خون آلود کپھاڑی تھی۔ میرے سامنے قمر کا کئی ٹکڑوں میں منقسم وجود تھا۔ اور اس کے خون کے چھینٹے میرے ہاتھوں اور چہرے کو میرے کپڑے سمیت داغ دار کر گئے تھے میں بری طرح سے پھنس چکا تھا، بچاؤ کی کوئی راہ نہ تھی۔ میں آلہ قتل سمیت ان کے سامنے موجود تھا، اس لئے حیران و پریشان بس ان کو ہی گھورے جا رہا تھا۔

”عمر یہ کیا کر دیا تم نے؟“ میرے چچا قریب آتے ہی مجھے سمجھوتے ہوئے چیخے۔

مگر میں تو جیسے پتھر کا بن چکا تھا پکڑے جانے کے صدمے نے میرے ہوش و حواس شکل کر دیئے تھے، مجھ پر سکتہ ساطاری ہو چکا تھا۔ میرے دماغ پر جیسے ایک دھند سی چھا گئی تھی، ایسے میں میرا دل بس ایک ہی سوال کر رہا تھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

اور دماغ انتہائی حقارت سے کہہ رہا تھا۔ ”اے ہاتیل اور قاتیل کی داستان تازہ کرنے والے بد بخت انسان! اپنے ہی بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنے والے وحشی درندے! جو تو کرچکا ہے اس کا انجام اب کرب و اذیت سے بھگتنا ہوگا، یا پھر پھانسی کا پھندا تیرا منتظر ہے۔

اور پھر اسی رات مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس کی حراست میں تھانے میں دو دن تک میں رہا پھر مجھے جیل بھیج دیا گیا۔

حالات نے جیسے پلٹا کھلایا تھا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ جیل میں ہی مجھ سے مینا ملنے کے لئے آئی۔ مینا کو کھتے ہی میں تڑپ کر بولا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟“

مینا نے سلاخوں کو پکڑتے ہوئے انتہائی تحمل سے کہا۔ ”حیران تو میں بھی ہوں کہ ایک دم سے یہ سب کیا ہو گیا مگر تم فکر مت کرو، مجھ کو بھی ایک راستہ باقی ہے۔“

میں دکھ سے بولا۔ ”اب کیا باقی رہ گیا ہے؟ میرا پھانسی چڑھنا یقینی ہے کیونکہ میں آلہ قتل سمیت گرفتار ہوا ہوں۔“

وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں پھانسی نہیں چڑھنے دوں گی، یہ میرا تم سے وعدہ ہے میں نے سلیم چچا کے بیٹے احمد سے بات کی ہے اس کا جاننے والا ایک بہت اچھا وکیل ہے، وہ ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا، مگر الحال اس نے مجھے جو تمہارے بچاؤ کی تدبیر بتائی ہے، وہ وکیل تمہیں ابھی کچھ دیر میں خود آکر سمجھا دے گا۔“

احمد جو کہ میرا چچا زاد تھا پڑھا لکھا تھا اور کام دھندا اچھا کرتا تھا مگر میں حیران تھا احمد مجھے کیوں بچانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس نے مجھے جس حالت میں قمر کی لاش کے پاس دیکھا تھا اس میں تو کوئی بھی مجھ جیسے سفاک درندے کے پھانسی چڑھ جانے کی خواہش کرتا۔

میں نے یہی سوال مینا سے کیا تو وہ بولی۔ ”میں نے احمد سے خود بات کی ہے تم فکر مت کرو اس نے تمہاری مدد کرنے کا مجھ سے وعدہ کیا ہے اور ہاں قمر کا وہ انعامی ہائڈ میں نے وہاں پہنچتے ہی اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ یہ مت پوچھو کتنی مشکل سے ڈھونڈا اور کیسے دوسروں کی نظروں سے بچ کر یہ سب کیا، اب میں نے تم بھی بینک سے نکالی ہے اتنی بڑی رقم کو بڑی احتیاط اور حفاظت سے میں نے گھر میں ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیا ہے۔“

میں حیرانگی سے مینا کے منہ سے وہ ساری تفصیل سن رہا تھا، وہ دہلی چلی گئی دھان پان کی لڑکی کتنی چالاک اور پھر تیلی تھی کتنی تیزی سے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ وہ پھر بولی۔ ”تم فکر مت کرو بس کچھ مدت سوچو جب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مجھے بڑے حوصلے سے تسلی دے کر لوٹ گئی۔ اس کے کہنے کے مطابق کچھ ہی دیر بعد احمد ایک ادیب و عمر وکیل کے ساتھ مجھ سے ملنے آیا اور اس وکیل نے مجھے بچاؤ کی جو تدبیر بتائی اسے سن کر واقعی میرے دل میں جینے کی امنگ ایک بار پھر سے جاگ اٹھی۔

تدبیر یہ تھی کہ وہ وکیل عدالت میں یہ ثابت کرنے

کی کوشش کرے گا کہ میں ایک ذہنی مریض ہوں اور یہ قتل میں نے اپنے ہوش و حواس میں نہیں کیا بلکہ دورے کی حالت میں کیا اور مجھے بھی اپنی طرف سے ایک ذہنی مریض کی پوری اداکاری کرنا پڑے گی۔

وہ وکیل مجھے جو ہدایات دیتا گیا میں ان پر عمل کرتا۔ عدالت میں میرا ریٹائرڈ لینے کا بھی آرڈر دیا گیا اور مجھے جلاؤ پولیس اہلکاروں کے حوالے کر دیا گیا تاہم میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا ان کے ظالمانہ تشدد کے باوجود میں نے قمر کے قتل سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر عدالت نے مجھے مینٹل ہاسپٹل علاج کے لئے بھیج دیا۔

میں کئی کافی عرصہ چلا پھر آخر ثابت ہو گیا کہ میں ایک خطرناک قسم کا ذہنی مریض ہوں جس کو کسی بھی وقت درجہ بڑھ سکتا ہے۔ اس لئے عدالت نے مجھے نارمل ہونے تک علاج کے لئے مینٹل ہاسپٹل میں بھیج دیا۔ میں خوش تھا کہ میرے ذہنی مریض ہونے کی گواہی احمد کے والد یعنی میرے چچا اور مینا کے والدین نے بھی دی تھی انہوں نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا تھا، میں نے بعد میں جانا تھا۔

مینٹل ہاسپٹل میں آنے کے بعد ایک سفاک ڈاکٹر نے جس قدر میرے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا وہ بیان سے باہر ہے، میں وہاں کسی جانور سے بدتر زندگی گزار رہا تھا اور بے تابی سے مینا کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آکر وہاں سے مجھے لے جائے گی اور آخر ایک دن میرا انتظار بھی ختم ہو گیا، مینا مجھ سے ملنے اسپتال میں آئی، مجھے سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا گیا تھا۔

میں مینا کو دیکھ کر تڑپ کر بولا۔ ”مینا دیکھو یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اب جبکہ عدالت سے میرا کیس بھی خارج ہو چکا ہے سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تب بھی یہ اسپتال والے مجھے جانے نہیں دیتے ہیں میں انہیں کتنی بار بتا چکا ہوں کہ میں پاگل نہیں بلکہ بالکل ٹھیک ہوں تب بھی یہ مجھے جانے نہیں دیتے بلکہ انہوں نے جو میرے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہے وہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔

وہ سفاک ڈاکٹر مجھے واقعی پاگل بنانا چاہتا ہے، ہر روز مجھے بجلی کے جھٹکے لگاتا ہے اور بری طرح مارتا پینتا

ہے۔“ اپنی حالت بیان کرتے ہوئے میں واقعی ہڑا۔ مینا میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرگوشی سے بولی۔ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم واقعی پاگل ہو جاؤ عمر۔“ مینا کی بات سن کر میری آواز جیسے حیرت سے پھٹ سی گئی۔ ”کک..... کیا مطلب؟“ میں ہلکایا۔

مینا مسکرا کر بولی۔ ”مطلب یہ کہ یہ سب میرے ہی کہنے پر ہو رہا ہے۔ اس ڈاکٹر نے تمہیں پاگل بنانے کی قیمت وصول کی ہے، اب میں نہیں چاہتی کہ تم بھی اس پاگل خانے سے باہر نکلو۔“

”مگر کیوں؟“ میں حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں چیخا۔

وہ ایک بار پھر مجھ پر حیرت کا پہاڑ گراتے ہوئے بولی۔ ”اس لئے کہ میں اب احمد سے شادی کر رہی ہوں، اب تم یہ سوال کرو گے کہ کیوں؟ تو فرق صاف ظاہر ہے، تم خود غور کرو، احمد تم سے کہیں بہتر ذہین اور اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے ہر انسان کو اچھی سے اچھی چیز کی تلاش ہوتی ہے اور مجھے تم سے بھی اچھی چیز مل چکی ہے اب میں اور احمد قمر کے اس پرانے باڈی رقم سے ایک خوب صورت زندگی کا آغاز کریں گے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔“ میں تلملا کر بولا۔

وہ طنز پر انداز میں ہنس پڑی اور زیر لب بڑبڑائی۔ ”پیار! آج کل کے دور میں یہ ”پیار“ جیسا لفظ کسی مذاق سے کم نہیں یہ پیار و یار تم جیسے سر پھروں کے لئے کوئی چیز ہوگا مگر میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔“

میں نے نفرت سے مینا کی طرف دیکھا۔ ”تم کتنی گھٹیا اور شاطرانہ فطرت کی مالک ہو، مینا خدا کی قسم میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا جو تم نے میرے ساتھ کیا، تمہیں ذرا خیال نہیں آیا کہ میں نے تمہاری محبت میں اپنے بھائی کی جان لے لی اور اپنی جان داؤ پر لگا دی آخر مجھ سے محبت کا ڈھونگ کیوں رہا یا تم نے اگر تمہیں پیسے ہی چاہئیں تھے تو چھ جانے دیتیں مجھے پھانسی! کیوں مجھے پاگل بنا کر اس اسپتال میں ایک اذیت ناک حالات سے دوچار کر دیا جواب دو آخر کیوں؟“





## خونی پاؤں

احسان بحر-میانوالی

رات کے وقت اچانک بوڑھے کی آواز سنائی دی میرا خیال ہے کہ وہ جہنمی روح دوبارہ جہنم کی طرف لوٹ گئی ہوگی لیکن پھر اچانک.....

کیا وہیں بھی اپنا انتقامی منصوبہ مکمل کرتی ہیں۔ یہ جاننے کے لئے یہ کہانی پڑھنا نہ بھولے گا

میسور ضلع پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے اس کہانی کو سناتے ہوئے کرب تلے دبا جا رہا ہوں..... یہ غلش میری زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنے چچا کی موت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ کیا میں ایک قاتل ہوں؟ اس بات کا فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے..... البتہ تمام حقائق و شواہد بیان کر رہا ہوں.....! اپنے چچا تھا سن سے مجھے بڑی محبت تھی۔ وہ

لوگ تو چچا تھا سن کو نہیں جانتے تھے ان کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور ان کو جنونی گردانتے تھے۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ انہیں مشرقیات سے عشق تھا۔ نوادر عجائبات جمع کرنے کا خیال انہیں لے ڈوبا۔ ویسے بھی اتنا کہہ سکتا ہوں وہ اس معاملے میں کسی قدر خطی ضرور تھے..... ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ خود اپنی جمع کی ہوئی چیزوں سے خائف رہا کرتے

مجھے مکمل پاگل بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی یہ اسی ظالم سلوک کا نتیجہ ہے کہ میں اکثر آپ سے باہر ہو جاتا ہوں۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ بس مجھے اپنے سامنے کھڑی ہوتی بیٹا دکھائی دیتی ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کا گلا دباؤں.....

عمر اپنی داستان سناتے ہوئے ایک لمحے کے لئے رکا پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ ”بیٹا نے جو کچھ مجھ سے کہا اس کے بعد مجھے اندازہ ہوا، میرے ساتھ ایک بھیا نک کھیل کھیلا گیا تھا اور اس کھیل میں میری حیثیت صرف ایک مہرے جتنی تھی، مجھے استعمال کیا گیا تھا اور سب کو بیٹا احمد اور ان دونوں کے گھر والے لے اڑے، اور میں خالی ہاتھ رہ گیا اپنے معصوم بھائی کو کھو بیٹھا اپنی زندگی برباد کر دی میں نے۔“ عمر نے روتے ہوئے اپنا سر تھا مایا۔ میں پوری توجہ سے اس کی روداد سن رہا تھا۔ عمر نے دفعتاً اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کر کے اپنے سامنے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔ میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا کہ اس کے خالی ہاتھوں میں بس اب پچھتاوے کے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا تھا۔ وہ گنہگار تھا مگر اس وقت تھا کہ وہ قابل رحم نظر آ رہا تھا۔

عمر کو جو اپنے کئے کی سزا ملی تھی وہ پھانسی کی سزا سے کہیں زیادہ اذیت ناک تھی تاہم عمر کی سزا میں بیٹا احمد کی شریک تھی گروہ بچ گئی تھی۔ شیراز مختلف لوگوں سے پوچھتا ہوا آخر بیٹا کے تک پہنچ گیا وہاں اسے پتہ چلا کہ بیٹا کی احمد سے سال قبل شادی ہوئی تھی۔ اپنی بیٹی مون منانے وہ کبھی فرنگی مقام پر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بھیا نک ایکسپریٹ میں دونوں کی موت ہو گئی تھی اور یوں بیٹا احمد کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تھا۔

جن بیٹیوں کے لئے انہوں نے اپنے جن جن تھے ایک معصوم کی جان لے لی تھی اور دوسری جاہ کر دی تھی وہ ان کے کام بھی نہ آ سکتے تھے۔

میں دکھ سے پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

بیٹا ڈھٹائی سے بولی۔ ”جی بتاؤں پہلے میرا ارادہ تم ہی سے شادی کرنے کا تھا مگر پھر اچانک احمد نے آ کر میرے ذہن کی کاپی لٹ دی اور میں نے تمہارے بجائے احمد سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا، تمہیں پھانسی کے تختے میں نہیں لے جانا چاہی تھی اس لئے تمہیں پاگل ثابت کر کے اس پاگل خانے کو تمہاری آخری قیام گاہ بنادیا۔“

”تم..... تم انتہائی شاطر عورت ہو بیٹا آج زندگی میں پہلی بار مجھے تم سے نفرت محسوس ہو رہی ہے اتنی نفرت کہ!“ میں نے بات اور دھوری چھوڑ کر سلاخوں سے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن دیوبوچ لی اور غصے سے چیخا۔ ”آج میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار دوں گا تم جیسی بے وفالاچی عورت کو جیسے کا کوئی حق نہیں۔“ میں انتہائی نفرت سے غرایا اور اس کے گلے کو غصے سے دبائے لگا۔

بیٹا میرے اس رد عمل کے لئے بالکل تیار نہ تھی اس لئے اسے اپنے بچاؤ کو بالکل بھی موقع نہ مل سکا تاہم وہ اپنے بچاؤ کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے پھڑپھڑانے لگی، میرے ہاتھوں کی گرفت سے اپنی گردن کو نہ چھڑا سکی، بیٹا کی چیخ و پکار سن کر اسپتال کے عملے کے چند بندے دوڑے ہوئے آئے اور میری گرفت سے بیٹا کی گردن کو آزاد کرانے لگے مگر میں نے مس نہ ہوا۔ میں ہر صورت میں بیٹا کو مار دینا چاہتا تھا۔ عملے کے ایک بندے نے جب یہ دیکھا کہ میں بالکل اپنے حواسوں میں نہیں ہوں تو اس نے کوئی بھاری چیز میرے سر پر دے ماری۔ ضرب لگتے ہی مجھے چکر سا آ گیا۔ میری گرفت ڈھیلی ہو گئی اور میرا دماغ تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

مجھے افسوس تھا بیٹا میرے ہاتھ سے بچ گئی تھی اس روز کے بعد سے آج تک میں نے بیٹا کی شکل نہیں دیکھی تاہم بیٹا کے ساتھ جارحانہ سلوک کے بعد میرے ساتھ اس اسپتال میں جس قدر ظالمانہ اذیت ناک اور انسانی سوز سلوک کیا گیا وہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔



## تین دوست

علم، دولت، عزت رخصت ہونے لگے تو ان کے درمیان کچھ اس طرح گفتگو ہوئی، علم کہنے لگا مجھے ملنا ہو تو عالموں کی صحبت اور کتابوں میں ملوں گا۔ دولت کہنے لگی مجھے ملنا ہو تو امیروں کے محلوں میں تلاش کرو۔ عزت کچھ نہ بولی اور خاموش رہی۔ تب علم اور دولت نے پوچھا؟ تم کیوں خاموش ہو؟ تب عزت افسوس سے بولی۔ میں اگر ایک بار چلی جاتی ہوں تو دوبارہ نہیں ملتی۔

(بلقیس خان۔ پشاور)

ہاتھ میں رہا اور مجھے ہمیشہ سے اعتقاد رہا ہے کہ پراسرار طاقتیں بعض چیزوں میں پوشیدہ رہتی ہیں اور وہ محسوس بھی ہو سکتی ہیں اور مبارک بھی۔

جس دن میں یہاں آنے والا تھا میری دکان پر ایک ہندوستانی ملاح آیا اور اس نے مجھے ایک چھوٹا سا مجسمہ فروخت کے لئے دیکھا یا اور یہ مجسمہ کسی رقصہ کا تھا۔ میں نے وہ مجسمہ خرید لیا کیونکہ ملاح نے کہا تھا ”وہ شخص ہر بلا سے دور رہتا اور محفوظ ہو جاتا ہے جس کے پاس یہ مجسمہ ہو۔“

آج سے ٹھیک ایک سال قبل آج ہی کی تاریخ تھی یعنی 24 دسمبر کو میں یہاں اپنے سوٹ کیس کے ساتھ آیا تھا۔ نواب کے دروا کے ہندوستانی ملازموں نے میرے لئے دروازہ کھولا تھا۔

مجھے وہ ملازم کچھ اچھا آدمی نہ لگا تھا مجھے معلوم تھا کہ وہ کرہ جو نواب صاحب کی شب خوابی کے لئے تھا میرے لئے تیار کیا گیا تھا میں تمہیں وہ کرہ دکھاؤں گا، وہاں جب میں اندر پہنچا تو آتش دان میں آگ روشن تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ صندل کی لکڑی کے تین ٹکڑے صرف دو پیروں تک ہی صاف کئے گئے تھے تیسرا اوپر کی تختہ بغیر صفائی کے رہ گیا تھا اور وہاں گرجت تھی۔ میں نے سب سے پہلے رقصہ کے مجسمے کو میز پر

باس میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہونے لگیں۔ راتوں کو وہاں چٹیں سنا دی جاتی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب انگلینڈ میں سارے مکانات حویلیوں جیسے ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اندر کا حال معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ چند سالوں کے بعد اس حویلی کے باغ سے 15، 10 کچھ پڑیاں کھود کر نکالی گئیں اس نواب کا ایک فوٹو اس وقت بھی الماری کے عین اوپر لٹکا ہوا دیکھ سکتے ہو اور دیکھو کیا شیطان جیسی شکل تھی۔“

”میں نے مڑ کر دیوار پر دیکھا اور واقعی اس آئل پینٹنگ میں بنی ہوئی شکل کچھ شیطان کی ہی تھی، اس نے جسم پر سرخ لباس پہن رکھا تھا۔ نقوش سے بے رنج اور سخت گیری عیاں تھی۔“

”نواب کی موت یا قتل کے بعد اس کے محل کی اشیاء کو انڈیا روانہ کر دیا گیا اور مکان کو نیکلام کر دیا گیا اس کے مکان کا پہلا خریدار، وہاں ایک ہفتہ بھی نہیں رہنے پایا تھا کہ اسے اپنے ٹیڈر کی موت کا سوگ منانا پڑا، دوسرے ملازمین نے وہاں رہنے سے انکار کر دیا۔“

پھر اس مکان میں دوسرا شخص آیا اسے بھی چند دنوں میں اپنے دو بچوں سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ وہ دونوں ہال میں تھے اور ان کی گردنیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر زاسے کسی بھی طور پر حادثہ قرار دینے کو تیار نہ تھے مگر یہ سب کیسے ہوا؟ یہ کوئی بھی نہ جان سکا اور یہ حادثات تین ہفتے کے اندر رونما ہوئے تھے اس کے بعد یہ مکان ہمیشہ خالی ہی رہا۔

البتہ ہر سال اس کی رنگائی ہوتی تھی۔ کم کرایہ ہونے کے باوجود بھی کوئی اس میں آنے کو تیار نہ تھا۔ خود صفائی کرنے والوں کا کہنا تھا کہ ہر سال انہیں خاک آلود فرش پر کئی عورت کے پیروں کے نشان ضرور ملتے تھے کئی کئی بار انہیں گھٹکھ وڈوں کی آوازیں بھی سنا دی جاتی تھیں، لیکن کبھی کوئی دکھائی نہ دیا تھا۔ اس کے بعد یہ مکان میں نے لے لیا جس میں تم اس وقت ہو۔

یہ وہی مکان ہے جیسا کہ تم جانتے ہو تمہارے والد کے بعد عجائبات اور نوادرات کا کاروبار میرے

”اور یہ کہاں سے ملے ہیں؟“ ”خدا کے واسطے“ چچا تھا جس نے گہرا کر کہا۔

”انہیں وہیں رکھ دو۔“ میں نے محسوس کیا کہ کچھ پریشان سے ہو گئے تھے اور انہوں نے مجھے گہرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے اسے ہاتھ تو نہیں لگایا تھا؟“

وہ موم کے بنے ہوئے دو زنا نہ پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے جو تقریباً ایک انچ لمبے تھے اور ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور گھٹکھ وڈوں کے قریب تھے اسی لمحے میں نے انہیں غور سے دیکھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے پاؤں تھے۔ زنا نہ پیروں اور دونوں پیروں کے اوپر سے کئے ہوئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی انہیں جسم سے کاٹا گیا ہے، فنکار نے انہیں بڑی خوب صورتی سے بنایا تھا، رنگوں کا استرجاع ایسا تھا کہ وہ بالکل حقیقی اور تازہ کئے ہوئے معلوم ہو رہے تھے ان کے ننھے ننھے ناخن صفائی سے رنگے ہوئے تھے۔

”نہیں! میں نے تو چھوٹا تو درکنار اسے دیکھا تک نہ تھا۔“ میں نے چچا سے کہا۔

وہ آہستہ سے بولے۔ ”دیکھو انہیں بھول کر بھی نہ چھوٹا۔“

”مگر کیوں؟“ کچھ توقف سے میں نے پوچھا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان سے نظر آرہے تھے۔

”چلو پہلے کافی پی لو۔“ انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر میز تک لاتے ہوئے کہا۔

پھر جو کچھ انہوں نے مجھے بتایا وہ کچھ اس طرح تھا۔

”یہ سوہوین صدی کا ذکر ہے۔ ایک ہندوستانی نواب، جسے اپنی رعایا کے ساتھ ظلم کرنے کی پاداش میں ملک چھوڑنا پڑا۔ وہ انگلینڈ میں آ بسا۔ اس کے پاس خاصی دولت تھی وہ جانتا تھا کہ اسے سو سائی میں جکڑ جائے مگر اس کے داندرا دامن کے باعث اسے عزت نصیب نہ ہو سکی اس طرح وہ سب سے الگ تھک زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس کے قلعہ نما مکان کے

تھے۔ وہ ایک قلعہ نما مکان میں رہا کرتے تھے۔ میں ان دنوں آکسفورڈ سے نکلا تھا کرسس کی چٹیاں تھیں اس لئے مجھے ان کا دعوت نامہ ملا تو میں نے ان کے مکان بلومزبری جانے میں کچھ قیاحت نہ سمجھی، دراصل وہ مجھے اپنے نوادر دیکھانا چاہتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے بلومزبری سے ہمیشہ سے ہی چڑ رہی ہے اور آج بھی میں اس جگہ کو قطعی پسند نہیں کرتا۔

بہر حال وہ دسمبر کی بائیس تاریخ تھی ایک بے حد سرد اور کھراؤ اور رات۔ کھانے کے بعد ہی وہ مجھے اپنے ”ہولناک گھر“ میں لئے چلے گئے۔ یہ وہ کرہ تھا جہاں ان کے مخصوص نوادر رکھے ہوئے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی مجھے خوف کا احساس ہوا اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ چچا نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دیواروں پر جو اشیاء لگی ہوئی ہیں وہ انہیں نانا صاحب کے کل واضح ہندوستان سے ملی تھیں۔ جزل ہیولاک نے اس محل سے یہ اشیاء نکال لی تھیں۔ دراصل نانا صاحب کا محل کانپور میں واقع تھا۔ جب اس پر حملہ ہوا تو وہاں ایک کنواں ملا۔ جو جو توڑوں اور بچوں کی لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں میں آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ میں چچا تھا سمن کو بہت پسند کرتا تھا۔

بہر حال جب ہم اندر داخل ہوئے تو پچانے بجلی جلا دی اور ادھر جا کھڑے ہوئے جہاں آتش دان کے قریب ایک بڑی سی الماری رکھی ہوئی تھی اور اس پر سلک کے نیلے پردے پڑے تھے۔ پردہ ہٹتے ہی الماری کے شیشوں میں سے اندر کی اشیاء نظر آنے لگیں۔

”یہ دیکھو۔“ چچا بولے۔ ”اس میں جو بڑا چاقو دکھائی دے رہا ہے یہ کافی کے مندر سے حاصل ہوا ہے اس سے ہزاروں بچوں کی قربانی دی جا چکی ہے، بالوں کا وہ گچھا جو ادھر لگا ہوا ہے کانپور کے اس کنواں سے حاصل ہوا ہے جو اٹھارہ سو ستاون کے قتل عام میں لاشوں سے بھر گیا تھا۔ دیکھو اس میں خون کے دھبے ابھی بھی ہیں۔“ میں نے الماری کا دروازہ کھول کر اس میں رکھے ہوئے گھٹکھ وڈا لیتے ہوئے کہا۔







## سیاہ بھوت

عمران قریشی - کوئٹہ

رات کا اندھیرا ہر سو مسلط تھا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اچانک کسی نے عورت کو دبوچ لیا، عورت کے منہ سے آواز تک نہ نکلی اور پھر جب صبح لوگوں نے دیکھا تو عورت کو بری طرح بھنبھوڑ دیا گیا تھا کہ اچانک.....

رات کے گھٹاؤپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک دہشت ناک اور دل گرفتہ کہانی

**ضلع** مدھن پور سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں موہن پورہ واقع ہے، یہ گاؤں سرسبز اور گھنے درختوں سے مزین سو سے زائد گھروں پر مشتمل پہاڑی گاؤں ہے۔ یہاں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن گزشتہ دو سال کے دوران تقریباً چالیس کے لگ بھگ افراد کا قتل عام ہوا اور قاتل کا پتہ نہیں لگایا جاسکا۔ جب میں محکمہ جنگلات میں بطور فاریسٹ آفیسر تعینات ہوا۔ تب پہلی پوسٹنگ موہن پورہ میں ہوئی۔ شکار کرنا میرا مشغلہ تھا اور بندوق کو ہمراہ رکھنا میری عادت تھی..... موہن پورہ کے ڈاک جنگل میں جب میں نے اپنے نوکر گوپي کے ہمراہ قدم رکھا۔ تب پہلی خبر یہی ملی کہ ڈاک جنگل سے کچھ دور پتھر ملی پہاڑیوں کے پاس پھونٹے ہوئے چشمے کے قریب ایک عورت کی آدھ کھائی ہوئی لاش دستیاب ہوئی ہے۔ بقول گوپي کے..... یہ سلسلہ ڈیڑھ سال ہوئے شروع ہوا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بے شمار ملنے والی لاشوں کے قریب کسی بھی درندے یا پھر انسانی قدموں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ وہ کہاں سے آتا ہے اور شکار کرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔ گاؤں کے تو ہم پرست اور سادہ لوح افراد اسے سیاہ بھوت کے نام سے تشبیہ دیتے ہیں۔

لاش کے دستیاب ہونے اور نشانات کا نام ملنا میرے لئے بھی حیرت کا باعث بنا۔ لیکن میں دیہاتیوں کی فطرت سے بخوبی آگاہی رکھتا ہوں۔ چشم دید دیہاتی بھی واقعے کو نمک مرچ لگانے کے علاوہ کافی حد تک بات چیت میں رد و بدل بھی کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں واقعات کو پراسراریت کا روپ دینے کے لئے چیدہ چیدہ اور اصل معاملے کو بتانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے گاؤں کے افراد کی ملنے والی لاشوں کے پاس انسان یا پھر جانور کے کچھ نہ کچھ نشانات پائے گئے ہوں۔ لیکن معاملے کو پراسراریت کا روپ دینے کے لئے مجھے بتانے سے گریز کیا جا رہا ہو۔

بہر کیف میں نے جانے دقوعہ کا معاملہ کرنے کے لئے گوپي کے ہمراہ موہن پورہ سے کچھ دور ہٹ کر پہاڑیوں کی جانب رخ کیا۔ عورت کی لاش پہاڑی کے قریب گھاس کے سرسبز خطے میں پہاڑی چشمے کے قریب پڑی تھی۔ لاش کے سینے کا نرم گوشت اور پیٹ کا زیادہ تر حصہ کھالیا گیا تھا۔ چونکہ زمین کا وہ سرسبز و شاداب حصہ تھی گھاس سے مزین تھا۔ اس لئے نشانات کا ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں مذکورہ بالا سطور میں تحریر کر چکا ہوں کہ موہن پورہ گاؤں سرسبز و شاداب گھاس سے ڈھکی ہوئی



خوب صورت وادوں پر مشتمل گاؤں ہے۔ یقیناً نشانات نہ ملنے کی یہی وجہ رہی ہوگی۔ میں نے لاش کے اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ حسب توقع پاؤں کے نشانات مفقود تھے۔ گھاس بری طرح روندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ پائی کے آثار نمایاں تھے۔

آدم خورد عرفیت نے گھاس کے خطے سے کچھ دور خشک اور گھنی جھاڑیوں کے پاس مقتولہ پر حملہ کیا تھا۔ یہاں ایک جگہ خشک جھاڑیوں اور گھاس پر اس کے بیٹھے رہنے کے بعد دو نشانات بھی مل گئے تھے۔ وہ یقیناً کسی چوپائے کے نشانات تھے۔ لیکن اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ شیر یا بھر چیتا..... جو بھی تھا۔ اس نے عورت پر ان جھاڑیوں کے درمیان چھپ کر گھات لگائی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت محسوس ہو رہی تھی کہ عورت گاؤں سے اتنی دور ویرانے میں بھلا کیا کرنے آئی تھی۔ شاید رفع حاجت کے لئے..... لیکن میں نے فوراً اس خیال کو مسترد کر دیا۔ ایک تو گاؤں سے اتنی دور اور پھر وہ بھی رات کے وقت رفع حاجت کے لئے یہ مقام نامناسب تھا۔ کسی ضروری کام کی نیت سے بھی اتنی دور آنا اور وہ بھی رات کے اس پہر جب آدم خور اپنی خونی سرگرمیوں میں مشغول ہو..... ناممکن تھا۔

اچانک میری نگاہ جھاڑیوں کے پاس پڑی اسفنج والی ایک گھسی ہوئی چیل پر پڑی۔ میں نے جوشی اٹھالی۔ گوپی میرے پیچھے کھڑا حیرت بھری نگاہوں سے میری حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میں نے جوتی اس کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

”اسے پہچان سکتے ہو؟ کس کی جوتی ہے؟ اتنا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جوتی گاؤں کے کسی فرد کی ہے اور ممکن ہے کہ اس کا تعلق مقتولہ کی لاش سے بھی کسی حد تک رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی شخص قتل کی واردات میں بھی ملوث رہا ہو۔“

”جناب ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں رات کے وقت گاؤں کا کوئی فرد موجود رہا ہوگا اور بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے اپنی جوتی یہاں

چھوڑ گیا ہوگا۔ لیکن قتل کی واردات سے اس کا کوئی تعلق نہیں..... لاش کو چیر پھاڑ کر دکھایا گیا ہے۔ اگر آپ تصور غور فکر کے ساتھ لاش کا معائنہ کریں تو آپ کو با آسانی یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ لاش کے جسم پر دانتوں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ یقیناً یہ نشانات سیاہ بھوت کے ہی ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی انسان اس طرح لاش کے ساتھ چیر پھاڑ نہیں کر سکتا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ لاش کے ادھر سے ہونے جسم پر دانتوں کے نشانات واضح تھے۔ لیکن یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ کس جانور کے دانتوں کے نشانات تھے۔ بہر حال میں نے گوپی کے ہمراہ گاؤں کا رخ کیا۔ عورت کا گھر گاؤں کے درمیان میں واقع تھا۔ مکان کی حالت بہت خستہ حال تھی۔ یہاں عورت اپنی بوڑھی ماں کے ہمراہ اکیلی رہتی تھی۔ مختصر سی تقیث کے دوران جو باتیں سامنے آئیں۔ ان کے مطابق عورت کی ڈیڑھ سال قبل شادی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی اسے شوہر کے ساتھ بن نہ سکی اور کچھ ہی دنوں میں طلاق ہو گئی۔ غلط غالباً شوہر کی رہی ہوگی۔ کیونکہ وہ اس طلاق پر پشیمان تھا۔ اور اکثر اپنی بوڑھی ساس کے گھر کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ اسے اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ کوئی بھی ایسا صل نکال کر اس کی بیوی کو مرنے کے بعد اس کے ہمراہ کر دے۔ میں نے عورت کے مکان کا پتہ لیا۔ جو کہ بوڑھی کے گھر کے قریب واقع تھا اور گوپی کے ہمراہ وہاں جا پہنچا۔ عورت کے بچے کا نام رکھو تھا۔ وہ میں پینتیس سال کا جوان تھا۔ مونچھوں کو تادو دے کر رکھتا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں اس کی درزی کی دکان تھی۔

میں نے آنے کا مدعا بیان کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ گزشتہ رات جب تمہاری بیوی پر حملہ ہوا۔ تب تم وہاں کیا کر رہے تھے۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات نمایاں ہوئے۔ اور وہ پریشان لہجے میں بولا۔

”میں اسے ایک سال قبل طلاق دے چکا ہوں۔

میرا اس کے ساتھ بھلا کیا واسطہ؟“

میں نے بات درمیان میں کاٹ دی اور میں نے اس دفعہ غصیلہ لہجے میں پوچھا۔ ”میں جو بات پوچھ رہا ہوں صرف اس کا جواب دو۔ بات کو کھمانے پھرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مکمل رات جاگے دوہہ پر تھے۔ اس بات کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔ مجھے صرف موجودگی کی وجہ دریافت کرنی ہے۔“

”مجھے کچھ معلوم نہیں.....“ وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ بولا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے گوپی کے ہاتھوں سے جنگل سے ملنے والی جوتی ہاتھ میں لی اور رگھو کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جوتی مجھے لاش کے قریب جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی ملی ہے۔ کیا اسے پہچانتے ہو؟“ رگھو کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات ابھرے اور لاشعوری طور پر اس کی نگاہ کمرے میں رکھی ہوئی چار پائی کے نیچے پڑی۔ جہاں ایسی ہی جوتی کا دوسرا جوڑا پڑا تھا۔ اور جسے میں کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھ چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر جوتی کو اٹھا لیا۔ رگھو پریشان نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے جوتی رگھو کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”یہ اسی جوتی کا جوڑا ہے۔ جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ ہمیں یہ جوتی جنگل میں لاش کے قریب پڑی ہوئی ملی ہے۔ اب سچ سچ بتاؤ کہ اس معاملہ کیا ہے؟ ورنہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

رگھو کے چہرے پر موجود پریشانی کے تاثرات نے انھیں زدہ لکیروں کی چھاپ کو نمایاں کیا۔ پھر اطمینان کی ہلکی سی لہر انھیں چلی گئی۔ جیسے وہ کسی اہم فیصلے پر پہنچنے کے بعد مطمئن ہو گیا ہو۔ اس دفعہ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

”میرا اس تمام معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں صرف اپنی طلاق شدہ بیوی کو مرنے کے لئے اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے بدظن ہو چکی تھی۔

اس لئے بات چیت سے بھی گریز کرتی تھی۔ واردات والی رات میں اسے زبردستی کھینچ کر گاؤں سے باہر لے گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں درندہ ہماری گھات میں چھپا بیٹھا ہے، اس نے اچانک ہی حملہ کر کے میری پتی کو گردن کے پاس سے پکڑا اور گھٹینا ہوا چٹسے کی جانب لے گیا۔ میں اٹنے قدموں گاؤں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔“

رگھو کے چہرے پر خوف کی دبیز چادر پھیلنے لگی تھی۔ وہ کھکھکاتے ہوئے اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ میں نے ہاتھ میں موجود جوتی کو چار پائی کے پاس پھینکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ شیر تھا..... یا بھر چیتا..... میرے خیال میں تم بخوبی جان گئے ہو کہ حملہ کرنے والے جانور کی جنس کیا تھی؟“

”وہ سیاہ بھوت تھا۔“ رگھو متزلزل لہجے میں بولا۔ ”رات کے سیاہ اندھیرے کی مانند سیاہ..... ناس کی کوئی آواز نہ تھی اور تابی کوئی جسامت تھی..... مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے میری پتی کو سیاہ اندھیرے نے نگل لیا ہو۔“ وہ ایک دفعہ پھر بات کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ میں نے حیران ہو کر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے گوپی کی جانب دیکھا۔ پھر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ تمہارے سامنے تمہاری بیوی کو اٹھا کر لے گیا۔ لیکن تم اسے لے جاتے ہوئے دیکھ نہیں سکے۔ کیا جسامت کے علاوہ تمہیں اس کی آواز سے بھی اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ جانور تھا یا بھر بھوت.....؟“

رگھو نے انکار میں سر ہلایا اور حتمی لہجے میں بولا۔ ”مجھے اپنی پتی کے چپٹے چلانے کی آواز کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دی وہ مکمل خاموشی کے ساتھ آیا اور واردات کرنے کے بعد خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔“

بات کچھ غیر معمولی سی تھی۔ اگر واردات کرنے والی جنس جانور کی تھی۔ تب حملہ کرنے کے دوران اس کے



منہ سے غراہٹ کی آواز کا نکلتا..... یا پھر دھاڑنا ضروری تھا۔ لیکن رگھو کا کہنا تھا کہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ خاموشی طاری رہی۔ عورت کا چیخنا چلانا فطری عمل تھا۔ اب یہی سوچا جاسکتا تھا کہ عورت کے چیخنے چلانے کی آواز میں حملہ کرنے والے جاندار کی آواز دب کر رہ گئی ہو۔ لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ جانور اور خاص طور پر شیر یا چیتا حملہ کرنے سے پہلے دھاڑ کر مقابلے کا اعلان کرنے کے بعد حملے کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ دھاڑ اتنی کمزور نہیں ہوتی۔ جو عورت کے چیخنے چلانے کی آواز میں دب کر رہ جائے۔ اب ایک ہی بات باقی پئی تھی۔ یہاں بھی شاید دیہاتیوں کی فطرت آڑے آئی ہوگی۔ معاملے کو پراسر ریت کا روپ دینے کے لئے وہ کچھ باتیں بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ جن میں سے ایک بات آواز والے معاملے کی پردہ پوشی تھی۔

میں تفتیش کے معاملے کو منقطع کر کے واپس ڈاک بنگلے میں چلا آیا۔ شام کو میں نے عورت کی لاش والی جگہ کا چکر لگایا۔ ارادہ یہ تھا کہ لاش کے قریب ترین درخت پر مچان لگا کر عفریت کا انتظار کیا جائے۔ لیکن مقصد میں ناکامی ہوئی۔ لاش کو جنگلی کتے اور گلو بگلو مکمل طور پر چٹ کر گئے تھے۔ اب وہاں مختصر بقایا جات کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اس لئے میں ڈاک بنگلے میں واپس چلا آیا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے مختصر سورتوں کا وظیفہ کیا۔ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے چاروں جانب پھوکی۔ پھر راتفل تھاے ڈاک بنگلے سے باہر نکل آیا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے جسم پر گرم کپڑوں کا فقدان تھا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسے کپڑوں کا انتخاب کیا تھا جو میری پھرتی میں مانع ثابت نہ ہو سکیں۔ مجھے حملہ آور سے بچنے اور جسم کو آزار دہانہ حرکت دینے کے لئے آرام دہ کپڑوں کی ضرورت تھی۔ بہر حال اب تک کی تفتیش کے مطابق میں اس نتیجے پر پہنچ پایا تھا کہ ان تمام وارداتوں میں کوئی جنگلی جانور ملوث تھا۔ شاید چیتا..... قصبے والوں نے اب تک جو واقعات بیان کئے

تھے۔ جنہیں میں تحریر کی طوالت کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر نہیں کر پایا۔ ان کے مطابق جانور نے اب تک جتنے بھی انسانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان میں اکثریت عورتوں کی تھی۔ یا پھر دس سے پندرہ سال کے بچوں کی تھی۔ طاقتور مردوں کو نقصان پہنچانے کے لئے جیتے جیسے پستلے دبلے جانور کو بہت سے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا۔ ان تکلیف دہ مراحل کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ ایسے انسانوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ جنہیں وہ با آسانی اٹھا کر لے جاسکے۔ یہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ شیر یا پھر چیتا آدم خور بحالت مجبوری بنتا ہے۔ زخمی ہونے کی صورت میں جب اس کے دانت یا پھر پنچے مجروح ہو جائیں۔ یا پھر اناڑی شکاریوں کی گولی کی صورت میں خون زیادہ بہہ جانے کی بدولت جانور کی طاقت زائل ہو جائے۔ علاوہ ازیں کوئی بھی جانور انسانوں کی رفاقت سے دور رہی رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ اگر شیر یا چیتے کے منہ کو انسانی خون لگ جائے۔ تب پھر وہ جانوروں کے شکار کو ترک کر دیتا ہے اور انسانوں کو شکار کرنے میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

میں نے قصبے کے ارد گرد چکر لگایا۔ پھر گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ رات بارہ بجے میں نے تھک ہار کر دوبارہ ڈاک بنگلے کا رخ کیا۔ گویا میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے چائے بنانے کا حکم دیا۔ اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے کی جانب چل دیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب میں چہرے کو تولیے کے ساتھ خشک کر رہا تھا۔ تب میں نے اچانک ہی کمرے کی ٹین کی چھپ پردھب کی آواز کے ساتھ کسی کے کودنے کی آوازیں۔ میں نے بڑبڑا کر تویہ ایک جانب رکھا اور پھرتی کے ساتھ غسل خانے کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن دروازہ مٹ سے مٹ نہ ہوا۔ میں نے دروازے کی کنڈی کی جانب دیکھا۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ شاید باہر سے دروازے کو لاک کر دیا گیا تھا۔ ایسا کوں کر سکتا تھا۔ اگر میں سوائے گویا اور میرے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اچانک غسل خانے کے باہر کھڑ پڑی آواز سنائی دی۔ پھر دھب کی آواز کے ساتھ کوئی مجھ میں کودا۔ غسل خانے کا

روشن دان صحن کی جانب کھلتا تھا۔ اس لئے مجھے صحن میں ہونے والی پیش رفت کی آوازیں بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ غسل خانے کے دروازے کی جانب کمرے میں کھڑ پڑی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ پھر اچانک ڈاک بنگلے کا ماحول گویا کے گلا پھاڑ کر چیخنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

میں نے گھبرا کر غسل خانے کے روشن دان کی جانب دیکھا آوازوں کا شور صحن سے آ رہا تھا۔ میں نے چھلانگ لگا کر روشن دان کو تھا اور واش ٹینن پر پاؤں رکھ کر جسم کو اوپر کی جانب کھینچنا شروع کر دیا۔ میرا چہرہ با آسانی روشن دان تک پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں چیخنے چلانے کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں دوبارہ خاموشی کا مہمبیر تسلط قائم تھا۔ صحن میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ لیکن وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ روشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس لئے تھوڑی سی کوشش کے بعد میں روشن دان کے ذریعے دوسری جانب کونے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لینے کے بجائے فوراً کمرے کا رخ کیا۔ میری رائفل کمرے کے درمیان میں فرش پر گر گئی ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ غسل خانے میں جانے سے پہلے میں نے اسے دیوار کے ساتھ لٹکا رکھا تھا۔

سوچتے سمجھتے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ رائفل اٹھائی اور دوبارہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ باورچی خانہ برآمدے کے آخری سرے پر تھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور برآمدے کے کپے فرش پر خون کے چھینٹے بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا جیسے وہاں کسی جانور کی گردن پر چھری پھیری گئی ہو۔ برآمدے سے آگے صحن کا فرش پکا تھا۔ میں نے کپے فرش کا معائنہ کیا۔ لیکن وہاں کسی بھی جانور کے قدموں کے نشانات مفقود تھے۔ میرے اور گویا کے قدموں کے نشانات نمایاں تھے۔ اور بھی کچھ انسانی قدموں کے نشانات موجود تھے۔ لیکن میرے خیال کے مطابق وہ گاؤں والوں کے تھے۔ مجھے اپنے جسم میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ میری سوچ کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ قدموں کے نشانات کی عدم

موجودگی اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ ان سب کارستانیوں کے پیچھے کسی جانور کے بجائے سیاہ بھوت کا ہاتھ موجود ہے۔

میں نے جھٹکے کے ساتھ صحن کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہاں گپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے پاس پہنچ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دھکا دیا۔ تب کھلتا چلا گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ لیکن مجھے جہاں تک یاد پڑتا تھا۔ میں نے کمرے میں سے باہر نکلتے ہوئے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

بہر حال سوچنے کا سلسلہ منقطع کر کے میں نے ایک سائینڈ پر موجود الماری کے اوپر سے ٹارچ اٹھائی اور دوبارہ گھر سے باہر نکل آیا۔ ٹارچ کی محدود روشنی میں..... میں نے ڈاک بنگلے کے ارد گرد کچی زمین کا معائنہ کیا۔ وہاں نہ صرف خون کے چھینٹوں کے نشانات موجود تھے بلکہ کسی جانور کے تازہ قدموں کے نشانات بھی نمایاں تھے۔ میں نے حیرت اور جوش کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ قدموں کا معائنہ شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں..... میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نشانات تیندوے کے تھے۔ تیندوے نے پہاڑی شیر بھی کھا جاتا تھا۔ جسامت میں عام شیر کی نسبت کچھ چھوٹا ہوتا ہے اور شکل و صورت میں گھریلو بلی سے مشابہت رکھتا ہے۔ قدموں کے نشانات کا رخ ڈاک بنگلے کے پیچھے موجود پہاڑیوں کی جانب تھا۔ لیکن حیرانگی کی بات یہی تھی کہ تیندوے کے فرار ہونے کے نشانات موجود تھے۔ لیکن ڈاک بنگلے کی جانب آنے کے نشانات موجود نہیں تھے۔

تھوڑی سی غور و فکر کے بعد میں نے اس معمر کو بھی حل کر لیا۔ وہ ڈاک بنگلے سے متصل پہاڑی سے کود کر ڈاک بنگلے کی چھت پر آیا تھا۔ اس کے چھت پر کودنے کی آواز میں نے کئی تھی۔ چھت سے وہ برآمدے کی چھت پر آیا۔ وہاں سے صحن میں کودنے کے بجائے وہ برآمدے کی دیوار سے ہوتا ہوا برآمدے کے کپے فرش پر کود گیا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے صحن کے کپے فرش پر تیندوے کے قدموں



کے نشانات نہیں ملے تھے۔ اس نے برآمدے میں کودنے کے بعد باورچی خانے میں سے باہر نکلتے ہوئے بد نصیب گوبی کو گردن کے پاس سے دیوچا۔ اور اسے جیتنے چلانے کا موقع دینے بغیر دیوار پھلانگ کر ڈاک بنگلے سے باہر لے گیا۔ منجی اندام گوبی کے ہمراہ دیوار کو پھلانگنا اس کے لئے چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔ میں نے قدموں کے نشانات پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ کچی زمین پر قدموں کے نشانات نمایاں تھے۔ لیکن گھاس کے شروع ہوتے ہی مفقود ہو گئے۔ خون کے چھینے بہر حال اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ تین دو پتھر لی پہاڑیوں کی جانب گیا ہے۔ اندھیرے کی سیاہ چادر کے درمیان صرف نارنج کی محدود روشنی میں ان نشانات پر آگے بڑھنا مشکل تھا۔ اس لئے میں نے دوبارہ ڈاک بنگلے کا رخ کرنے میں بہتری جانی۔

گوبی کو بچانا اب میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ یقیناً تیندوے نے اسے گردن سے دیوچا ہوگا۔ اور گوبی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا ہوگا۔ ابھی میں نے ڈاک بنگلے کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میں نے ڈاک بنگلے کی چھت پر سیاہ سائے کو ڈاک بنگلے سے متصل پہاڑیوں کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ کاندھے پر لنگی ہوئی بندوق کو نیچے اتارا۔ پھر نارنج کو زمین پر رکھ کر بندوق کو کاندھے کے ساتھ لگا کر اندھیرے میں اندھا دھند فائر کر دیا۔ لیکن نارنج کو زمین پر رکھنے کے بعد گھب اندھیرے کی بدولت صرف اندازے پر نشانہ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ اس لئے میرے خیال کے مطابق فائر نشانی نہیں لگ سکا۔ میں نے نارنج کو اٹھا کر چھت کی جانب روشنی پھینکی اس دفعہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کیا وہ سیاہ بھوت تھا؟ اگر وہ سیاہ بھوت تھا۔ تب پھر گوبی کو کون اٹھا کر لے گیا تھا؟ اور اگر وہ سیاہ بھوت کا نہیں تھا۔ تب پھر وہ کون تھا؟ مختلف سوالات میرے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ میں نے بندوق کاندھے کے ساتھ لٹکانی اور نارنج کو سنبھالے ڈاک بنگلے کی جانب چلا آیا۔ میرا ارادہ چھت

کا معائنہ کرنے کا تھا۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ اخروٹ کا درخت لگا ہوا تھا۔ اس لئے مجھے چھت پر چڑھنے میں مشکل درپیش نہیں آئی۔ میں نے بندوق کو سنبھالا اور نارنج کی روشنی میں چھت کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سائے کو گوبی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ یا پھر اگر لنگی تھی تو سیاہ بھوت کو بھلا بارود سے بھری گوبی کیا نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ چھت پر مٹی کی دبیز تہہ کے اوپر تیندوے کے قدموں کے نشانات کے علاوہ کسی انسان کے قدموں کے نشانات بھی موجود تھے۔ میں نے نشانات کا بغور جائزہ لیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ بنگلے پاؤں تھا۔ اس نے جو تے نہیں پہن کر رکھے تھے۔ پیروں کا سا سزنا مل تھا۔ لیکن سیدھے پاؤں کا آگٹھا جڑ کے پاس سے کٹا ہوا تھا۔ یعنی اس کی سیدھے پاؤں کی چار انگلیاں تھیں۔

مجھے اپنے جسم میں مسرت کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ میں ایک اچھا اور جاندار ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب چھت پر مزید تفتیش کرنا فضول تھا۔ اس لئے میں درخت کے ذریعے واپس صحن میں کوکر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ برآمدے میں خون کے علاوہ چائے کی کرسیاں بھی بھری پڑی تھیں۔ میں نے پہلے پانی کے ذریعے خون کے نشانات کو صاف کیا۔ پھر چائے بنا کر اپنے کمرے میں بستر پر آ بیٹھا۔ میرا دماغ کسی حد تک معاملے کو جانچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اور اب میرے خیال میں سیاہ بھوت کی کہانی جھوٹ پر مبنی تھی۔ یہ ایک ایسی افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ گاؤں کے کچھ افراد شاید اپنے مفاد کی خاطر ایسی افواہ پھیلانے کا باعث بن رہے تھے۔ لیکن ان افواہوں کے علاوہ جنگل کا تیندو ابھی وارداتوں میں ملوث تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ یہ جاننے کے لئے مجھے تفتیش کے آخری لمحات کا انتظار کرنا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے وضو کیا۔ نماز پڑھ کر قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف ہو گیا۔ صبح گوبی کے سیاہ بھوت کی جھینٹ چڑھنے کی خبر

جنگل کی آگ کی طرح تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ قصبے والے جوق در جوق ڈاک بنگلے کا رخ کرنے لگے۔ لیکن ان میں ایسا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ جس کے پاؤں کا آگٹھا موجود نہ ہو۔ میں نے گاؤں کے کھیا کو بلایا۔ اور کسی ایسے قصبے والے کے متعلق دریافت کیا۔ جس کے پاؤں کی انگلیاں کم ہوں۔ کھیانے کا علمی کا اظہار کیا۔ تب میں نے اسے ہمراہ لیا۔ اور تیندوے کے شکار کردہ گوبی کے خون کے دھبوں کا تعاقب کرتے ہوئے ڈاک بنگلے کی پشت پر واقع پہاڑیوں کا رخ کیا۔

کھیا کا نام عجیب تھا۔ وہ ایک کم گاور عیار فطرت کا مالک بیٹا نہیں اور پچاس کے لپیٹے کے درمیان کا شخص تھا۔ میری مختصر پوچھ گچھ کے دوران اس نے صرف ہوں ہاں میں جواب دینے کے علاوہ کسی بھی قسم کی بات چیت سے مکمل پرہیز کیا۔ مجھے یقین تھا کہ چار انگلیوں والے انسان کے متعلق بھی اس نے پردہ پوشی کی ہوگی۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ چار انگلیوں والے انسان کو ضرور تلاش کروں گا۔ پتھروں پر خون کے نشانات تلاش کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اور ہم پتھر لی پہاڑیوں پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ پہاڑیوں پر کم و بیش تین فرلانگ کے فاصلے طے کرنے کے بعد ایک پہاڑی کھائی میں اتر کر تیندوے نے لاش کا تقریباً آدھے سے زیادہ حصہ ہڑپ کیا تھا۔ باقی ماندہ کو جنگلی جھاڑیوں میں ڈھانپ کر اگلے طعام کے لئے چھوڑ دیا۔ لیکن گدھ اور لگو بگز لاش تقریباً ہضم کر گئے تھے۔ اس لئے وہاں اب سوائے ہڈیوں کے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ چان پاندھ کر تیندوے کا انتظار کرنا فضول تھا۔ پتھر لی زمین پر پاؤں کے نشانات بھی مفقود تھے۔ اس لئے میں نے کچھ آگے تک پہاڑی کا معائنہ کیا۔ خیال یہی رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ تیندوے کی رہائش گاہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

لیکن مقدمہ میں ناکامی کے بعد عجیبیت کے ہمراہ واپس گاؤں چلا آیا۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے کھانا کھایا۔ پھر ڈاک بنگلے سے باہر نکل آیا۔ ڈاک بنگلے کے باہر عجیبیت کے ہمراہ بیس پچیس سال کے ایک نوجوان

لڑکے کو اپنا منتظر پایا۔ لڑکے کا نام رامو تھا۔ اور گوبی کے مرنے کے بعد اسے کھانا پکانے کے کام پر معذور کر دیا گیا تھا۔ وہ گوبی کا رشتہ دار تھا۔ بہر کیف میں نے لڑکے کو کام کے متعلق بتایا۔ اور خود عجیبیت کے ہمراہ گاؤں کے کچے مکانات کی جانب چل دیا۔ عصر کی نماز کے بعد چار انگلیوں والے انسان کی تلاش شروع ہوئی۔ یہ ایک تکلیف دہ اور صبر آزماء عمل تھا۔ عجیبیت حیرت کا باعث بنا میری کارروائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

تلاش کا سلسلہ رات دس بجے تک جاری رہا۔ اس دوران میں نے عشاء کی نماز ادا کی۔ اور دوبارہ ایک ایک گاؤں والوں کو چیک کیا۔ لیکن تمام گاؤں میں چار انگلیوں والا انسان موجود نہیں تھا۔ میں مقصد میں ناکام ہونے کے بعد واپس ڈاک بنگلے میں چلا آیا۔ رامو کھانا کھانے کے لئے میرا منتظر تھا۔ میں نے کھانا کھایا اور مختلف سورتوں کا وظیفہ کرنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تیندوے آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور میرا دماغ مختلف سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ چار انگلیوں والے انسان کے نہ ملنے کا عقدہ حل نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عجیبیت اسے گاؤں سے باہر بھیج چکا ہو۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر کیا.....

تیندوے کے علاوہ اس تمام کارروائیوں میں سیاہ بھوت کا بھی عمل دخل رہا تھا۔ اور اگر ایسا تھا تب پھر مجھے دو محاذوں پر جنگ لڑنے کے لئے تیاری کر لینی چاہئے تھی۔ رات کے نہ جانے کس پہر مجھے نیند آئی۔ معلوم نہیں ہو پایا۔

دوسرے دن رامو کی زبانی مجھے یہ روح فرسا خبر معلوم ہوئی کہ آدھ خور تیندوے کو اسکول کی عمارت میں قید کر لیا گیا ہے۔ میں نے ہڑ بڑا کر رامو کی جانب دیکھا۔ اور پریشان لہجے میں پوچھا۔

”اسکول خالی ہے یا پھر یہ بھی اندر ہیں۔“

صاحب..... بچے اسکول کے اندر ہی ہیں.....“

میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی رائفل اٹھائی اور رامو کے ہمراہ اسکول کی عمارت کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ گاؤں کے اسکول کی عمارت حال ہی میں پہاڑی نیلے کو صاف



کر کے بنائی گئی تھی۔ عمارت کچی تھی۔ اور بچوں کی تعداد کم و بیش چالیس پچاس کے قریب تھی، اور گرد گاون کے بچے بھی یہاں پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ اگر رامو کا کہنا درست تھا اور آدم خور دیوار کو پھلانگ کر عمارت میں داخل ہو چکا تھا۔ تب پھر..... اس سے آگے سوچتے ہوئے مجھ پر کچکی طاری ہونے لگی۔

میں نے سر کو جھٹک کر اپنی رفتار تیز کر دی۔ مجھے اسکول کی عمارت تک پہنچنے میں پانچ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اسکول کی عمارت سے کچھ ہٹ کر گاؤں والوں کی کافی سے زیادہ تعداد موجود تھی۔ ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی۔ جن کے بچے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ان میں بھی عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اور وہ پریشان لگا ہوں سے اسکول کی عمارت کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مجھے آتا دیکھ کر جمع جھٹنے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسکول کی عمارت کا جائزہ لیا۔ وہاں حیرت انگیز طور پر خاموشی طاری تھی۔ یہ ایک ناممکن بات تھی۔ اسکول کی عمارت جہاں بچوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ پہاڑی شیر کی موجودگی میں چیخ و پکار کا وہ عالم ہونا چاہئے تھا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔ لیکن غیر معمولی طور پر ایسا نہیں تھا۔ ماحول پر پراسرار قسم کی خاموشی طاری تھی۔ کیا یہاں بھی سیاہ بھوت کا عمل دخل تھا۔ میں نے سر کو جھٹک کر فرسودہ خیالات کو نظر انداز کیا۔ اور چھلانگ لگا کر اسکول کی مختصر دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ وسیع و عریض صحن سامنے موجود تھا۔ وہاں بھی دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ بچوں کا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا۔ میں نے عمارت سے کچھ دور کھڑے ہوئے افراد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بچے اسکول کی عمارت کے اندر ہی ہیں؟“ انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”لیکن اب یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ عمارت خالی پڑی ہے۔“ انہوں نے کاندھے اچکاتے ہوئے علمی کا اظہار کیا۔ تب میں باآہستگی رائل کو کاندھے سے لٹکائے اسکول کے کچے صحن میں کود گیا۔

زمین پر پاؤں رکھتے ہی میں نے رائل کاندھے سے اتاری اور اس کا رخ عمارت کے اندر کمروں کی جانب کر دیا۔ پھر میں نے تفصیلی نگاہوں سے عمارت کا جائزہ لیا۔ میرے سیدھے ہاتھ کی جانب مختصر کرہ شاید ٹوائلٹ تھا۔ اس کے سامنے وسیع و عریض کنواں بنا ہوا تھا۔ جس کے اوپر کھڑکی کا بہت بڑا ڈھکنا نصب تھا۔ صحن کے درمیان میں شہوت کا بہت بڑا درخت لگا ہوا تھا جس کی ٹہنیاں کنوئیں کے اوپر سایہ فگن تھیں..... کمروں کے سامنے طویل برآمدہ بنا ہوا تھا جبکہ کمروں اور برآمدے سے کچھ ہٹ کر پریل کا کمرہ نمایاں تھا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا اور کھڑکی لگی ہوئی تھی۔

بہر حال میں نے نمل احتیاط کے ساتھ برآمدے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ تین دو اگر عمارت کے اندر موجود تھا۔ تب اسے یقیناً کسی کمرے کے اندر موجود ہونا چاہئے تھا۔ پریل کے کمرے کو کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ اور ٹوائلٹ کا دروازہ بھی باہر سے بند تھا۔ ان دونوں کمروں میں سیاہ بھوت کا چھپنا ناممکن نہیں تھا۔ اس لئے میں نے برآمدہ عبور کیا اور سامنے نظر آتے ہوئے آٹھ کمروں کے کھلے ہوئے دروازوں کی جانب چل دیا۔ دروازوں کے ساتھ کمروں کی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ دروازے کے راستے اندر جھانکنے میں یہ قیامت تھی کہ جانور سیاہ بھوت اچانک حملہ کر سکتا تھا۔ اور میرے پاس چھپنے کی جگہ مفقود ہوتی۔ حملہ آئے سامنے ہوتا۔ اور یقیناً جانور یا بھوت جو بھی وہ تھا۔ اس کا پلہ ہماری ہوتا۔ کھڑکی کے راستے جھانکنے میں کھڑکی اور دیوار کی آڑ اسے کھل کر حملہ کرنے سے باز رکھتی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ کھڑکی کے بند شیشوں سے کمرے میں جھانکا۔ کمرہ خالی تھا۔ میں نے باآہستگی قدم دوسرے کمرے کی جانب بڑھا دیے۔ کھڑکی سے اندر جھانکنے پر میں نے وہاں بھی کمرے کو خالی پایا۔ اگلے مزید تین کمرے بھی ہر قسم کے زندہ وجود سے عاری تھے۔ سامنے تین کمرے باقی بچے تھے۔ میں ابھی ان کمروں کی جانب قدم بڑھانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے بڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم

جہاں تھے وہیں زمین میں پیوست ہو گئے۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے سانس روک لیا۔ میں نے سانس کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آواز یک دم رک گئی۔

میں جہاں تھا وہیں ساکت کھڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا آواز دوبارہ آئے گی۔ میں نے کان کھڑے رکھے۔ اس دفعہ کسی بچے کی ہچکیاں لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔ آواز کمروں سے ہٹ کر کنوئیں کی جانب سے آتی محسوس ہوئی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ مڑ کر کنوئیں کی جانب دیکھا۔ کیا وہاں کوئی موجود تھا؟

ابھی میں مزید سوچتے نہیں پایا تھا کہ ایک دفعہ پھر بڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دوبارہ سمت کا تعین کیا۔ حیرت انگیز طور پر اس دفعہ سمت مختلف تھی۔ اور جگہ میرے اندازے کے مطابق پریل کا کمرہ تھا۔ جس کی کھڑکی باہر سے بند تھی۔ سوچتے جھٹکے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے میں محتاط قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب چل دیا۔ پریل کے کمرے کی کھڑکی دوسری جانب اسکول سے باہر کی جانب کھلتی تھی۔ لیکن دروازے کے اوپر روشن دان موجود تھا۔ جس تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ کھڑکی کا تھا اور اس کی کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ بند کمرے میں داخل ہونا کسی جانور کے لئے ممکن نہیں تھا۔

لیکن سیاہ بھوت سب کچھ کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ پھر بڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کان دروازے کے ساتھ لگا دیے۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اندر کوئی جانور موجود تھا۔ کمرہ اس کی اطمینان بخش غراہٹ سے گونج رہا تھا۔ اور گوشت نوچنے کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے سوچتے جھٹکے کی حس مفقود ہوتی چلی گئی اور میں نے جھلا کر دروازے پر لات رسید کر دی۔ کمرے میں ایک دم خاموشی طاری ہوئی چلی گئی۔ اور پھر خفیف غراہٹ کی آواز ابھری۔ جو یقیناً تین دو کی تھی۔

میرے دماغ پر موجود توہمات کی دیر ہوتی ہوئی تہہ کم ہونے لگی۔ میں نے رائل کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور دیوار پھاندا کر اسکول کی عمارت سے باہر نکلتا چلا آیا۔

گاؤں والے باہر میرے منتظر تھے۔ گنجیت ہاتھوں میں کپھاڑی تھامے سب سے آگے کھڑا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے حالات سے آگاہ کیا۔ تب اس نے ایک سائیز پر کھڑے ہوئے ایک پندرہ سالہ لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آدم خور کو کمرے میں بند کرنے کا کارنامہ اس لڑکے کا ہے۔“ میں نے چونکتے ہوئے لڑکے کی جانب دیکھا۔ پتلا دبلا سانولے رنگ کا لڑکا..... اس کے سر پر بال برائے نام تھے.....

”کیا نام ہے اس کا.....؟“ میں نے گنجیت سے پوچھا۔

”سر بالا.....“ اس نے جواب دیا۔ ”اسکول میں ہی پڑھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب آدم خور نے چینیو پر حملہ کیا..... تب یہ شہوت کے درخت پر چڑھا شہوت کھانے میں مصروف تھا۔ چینیو اسکول کے چڑاسی کا نام ہے۔ آدم خور نے چینیو کو کمر کی جانب سے پکڑنے کی کوشش کی۔ چینیو دھکا لگنے کی بدولت پریل کے کمرے کے اندر جا کر آدم خور نے کمرے میں داخل ہو کر اسے مار دیا۔ پھر وہیں بیٹھ کر اسے کھانے لگا۔ لڑکا شہوت کے درخت سے نیچے اترا اور اس نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر پریل کے کمرے کے دروازے کو بند کر کے کھڑکی لگا دی۔ پھر دیوار پلاٹنگ کر گاؤں کی جانب بھاگ گیا۔“ گنجیت خاموش ہو گیا۔

میں نے لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”اسکول کے باقی بچے کہاں ہیں؟ اسکول کی عمارت تو خالی پڑی ہے۔“

لڑکا مسکراتے ہوئے بولا۔ ”وہ سب کے سب آدم خور کے حملے سے گھبرا کر کنوئیں میں چھلانگ لگانے لگے۔ کنواں زیادہ گہرا نہیں۔ ویسے بھی کنواں بالکل خشک ہے میں نے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کو باہر سے بند کرنے سے پہلے کنوئیں پر موجود کھڑکی کا ڈھکن بند کر دیا۔“

مجھے اپنا سانس سینے میں رکھا ہوا محسوس ہوا۔ اور میں نے پڑ بڑا کر پوچھا۔



”لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”ایسا کنواں جس کا منہ اوپر سے بند ہو۔ اس میں زہریلی گیس وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ لڑکوں کو نقصان نہ پہنچا دے۔“ لڑکا پریشان لہجے میں بولا۔

میرے خیال کے مطابق آدم خور دروازے کو تھوڑی سی کوشش سے توڑ سکتا تھا۔ باہر نکلے ہی وہ بچوں کو نقصان پہنچاتا۔ اس لئے میں نے تہہ خانے کے دھکنے کو بند کر کے انہیں محفوظ کر دیا۔

اس کی منطق کو سمجھنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ وقت بھی کم تھا۔ میں نے اسکول کی عمارت کا باہر سے جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی کھڑکی موجود تھی۔ جو کہ اندر سے مقفل تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کسی بھی قسم کا کوئی راستہ موجود نہیں تھا۔ بند کمرے کے اندر جانور کا شکار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر روشن دان موجود ہوتا تب میڑھی کے ذریعے روشن دان تک پہنچنے کے بعد جانور پر فائر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہاں حالات مختلف تھے۔ روشن دان تو درکنار کھڑکی کے آگے بھی دبیز پردے لگا کر جھانکنے کے راستے کو بھی مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

میں نے گاؤں والوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی چھت پر چڑھ کر بیٹھتا ہوں۔ تب سب لڑکے کھڑکیوں کے ذریعے کمرے کی کھڑکی کو توڑ دو۔ میرا ارادہ کچھ یوں ہے۔ کہ کھڑکی ٹوٹنے کے فوراً بعد جانور ہڑبڑا کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ اور میں چھت پر سے با آسانی اسے گولی کا نشانہ بنالوں گا۔ گاؤں والوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ترکیب پر عمل شروع ہوا۔ میں چھت پر چڑھ کر کھڑکی کے عین اوپر بیٹھ گیا۔ گاؤں والوں نے بڑے بڑے پتھر جمع کرنا شروع کئے۔ اور محفوظ مقامات پر کھڑے ہو کر کھڑکی پر برسنا شروع کر دیئے۔

میں آج بھی جب اس حقیقت پر مبنی تدبیر کے متعلق سوچتا ہوں۔ تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے جانور کو جو مکمل انہماک کے ساتھ پیٹ

بھرنے میں مصروف عمل ہو۔ اسے چھیڑنا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں ہے۔ بجائے اس کے پتھر مار کر اسے تنگ بھی کیا جائے۔ وہ طیش میں آ کر گاؤں کے کسی بھی فرد پر حملہ کر سکتا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ایسا ہوا نہیں..... کیونکہ پتھروں کی ڈالہ باری ہونے کے بعد تین دو گھبرا گیا۔ اور کھڑکی کے راستے فرار ہونے کے بجائے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کا دروازہ توڑ کر باہر نکلا۔

یہاں میں یہ بھی بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آدم خور جانور عموماً شیر یا چیتا اور تین دو آدم خور ہونے کے بعد فطرنا بزدل ہو جاتے ہیں۔ انہیں غیر معمولی حالات کی بدولت اپنی اس روش کو منقطع کرنا پڑتا ہے۔ جس پر وہ بچپن سے چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ روش بدلنے کی مجبوری کو وہ یقیناً گناہ سے تشبیہ دیتے ہیں اس لئے بھوک کی صورت کے علاوہ انسانوں کا سامنا کرنے سے استرا کرتے ہیں۔ حالات کی غیر معمولی کردٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے تین دو نے فرار ہونے کے لئے اس راستے کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ جہاں اس کے خیال کے مطابق انسانوں کی زیادہ تعداد موجود تھی۔ اس کے بجائے اس نے اس راستے کا انتخاب کیا۔ جسے میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

دروازہ دھماکے کے ساتھ باہر گرنے کی آواز کو سن کر میں نے ہڑبڑا کر صحن کی جانب رخ کیا۔ تب میں نے اسے بجلی کی مانند شہوت کے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اف میرے خدا!..... میں نے غیر معمولی طور پر اتنا بڑا تین دو اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا رنگ کالی رات کی مانند سیاہ تھا اور سرخ زبان خون سے لہری ہوئی تھی۔

میں نے پھرتی کے ساتھ رائفل کو کاغذ سے لٹکا لیا۔ شہت باندھی اور فائر کر دیا۔ ماحول فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے نشانہ تین دو کی کمرے کے پاس موجود بڑھکی ہڈی کے مہرہ کی کالیا تھیں لیکن اندازے کی غلطی..... پھر شاید تین دو کی طوفانی رفتار کی بدولت نشانہ چوک گیا۔ گولی اس کی پچھلی ٹانگوں پر لگی اور وہ دھب کی آواز کے ساتھ شاخوں کے درمیان میں سے ہوتا محض

کے درمیان میں آگرا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ دوبارہ نشانہ باندھا۔ میری رائفل میں دو کا تو س بیک وقت کام کر سکتے ہیں۔ اس لئے نشانہ باندھنے میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن زمین پر گرتے ہی تین دو پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گولی کی رفتار کے ساتھ اسکول کی بیرونی دیوار کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک ہی چھلانگ میں وہ مجھے اسکول کی دیوار پر دکھائی دیا۔ اس دفعہ اس کا پیٹ والا حصہ بالکل میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

میں نے مکمل احتیاط کے ساتھ نشانہ باندھ کر فائر کر دیا۔ دوسرے فائر کے دھماکے کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ اور تین دو کا تو س گلنے کی شدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے اچھل کر دیوار کی دوسری جانب جاگرا۔

میں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ اور دیوار سے نیچے کو در اسکول کے گیٹ کی جانب موجود دیوار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ گاؤں والے دور کھڑے تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ آگے بڑھنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ بہر حال گیٹ کے پاس دیوار کے سامنے خون تو کافی مقدار میں موجود تھا۔ لیکن تین دو اگدھے کے سر سے سینک کی مانند غائب تھا۔ پتھر ملی زمین کا جائزہ لینے پر پاؤں کے نشانات مفقود پائے۔ لیکن خون کی موتی دھارا ٹیلے سے نیچے جاتی دکھائی دی۔ سمت کا تعین کرنا مشکل نہیں تھا۔ منزل ڈاک بنگلے کے پیچھے موجود پہاڑی علاقہ تھا۔ نشانات کا تعاقب کرنا حماقت سے عاری نہ تھا۔ ایک ایسے آدم خور کا تعاقب کرنا جو زخمی ہو۔ خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جانور کی جھنجھلاہٹ زخم سے خون بہنے کی بدولت اپنے عروج پر ہوئی ہے۔ اور وہ ایسے عالم میں خطرناک ہونے کے علاوہ ہر قسم کے انتہائی اقدام کے لئے بھی تیار ہوتا ہے۔ زخم سے خون کی کافی مقدار ضائع ہونے کے بعد ایک تو اس کی پھرتی زائل ہو جاتی ہے۔ یوں وہ اپنے آپ کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بعد صرف غرانے کے علاوہ حملہ کرنے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر انتظار کرنے میں مضائقہ نہیں ہوتا۔ اس لئے میں تعاقب کا ارادہ ملتوی کرنے کے بعد واپس گاؤں والوں کی جانب

چلا آیا۔ وہ میرے منتظر تھے۔ میں نے انہیں ہمراہ لیا اور اسکول کا گیٹ کھول کر شہوت کے درخت کے نیچے واقع کنوئیں کا جائزہ لینا شروع کیا۔

کنوئیں کا دہانہ بے حد وسیع و عریض تھا۔ جسے لکڑی کے مضبوط تختوں کے ساتھ مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا تاکہ اسکول کے بچے محفوظ رہ سکیں۔ تختے کے ایک سائید پر دروازہ بنا ہوا تھا۔ جسے باہر سے لکڑی لگا دی گئی تھی۔ کنوئیں کے پاس کچی زمین کچڑ کے تالاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہاں بچے تختیاں دھرتے تھے۔ میں نے لکڑی کے دروازے کی لکڑی کو کھولا اور اندر جھانکا۔ دروازے کے کھلنے کی آواز سنتے ہی کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ پھر متعدد بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں باہر آنے لگیں۔ دروازے کے پاس چرچی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لوہے کی میڑھیاں نیچے کی جانب جاری تھیں۔ میں نے گاؤں والوں کو اشارہ کیا کہ وہ نیچے اتر کر بچوں کو کنوئیں سے باہر نکالیں۔ پھر خود ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی جانب چل دیا۔

دروازہ کمرے سے کچھ دور گرا ہوا تھا۔ اس کے قبضے اکھڑ گئے تھے۔ کمرے کے درمیان میں ادھ کھائی لاش موجود تھی۔ میں نے لاش کا معائنہ کیا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ لاش کے پاؤں کی انگلیوں کی تعداد چار تھی۔ یقیناً وہ وہی آدمی تھا۔ جس کے قدموں کے نشانات میرے ڈاک بنگلے کی چھت پر پائے گئے تھے اور جسے میں گاؤں میں تلاش کرتا رہا تھا۔ وہ یہاں چھپا بیٹھا تھا۔ اس کی پوشیدگی میں کچھ نہ کچھ ہاتھ بجیت کا بھی ہوگا۔ تفصیلی پوچھ کچھ کا فیصلہ بعد پر چھوڑ کر میں باہر کی جانب چل دیا۔ کنوئیں میں سے بچوں کو باہر نکالا جا رہا تھا۔ ان میں سے کچھ بچوں کی حالت خراب تھی۔ لیکن زیادہ تر قابل اطمینان حالت میں تھے۔ بچوں کی قسمت اچھی تھی۔ کہ کنواں خشک ہو گیا تھا اور اسے مزید کھودنے کا عمل شروع نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور بجیت کے ہمراہ اسکول کی عمارت سے باہر کی جانب چل دیا۔

صبح بارہ بجے کے قریب میں نے قصبے سے کچھ



ہٹ کر پتھر ملی پہاڑیوں کے اوپر جاتے ہوئے خون کے نشانات کا تعاقب شروع کیا۔ پہاڑی زیادہ دشوار گزار نہیں تھی۔ موسم صاف اور خوشگوار تھا۔ ہر سمت خاموشی طاری تھی۔ عجیبیت میرے ہمراہ تھا۔ گاؤں کے مزید افراد بھی ساتھ آ جا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے انہیں منع کر دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم نشانات کے تعاقب کی بدولت ایک ایسے درے میں داخل ہوئے جس کا میاب ہو گئے۔ جو بل کھاتا ہوا اوپر کی جانب جاتا تھا۔ درے کے دونوں سرے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور بعض مقامات پر دھوپ کی روشنی نیچے نہیں پاری تھی۔ میں نے عجیبیت کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور خود بندوق کو تھامے درے کے اندر کی جانب چل دیا۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد درے نے بل کھایا اور پہاڑ کے اوپر کی جانب سفر شروع کیا۔ نشانات بتدریج کم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن پھر بھی تیندوے کی موجودگی کا سراغ نمایاں کر رہے تھے۔ یقیناً زخموں میں سے بہتے ہوئے خون کی مقدار کم ہونے کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ زخم زیادہ مہلک نہیں ہوگا۔ میں نے احتیاط کے تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے راکفل کو کاندھے سے لگایا اور کسی چاک و چوبند فوجی کی مانند احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن کچھ آگے جانے کے بعد نشانات غائب ہوتے چلے گئے۔

میں نے حیران ہو کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہاں قد آدم خشک جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ دونوں اطراف کی اونچی اونچی دیواریں مکمل طور پر سپاٹ اور پتھر ملی تھیں۔ جن پر چڑھنا کسی انسان یا جانور کے لئے ممکن نہیں تھا۔ سامنے کی جانب سے درہ دوبارہ ٹھوٹا ہوا دکھائی دیا۔ میں سر کو جھٹک کر آگے کی جانب چل دیا۔ درے کے مڑتے ہی مجھے سامنے پتھر ملی دیوار اوپر آسمان کی جانب اٹھتی دکھائی دی۔ راستہ یکثرت بند ہو گیا۔ میں نے طویل سانس لیا۔ اور دوبارہ اس جگہ چلا آیا۔ جہاں خون کے نشانات ختم ہوئے تھے۔ یہ بات کفرم سمی کہ تیندو وہاں تک آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر زخموں سے خون بند ہونے کے بعد اس نے اپنی منتخب کردہ جگہ کا رخ کیا ہوگا۔ مجھے اس جگہ کو تلاش کرنا

تھا۔ میں نے دوبارہ ارد گرد کھڑی اونچی درے کی دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار سیدھی اور پتھر ملی تھی۔ جہاں چھپنے کے لئے کسی بھی قسم کا غارتو دور کی بات چوبے کے گھسنے کے لئے سوراخ بھی موجود نہیں تھا۔ ہر جانب عجیبی غمورت کا عالم طاری تھا۔

میں پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں کہ درے میں خشک جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ شاید وہ جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو۔ اس لئے میں نے اسے جھاڑیوں کے درمیان تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مجھے چند منٹ کا وقت درکار تھا۔ لیکن قد آدم جھاڑیوں کی بہتات کی بدولت آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت محسوس ہوئی کہ جھاڑیوں میں کسی بھی قسم کے جانور کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ پھر تیندوے کو آسمان کھا گیا۔ با پھر زمین نکل گئی۔ اس حادے سے میرے دماغ میں جنگی کوندی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جھاڑیوں کے درمیان کوئی ایسا غار پوشیدہ ہو۔ جس کا دہانہ جھاڑیوں کے اندر ڈھک گیا ہو۔ ایسی صورت میں اسے تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لاحاصل..... مجھے ناکامی ہوئی۔ اب ایک آخری تدبیر میرے دماغ میں باقی بچی تھی کہ میں جیب میں سے موجود ماچس باہر نکالوں اور خشک جھاڑیوں کو آگ لگا دوں۔ ایسی صورت میں جانور ہڑبڑا کر باہر نکلتا اور جھنجھلاہٹ یا طیش کے عالم میں مجھ پر حملہ کرتا۔ ظاہر ہے حملہ ناپا تلا ہوتا اور بچاؤ کرنا نامکن نہیں ہوتا۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ وہاں چھپنے کے لئے مناسب جگہ بھی موجود نہیں تھی۔ درے کے دونوں سائیڈز پر موجود چٹانوں پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ سوچنے سمجھنے پر دماغ لگانے کے بجائے میں نے جیب میں سے ماچس باہر نکالی اور اللہ کا نام لے کر جھاڑیوں کو آگ لگا دی۔

جلتی پریشی کے مترادف جھاڑیوں نے فوراً آگ پکڑ لی اور نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگی۔ کچھ لمبے پر درہ دائیں جانب مڑ رہا تھا۔ میں نے بندوق سنبھالی اور مڑتے ہوئے درے کی دیواروں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں میں تیندوے کے حملے سے قدرے محفوظ تھا۔ آگ

کارخ میرے مخالف جانب تھا۔ اس لئے میں نے مطمئن انداز میں جلتی ہوئی جھاڑیوں کے علاوہ مکمل سکوت طاری تھا۔ ہوا کا رخ میرے مخالف جانب تھا۔ اس لئے جھاڑیاں تیزی کے ساتھ آگ پکڑتی چلی جا رہی تھی۔ نہ جانے عجیبیت درے کے باہر کھڑا کیا کر رہا ہوگا۔ مجھے درے میں داخل ہونے تقریباً پون گھنٹہ بیت چکا تھا۔ یہ شاید اب تک گاؤں والے بھی درے کے باہر پہنچ گئے ہوں۔ میری سوچوں کا سلسلہ یکثرت ٹوٹا چلا گیا۔

اچانک ماحول تیندوے کی غضبناک دھاڑ سے گونج اٹھا۔ میں نے ہڑبڑا کر درے کے اندر کی جانب دیکھا۔ لیکن آدم خور دکھائی نہیں دیا۔ ماحول دوبارہ اس کے چننے کی آواز سے گونجا۔ میں نے بندوق پر گرفت مضبوط کر دی اور اعصاب کو معتدل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر جیسے بجلی چمکتی ہے۔ ویسے وہ آگ میں لگی بھڑکتی ہوئی جھاڑیوں میں سے باہر نکلا۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ نشانہ باندھا۔ اور فائر کر دیا گولی نشانے پر لگی۔ وہ قلابازی کھا کر چھٹا اور اس کا جسم تیزی سے بڑھتی ہوئی آگ کے درمیان جا گرا۔ ایک دفعہ پھر ماحول اس کی غضبناک دھاڑوں سے گونج اٹھا۔

خدا کی پناہ..... میں وہ وقت بھی بھی بھلا نہیں پاؤں گا۔ اس کی دل دہلا دینے والی دھاڑیں سن کر مجھے اپنے جسم کے روگئے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ مختصر وقت کے دوران آگ سے تو باہر نکل آیا۔ لیکن بری طرح جھلنے کے بعد..... بارود کی تباہ کاریوں سے وہ بہر حال اپنے آپ کو بچا نہیں پایا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور بندوق کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا۔ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کھیا عجیبیت کی آواز ابھری۔ وہ میری خیریت دریافت کر رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور تیندوے کے مردہ جلے ہوئے جسم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے اٹھانے کا حکم دیا اور خود درے سے باہر کی جانب چل دیا۔

ظہر کی نماز میں نے چشمے کے پانی سے وضو کرنے کے بعد پڑھی۔ تب تک گاؤں والے درے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا چکے تھے۔ میں نے سلگتے ہوئے درے کا معائنہ کیا۔ جھلسی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان ایک تنگ اور ٹیڑھا میزہار راستہ موجود تھا۔ جو کچھ آگے جانے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ یہ راستہ یقیناً زلزلے کی کارستانی رہا ہوگا۔ بہر حال جھاڑیوں سے مکمل طور پر ڈھکے ہونے کی بدولت انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ آگ پھیلنے ہی دراڑ نما راستہ دھوئیں کی بدولت بھر گیا اور تیندوے کو مجبوراً باہر نکلتا پڑا۔ وہ سیاہ رنگ کا زرتیندوہ تھا۔ جس کی کھال کے نیچے پیلے رنگ کے دھبوں کی آمیزش محسوس کی جاسکتی تھی۔ آدم خور کیوں بنا.....

اس کی کہانی علیحدہ اور روگئے کھڑے کر دینے والی تھی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب میں تیندوے کی لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ تب میں نے ارد گرد کھڑے ہوئے کچھ لوگوں..... جن میں عجیبیت سر فہرست تھا۔ ان کے چہروں پر مایوسی کے تاثرات دیکھے۔ مجھے کچھ حیرانگی محسوس ہوئی۔ آدم خور سے نجات دلوانے کے بعد انہیں میرا احسان مند ہونا چاہئے تھا لیکن حیرت انگیز طور پر میں نے ان کے چہروں پر خوشی تاثرات دیکھے۔ گزشتہ کچھ باتوں کے مدہم خیالات میرے دماغ میں سوالیہ نشان کی بدولت ابھرنے لگے۔ جن میں سر فہرست میری راکفل کو چرانے کی وہ کوشش تھی جس کی بدولت مجھے ہاتھ روم میں بند کیا گیا تھا۔ چار انگلیوں والے انسان کے نشانات کا میری چھت پر پایا جانا۔ اور بعد میں تلاش کے باوجود اس کا گاؤں میں نہ ملنا.....؟ پھر اسکول کی عمارت سے لاش کا ملنا.....؟

یہ باتیں اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ مجھ سے بہت کچھ چھپایا جا رہا ہے اور اس تمام معاملے میں عجیبیت کا نمایاں ہاتھ کار فرما ہے۔ گاؤں والے تیندوے کی لاش کو اٹھانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں نے عجیبیت کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ڈاک بنگلے کی جانب چل دیا۔ میرا ارادہ اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کا تھا۔ اور پوچھ گچھ سے جو کہانی سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی۔

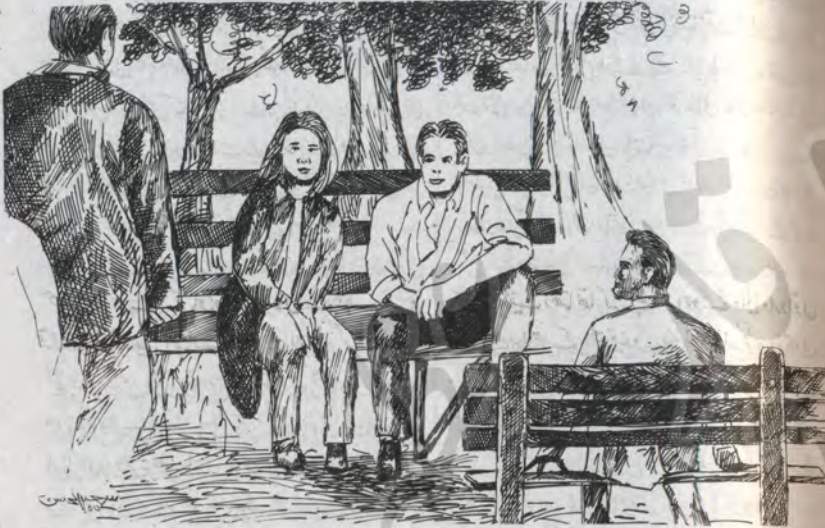


میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ تیندوا، شیر یا بھڑچیا اس وقت تک آدم خور نہیں بنتا۔ جب تک وہ صحت مند ہو اور با آسانی جانوروں کو ہلاک کر کے اپنا رزق تلاش کر سکتا ہو۔ بصورت دیگر اس کے پاؤں کی بڈی ٹوٹ جائے۔ یا بھڑچیا دانت جھڑ جائیں۔ علاوہ ازیں زخمی ہونے کی صورت میں بھی وہ فطری راستے کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ کار اپنانے کے لئے انسانوں کے شکار کی جانب بڑھنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ تیندوا صحت مند ہونے کے باوجود بھی انسان کے شکار پر آمادہ تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اسے بچپن سے انسانی گوشت کھلایا گیا تھا۔ جانور ایک دفعہ انسانی گوشت کھانے کے بعد دوبارہ جانور کے گوشت کو منہ نہیں لگاتا۔ وجہ شاید یہ رہتی ہو کہ انسانی گوشت نہایت لذیذ اور تازہ ہوتا ہوگا۔ بہر حال سردار گنجیت کا کہنا تھا ان لوگوں کو تیندو کے کو انسانی گوشت کھلانا گاؤں کے سرکردہ افراد کی مجبوری تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے کے دوران گاؤں میں کینسر کی وبا کے بڑھنے میں شدت آئی تھی۔ کھیا گنجیت سینے کے کینسر میں مبتلا تھا۔ پنڈت اور سادھوؤں سے علاج کروایا۔ لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ گاؤں کے کسی فرد کی زبانی اسے ایک ایسے شخص سے متعلق معلومات حاصل ہوئیں جو پہاڑوں کے اوپر کٹیا بنا کر رہتا تھا۔ گاؤں والوں کے کہنے کے مطابق بہت بچپنی ہوئی بزرگ ہستی کا اختیار رکھتا تھا۔ اس کی کٹیا کے سامنے سیاہ تیندو اور خیروں کے ساتھ بھر ہندا تھا۔

کھیا عجیت کے کہنے کے مطابق وہ اس بات سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا کہ قصبے میں ہونے والی وارداتوں کے پیچھے سادھو کے باتو تیندوے کا ہاتھ تھا۔ لیکن وہ گاؤں والوں سے اس بات کو مکمل طور پر پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ صرف اس لئے کہ سادھو کے مختصر علاج سے اسے کافی آفاقہ ہوا تھا۔ اور وہ دل ہی دل میں سادھو کے دیوتا یعنی سیاہ تیندوے کو پوجنے لگا تھا۔

لیکن تیندوے کے اچانک ڈاک بنگلے کا راز  
کرنے کی بدولت اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے  
بعد ازاں سادھو کی کنیا کا بھی معائنہ کیا۔ وہاں مختلف برتنوں  
میں انسانی ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور کنیسا میں خوشت کے  
علاوہ ویرانی کا دور دورہ تھا۔ ڈاک بنگلے میں واپس آنے کے  
بعد میں نے عشاء کی نماز پڑھی اور دو دنوں ہاتھ اٹھا کر گاؤں  
کے سادھو اور افراد کی کم عقلی کی دوری، بھلاہر، جھوٹا دور و بھلاہر  
کے لئے دعا کرنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔

قصہ مختصر..... جاہل اور سادہ لوح قصبے کے مختصر



عامر ملک - راو پینڈی

صدق دل سے کی گئی دعا اپنا اثر رکھتی ہے۔ ایک ناقابل فراموش دل گرفتہ دل فریفتہ کہانی

یہ میرے پوتے عدیل اور پوتی لیلیٰ کے  
 دیکھی ہے اور نہ کبھی فون پر آوازی ہے۔ گرین کارڈ کی



خاطر اس نے کسی امریکن لڑکی سے شادی کر لی ہے اور ہم سب کو خواب سمجھ کر بھول گیا ہے۔ نواز اس سے بڑا ہے۔ بہت ہی تالعداد اور فرمانبردار ہے۔ مگر اس کی اولاد اس کے بس میں نہیں ہے۔ ماں باپ دونوں ہی اولاد کے معاملہ میں بد قسمت ہیں۔ ان کے لاڈ پیارنے ان کو اس قدر رگڑا دیا ہے کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ والدین کا احترام اتنی اہمیت کا حامل ہے۔

میں اس عمر میں بھی نماز اور روزے کی پابندی کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر گھر کے دیگر تمام افراد مذہب سے کوسوں دور ہیں۔ نواز صرف جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے۔ گھر میں جب لوگ انڈین فلم دیکھ کر اودھم مچاتے ہیں تو میں برداشت نہیں کر پاتا۔ میں روک ٹوک کرتا ہوں تو ان کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور یہ میرے مرنے کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ کیونکہ میں ان کی آزادی کی راہ میں بڑا بھاری پتھر ہوں۔ میں اپنے پوتے اور پوتی کا رویہ دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے اپنے ماں باپ یاد آ جاتے ہیں کہ میں ان کا کس قدر ادب اور احترام کرتا تھا۔

برصغیر کی تقسیم سے قبل ہمارا خاندان کیمبل پور (انک) میں آباد تھا۔ میری والدہ صاحبہ نے حج کی سعادت تو حاصل نہ کی تھی مگر وہ پھر بھی ”بی جن“ کہلاتی تھیں۔ ابا جان مسجد کے امام تھے۔ نماز پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کو قرآن مجید بھی پڑھاتے تھے۔ محلے کے لوگ ان کی خدمت کر دیتے تھے۔ یوں ہی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ابھی میں آٹھ سال کا تھا کہ ابا جان کا انتقال ہو گیا، اور امی جان کے کندھوں پر بھاری بوجھ آن پڑا۔ انہوں نے میرے مستقبل کی خاطر دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور زندگی بھر اس پر قائم رہیں۔

ہمارے گھر کا ماحول شروع ہی سے مذہبی تھا۔ ابا مرحوم کی طرح امی بھی گھر میں بچیوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں اور خود بھی مذہبی احکامات کی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ امی جان کو حج کی سعادت حاصل

کرنے کی شدید خواہش تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ اکثر لوگ بذریعہ خشکی حج پر جاتے تھے۔ اس سفر میں اخراجات بھی کم ہوتے تھے۔ ابا جان کی وفات کے بعد امی نے گھر میں سلائی اور کڑھائی کا کام بھی شروع کر دیا۔ وہ ان کاموں کی ماہر تھیں۔ انہوں نے مجھے اسکول میں داخل کر دیا۔ اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حج کے لئے بھی رقم جمع کرنی شروع کر دی۔۔۔۔۔۔ ان کے لئے گاؤں کے دو مردوں نے اپنی بیویوں کے ہمراہ حج کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ امی جان کا ان کے ہمراہ سفر مبارک کرنے کا ارادہ تھا۔ اس لئے وہ بھی رقم جمع کر رہی تھیں۔ بالاخر وہ وقت آن پہنچا۔

ایک ہفتہ بعد ان لوگوں کی روانگی تھی کہ امی جان نے اچانک اپنا فیصلہ بدل دیا کہ وہ حج کرنے نہیں جائیں گی۔ ان کے ساتھ جانے والی عورتوں اور مردوں کو حیرانی ہوئی۔ انہوں نے میری والدہ سے پروگرام منسوخ کرنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے وجہ بتائی اور ان کو ٹال دیا۔ ان لوگوں نے امی جان کو یہ پیشکش کی کہ اگر رقم کا مسئلہ ہے تو فکر مت کریں۔ ہم رقم ادا کر دیں گے۔ مگر امی جان کا ایک ہی جواب تھا ”میں اس سال حج پر نہیں جاؤں گی۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

وہ لوگ حج کے سفر پر روانہ ہو گئے کئی ماہ بعد ان کی واپسی ہوئی تو گاؤں والوں نے ان کا خوب استقبال کیا۔ ان کی گاؤں کے ہر فرد نے دعوت کی۔ امی جان نے بھی ان کی دعوت کی، کھانے کے بعد مرد مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ اور وہ دونوں عورتیں امی کو بتانے لگیں۔ ”ہم دونوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں کئی بار ایک ہی خواب دیکھا کہ تم کبھی خانہ کعبہ کا طواف کر رہی ہو اور کبھی مقام ابراہیم پر نفل ادا کر رہی ہو۔ کبھی صفا اور مردہ کی پہاڑیوں کے درمیان سچی کر رہی ہو۔ ہم منی عرفات۔۔۔۔۔۔ اور مزدلفہ گئے تو وہاں بھی تمہیں ہی پایا۔ مدینہ منورہ میں تمہیں نماز پڑھتے دیکھا۔ تم ہی

بتاؤ یہ کیا راز ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں“ امی نے انہیں ٹالنا چاہا۔ مگر وہ نہ مانیں۔ کہنے لگیں۔

”لگتا ہے کوئی خاص بات ہے کہ تم اس پاک سرزمین پر نہیں گئیں۔ پھر بھی یوں لگتا ہے کہ تمہارا حج قبول ہو گیا ہے۔“

انہوں نے بہت ضد کی۔ تو امی جان نے نہ چاہنے کے باوجود ان کو بتایا۔۔۔۔۔۔ ”ہمارے گاؤں کا ایک غریب شخص نذری علی ٹی۔ بی کے مرض میں مبتلا تھا۔ اس دور میں ٹی۔ بی کا مرض لا علاج ہوتا تھا۔ اس بیماری کا نام سن کر ہی لوگ خوف کھاتے تھے۔ اس کا علاج بھی نہ لگتا تھا۔ ٹی۔ بی سینوریم میں داخلہ اور علاج کا خرچ اتنا تھا کہ وہ نذیر کے کيس کی بات نہ سمجھی۔ جن دنوں امی جان کا حج پر روانگی کا ارادہ تھا۔ ان ہی دنوں کسی کام کے سلسلہ میں امی جان کا ان کے گھر کے قریب سے گزرا ہوا تو نذری علی اور اس کے بیوی بچوں کے رونے کی آوازیں سن کر وہ ان کے گھر میں داخل ہو گئیں۔ امی نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو نذیر کی بیوی نے بتایا کہ نذیر کو ٹی۔ بی ہے۔ سب کچھ اس کے علاج پر لگ گیا ہے اب گھر میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہی۔ مگر پھر بھی نذیر تندرست نہیں ہوا۔ گھر میں کئی دنوں سے فاقہ ہے۔ اگر نذیر کو ٹی۔ بی سینوریم میں داخل نہ کرنا تو یہ مرجائے گا۔“

امی جان نے اسے دلاسا دیا اور گھر لوٹ آئیں۔ اور انہوں نے وہ تمام رقم جو حج کے لئے جمع کر رکھی تھی۔ نذیر کی بیوی کو چپکے سے دے دی۔ اور سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا، اگلے روز ہی نذیر کی بیوی اسے سینوریم مری لے گئی۔ جہاں اس کا علاج شروع ہوا اور پھر وہ آہستہ آہستہ۔۔۔۔۔۔ مکمل طور پر تندرست ہو گیا۔ اور اب وہ سخت مزدوری کرنے لگا ہے امی جان کے حج پر نہ جانے کی وجہ جان کر ان دونوں عورتوں کی گردنیں جھک گئیں اور وہ کہنے لگیں۔۔۔۔۔۔ ”کٹھن! ہم نے حج کر کے وہ کھنکھیں پایا جو تم نے بنا حج کئے پایا ہے۔“

## کیا خوب کھا ہے

تنگ نظر، تنگ ذہن لوگ دوسروں کی ذات پر بحث کرتے ہیں اوسطاً درمیانہ ذہن قسم کے لوگ واقعات پر بحث کرتے ہیں اعلیٰ ذہن کے لوگ نظریات پر بحث کرتے ہیں اور عظیم ترین لوگ خاموشی سے مقصد کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔

(عثمان غنی۔ پشاور)

ان عورتوں نے یہ بات گاؤں میں پھیلا دی۔ اور سب لوگ امی جان کو ”بی جن“ کہنے لگے۔

امی جان نے اپنی زندگی خدمت خلق اور عبادت کے لئے وقف کر دی۔ گاؤں میں کوئی بھی بیمار ہوتا تو وہ اس کی تیمارداری کرتیں اس کے لئے دوا کا بندوبست کرتیں۔ گاؤں کی گلیوں میں سے پتھر اور کانٹے چٹانوں کا معمول تھا۔ گاؤں کا کوئی آوارہ کتا یا بلی پیار یا دشمنی ہو جاتا تو امی جان اس کو گھر لے آتیں اور ان جانوروں کی بھی خدمت اور تیمارداری کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر ایک کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ اب وہ گھر میں گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں۔ وہ اپنے پروردگار کی اتنی بندگی کرتیں کہ پروردگار نے ان کو یہ خوبی عطا کر دی کہ گاؤں کے لوگوں کی چھوٹی موٹی بیماریوں پر وہ ذکر الہی کر کے دم کرتیں تو لوگ ٹھیک ہو جاتے۔۔۔۔۔۔ وہ کسی سے کسی قسم کا معاوضہ نہ لیتی تھیں۔ پھر بھی گھر میں کبھی تنگی نہ آتی تھی۔ اوپر والا ان کی غائبانہ مدد کرتا تھا۔

میں امی جان کا لاڈلہ اور آنکھوں کا تارا تھا۔ انہوں نے اپنی جوانی میرے لئے وقف کر ڈالی تھی۔ یوں بھی نماز روزہ اور دیگر مذہبی احکام کی سختی سے پابندی



کرتا تھا۔ میں نے دین کی کتابوں میں بھی پڑھا تھا، بزرگوں اور استادوں سے بھی سنا تھا کہ ہمارے مذہب میں خدا کی اطاعت کے بعد والدین کو اعلیٰ مقام عطا کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ اولاد کے لئے لازم ہے کہ وہ والدین کی اطاعت کرے۔ ان کا حکم مانے اور جب وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کی خدمت کرتے ہوئے اف نہ کرے۔ ماں کے قدموں تلے جنت کی بشارت بھی پروردگار نے ہی دے رکھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جس نے ماں باپ کو راضی رکھا گویا اس نے خدا کو راضی رکھا اور جس نے والدین کو راضی اور خوش رکھا اسے جیتے جنت مل گئی۔ میں باپ کی شفقت سے تو محروم تھا۔ اس لئے اب میری ماں ہی میرے لئے سب کچھ تھی۔ کاش میرے والد زندہ ہوتے تو میں ان کی بھی خدمت کرتا۔ مگر میں اس معاملہ میں بدقسمت ٹھہرا کہ ان کی خدمت نہ کر سکا۔ اس لئے میں نے ماں کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔۔۔۔۔ ابھی اسی دنیا میں نہیں رہیں۔ مگر میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کی دعائیں۔ سائے کی مانند میرے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔

میں جب امی جان کو محنت کرتے دیکھتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ کہ میں ان کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا کہ میں اس وقت چھوٹا تھا۔ میں اسی لئے دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ کہ بڑا ہو کر ملازمت کروں گا اور پھر ان کو کوئی کام نہ کرنے دوں گا۔

میں نے کہیں پڑھایا نہ سنا تھا۔۔۔۔۔ کہ اگر کوئی اولاد روزانہ صبح اپنے باپ کی پیشانی کو محبت بھری نظروں سے دیکھے تو پروردگار اس کو ایک حج کا ثواب عطا فرماتا ہے میں اس نعمت سے محروم تھا کہ اباجان زندہ نہ رہے۔ پھر بھی میں روزانہ صبح اپنی ماں کی پیشانی کو پیار، احترام اور عقیدت سے دیکھتا تھا۔ یوں میری روح تک سرشار ہو جاتی تھی اور میرا دن نہایت ہی خوشگوار گزرتا تھا۔ میں نے زندگی میں اپنی ماں سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ انہوں نے مجھے جو بھی حکم دیا۔۔۔۔۔ میں نے پورا کیا۔۔۔۔۔ میں نے کبھی بھی ان کا دل نہیں دکھایا، اس لئے

کبھی بھی ان کی زبان سے میرے لئے بددعا نہیں نکلی بلکہ ان کی دعائیں قدم قدم پر میرے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ جو ہمیشہ میرے کام آتی تھیں۔ اور میری حفاظت بھی کرتی تھیں۔ ان کی دعائیں میرے لئے ایک سرمایہ تھیں۔ ہم ماں بیٹے میں اتنی محبت تھی کہ میری ذات کے بارے میں میری ماں کو روحانی کمال حاصل ہو گیا تھا کہ اگر میں گھر سے باہر ہوتا اور کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ بدل جاتا تو یوں لگتا جیسے کوئی زبردستی میرا ارادہ بدل رہا ہو۔۔۔۔۔ بعد میں پتہ چلتا کہ جو کچھ ہوا بہتر ہی ہوا ہے۔ میں گھر آتا تو میری ماں میرے بتائے بغیر مجھے بتا دیتیں کہ تو فلاں کام کرنے لگا تھا۔ مگر میں نے منع کر دیا تھا۔ یہ میری ماں کا مجھ سے خفی اور روحانی پیار تھا کہ وہ میرے بارے میں باخبر رہتی تھیں۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی، تاکہ میں ماں کی خدمت کروں اور وہ گھر بیٹھ کر میری کمائی کھائیں۔۔۔۔۔ یہ ان کی دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا کہ مجھے راولپنڈی میں ایک سرکاری محکمے میں ملازمت مل گئی، مجھے ماں سے دوری گوارا نہیں تھی لہذا میں نے ان کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ مگر وہ نہ مانیں۔ میں نے دفتر ہی کے دو ساتھیوں کے ہمراہ ہار ہار کر رہ گئی۔ میں ہر ہفتے کی شام کو گاؤں چلا جاتا اور سوموار کی صبح کو راولپنڈی لوٹ آتا۔ میں نے ماں سے محنت اور مشقت والے کام چھڑوا دیئے تھے اور اب وہ سارا دن گھر پر رہتی تھیں اور زیادہ تر وقت عبادت میں گزارتی تھی۔ اب ان کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ میں شادی کر لوں۔ گاؤں میں ہی برادری کی ایک لڑکی زبیدہ سے انہوں نے میری منگنی کر دی تھی۔ میں نے ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ اس لئے اب وہ میری شادی کی تیاریوں میں لگی رہتی تھیں۔

اس روز دفتر میں کام زیادہ تھا۔ جس کی وجہ سے چھٹی دیر سے ہوئی اور میں ہفتے والے دن گھر نہ جاسکا۔ سوچا اب اگلے ہفتے مزید ایک دن چھٹی لے کر جاؤں

لیکن اسی رات مجھے تیز بخار ہو گیا۔ میں دو دن دفتر بھی نہ جاسکا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے دوا دی اور دو تین دن مکمل آرام کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ دو دن گزر گئے مگر بخار نہ اترا۔ بلکہ اس کی شدت میں اضافہ ہی ہو گیا۔ میرے ساتھی بھی میری بیماری کی وجہ سے پریشان تھے۔ اگلے روز ایک ساتھی دفتر سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں میرے لئے ایک ٹیلی گرام تھا۔ جس میں میری ماں کی شدید بیماری کی خبر تھی اور مجھے جلدی گھر آنے کی تاکید کی گئی تھی۔

ماں جی کی بیماری کاسن کر میں تڑپ اٹھا۔ میں اپنی بیماری بھول گیا اور فوراً گھر جانے کی تیاری کر لی۔ میرے ساتھیوں نے مجھے منع کیا کہ اس وقت دیر ہو گئی ہے میں نہ جاؤں اور کل صبح چلا جاؤں، مگر میں نہ مانا اور تیار ہو کر لاری اڈہ پر آ گیا۔ ان دنوں لاری اڈہ لیاقت باغ کے قریب ہوتا تھا۔ اس وقت شام ڈھلنے لگی تھی۔ موسم بھی ابرا آلود تھا اور تیز خنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ تیز بارش ہوگی۔ کیسبل پور جانے والی آخری بس تیار کھڑی تھی میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے آخری سیٹ مل گئی ورنہ مجھے کھڑا ہو کر سفر کرنا پڑتا۔

بس جب لاری اڈے سے باہر نکلی تو خاصی دیر ہو چکی تھی اور ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ بس جوں جوں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ بارش کی رفتار بھی اسی قدر تیز ہوتی گئی۔ بس میں ہندو، سکھ اور مسلمان سبھی سڑ کر رہے تھے۔ بس ڈرائیور مسلمان تھا۔ اس نے اڑی رکھی ہوئی تھی اور بوڑھے محل اور ماہرانہ انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔

کیسبل پور کے لاری اڈے سے میرے گھر کا فاصلہ بڑھ سکتا تھا۔ میں بس سے اتر کر آدھے گھنٹے میں پیدل محل کر گھر پہنچ سکتا تھا۔ مگر اس وقت میری طبیعت خراب ہوئی جا رہی تھی۔ میں جلد از جلد ماں جی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ بس جب حسن ابدال سے آگے نکلی تو بارش نے طوفانی شکل اختیار کر لی۔ لگتا تھا کہ ڈرائیور بس سنبھال نہیں سکے گا اور کوئی حادثہ ہو جائے گا۔ بارش کے

ساتھ ہی آسمانی بجلی بھی زور سے چمکتا اور کڑکنا شروع ہو گئی۔ مگر سب سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ بجلی کا کوندا مسلسل ہماری بس کے آگے گر رہا تھا۔ بالآخر بس ڈرائیور بے بس اور خوفزدہ ہو گیا۔ اور اس نے گاڑی کے پیروک دی۔ اس کے بعد بجلی کا کوندا بس کے ارد گرد گرنے لگا۔ اس کے علاوہ اس کی اور جگہ بجلی گرتی دکھائی نہ دیتی تھی بس رکنے پر کچھ سکون محسوس ہوا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی افراتفری پیدا ہو گئی۔ عجیب بے کسی کا عالم تھا لگتا تھا ابھی بجلی بس پر گر پڑے گی۔ اور بس سمیت تمام مسافر جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ کچھ دیر اور گزر گئی۔ بجلی کا کوندا وقفے وقفے کے بعد بس کے ارد گرد گرتا رہا۔ ہم سب کو موت اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔ تمام مسلمان کلمہ شہادت کا ورد اور ہندو رام رام کرنے لگے۔ اب ہر ایک کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ مگر کوئی بھی بس سے باہر نکل کر بھاگ نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس عالم میں وہ بس ہی سب کے لئے گوشہ عافیت تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ نہ بارش کا زور ٹوٹا اور نہ ہی بجلی کا گرنا بند ہوا۔ بالآخر ڈرائیور اور کچھ مسلمان اور ہندو بزرگوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک کو اپنے خدا پر اعتماد اور یقین ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے اور سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے تو اس صورت حال میں جب وہ یہ نظر آرہا ہے کہ قدرت آج ہم میں سے کسی کی جان لینا چاہتی ہے تو کیوں نہ تمام مسافر ایک ایک باری باری بس سے نیچے اتریں اور کچھ دیر سامنے والے درخت کے نیچے کھڑے رہیں۔ جس کی موت کے لئے آج کا دن مقرر ہے وہ بجلی کی زد میں آ کر زندگی ہار جائے گا۔ اور یوں دوسروں کی جان بچ جائے گی۔

یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ مسلمان تو اس پر عمل کرنے کے لئے رضامند ہو گئے۔ لیکن ہندو اور سکھ بغلیں جھانکنے لگے۔ لیکن بالآخر انہیں اس پر عمل کرنا ہی پڑا۔ سردی بھی زور دینے پر تھی۔ میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی میں نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ پہلے خود ڈرائیور نے کی۔ وہ کلمہ شہادت پڑھ کر نیچے اتر اور





## موت کا پیچھا

ساجدہ راجا-ہندواں سرگودھا

ایک شیر پر بیٹھا وہ نوجوان بہت اچنبھے میں تھا۔ شیر سر پٹ دوڑا جارہا تھا اوز پھر وہ شیر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا کہ نوجوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، پورے علاقے پر موت کی دھشت طاری تھی اور پھر.....

کیا کبھی بھار ماورائی تو میں بھی انسانی مدد کی طلبگار ہوتی ہیں۔ اس کا پتہ کہانی پڑھ کر چلے گا

یہ واقعہ جو میں سنانے جا رہا ہوں میری زندگی کا سب سے ناقابل فراموش، بھیا تک اور حقیقی ہے، یہ بتانا بھی تلخ اور وحشت ناک تھا اس کے نتائج بہر حال میرے حق میں ہوتے تھے، آج بھی جب میں محسوس کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ واقعہ کل ہی میرے ساتھ پیش آیا ہو۔ اگر غور کریں تو یہ دنیا ان گنت ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا لیکن ہمارے ماننے نہ ماننے سے ان کی حقیقت بدل نہیں جاتی۔ لاکھوں لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ بہت کچھ عجیب پیش آیا۔ وہ نہیں جانتے تو نہ سہی لیکن ان کی عقل آج بھی ان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتی۔ آج کی سائنس بہت ترقی کر چکی ہے، ایسے دور میں جب ہر چیز ممکن ہو چکی ہے لوگ دوسری مخلوقات پر یقین نہیں رکھتے، ان کے نزدیک جنتاں وغیرہ کا وجود

لگا، وہاں سے کیمبل پور پندرہ میل دور تھا۔ مگر نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے اڑائے لے جا رہی تھی۔ میں ابھی تک نہیں جان سکا کہ میں ایک گھنٹے میں گھر کیسے پہنچ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اور عزیز-میری ماں کی چار پائی کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور میرے ہی بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ میں ابھی تک کیوں نہیں گھر پہنچا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو میرے ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ ”میری ماں کی حالت بہت ہی نازک ہے۔ دو دن سے ان کی بول چال اور کھانا پینا بند ہے۔ اسی لئے تمہیں مار دے کر بلایا ہے۔“

میں کمرے میں داخل ہوا اور ”ماں جی“ کہہ کر ان کے پاؤں چومنے لگا۔ میرے ہونٹوں کے لمس نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور مجھے سینے سے لگا کر کہنے لگیں۔

”بیٹا! پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو زندہ سلامت گھر پہنچ گیا ہے۔ میری دعائیں رازیاں نہیں گئیں۔ قدرت نے تجھے بچا لیا ہے۔ اوپر والے نے میری لاج رکھی ہے اب میں سکون سے مر سکوں گی۔“ اتنا کہہ کر انہوں نے کلمہ شہادت پڑھا اور اس کے ساتھ ہی وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔

میں اور دیگر افراد رونے لگے۔ مجھے یقین آ گیا کہ ماں کی دعاؤں کے طفیل ہی یہ کرشمہ قدرت نے دکھا یا ہے کہ میں زندہ بچ گیا ہوں۔ میں نے گاؤں والوں کو اس سانحے کا بتایا تو وہ بھی قدرت کے اس کرشمے پر حیران رہ گئے۔

بعد میں یہ واقعہ اخباروں کی زینت بن گیا تھا۔ ایک اخبار والے نے میرا انٹرویو بھی لیا تھا۔ میں نے اسے تمام حقیقت بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ سب میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ میں زندہ رہا۔ شاید انہوں نے مجھے اپنی ماں کی حقیقی معنوں میں خدمت کی اور کبھی بھی زندگی میں ان کی حکم عدولی نہ کی تھی۔

کچھ دیر بعد بجلی کا کڑکا بند ہو گیا اور بارش بھی رک گئی تو میں پیدل ہی سڑک کے کنارے کنارے چلنے

کچھ دیر درخت کے نیچے کھڑا ہونے کے بعد بخیریت واپس آ گیا۔ اس نے پھر کئی کئی گھنٹے کو اتارا۔ وہ بھی زندہ رہا۔ اس کے بعد سیٹ نمبر ایک سے مسافر باری باری اترنا شروع ہو گئے۔ مسلمان کلمہ شہادت پڑھتے اور ہندو رام رام جیتے۔ ہر ایک یہی جان کر نیچے اترتا کہ وہ زندہ واپس نہیں آئے گا اور جب وہ زندہ واپس آتا تو اس کے چہرے پر اطمینان ہوتا۔ مسرت کی ایک لہر ہوتی جیسے اس نے نئی زندگی پالی ہو۔ ہر ایک کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے رخص کرتی نظر آتی تھی وہ لوگ جنہوں نے کبھی نماز نہ پڑھی تھی۔ وہ بھی اس وقت خدا کے آگے گڑگڑا رہے تھے کہ وہ ان کو معاف کر دے۔

آج ان کو زندگی دے کر ایک موقع اور دے دے تو وہ اس کی عبادت کریں گے اور سجدہ سے سر نہ اٹھائیں گے۔ اب وہ کوئی گناہ نہ کریں گے۔ روزے بھی رکھیں گے اور نمازیں بھی پڑھیں گے۔

تمام مسافر باری باری بس سے نیچے اترے اور کچھ دیر باہر گزارنے کے بعد بخیریت سے بس کے اندر واپس آ گئے۔ اب صرف میں رہ گیا تھا۔ چونکہ میں آخری سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لہذا اب میری ہی باری تھی۔ سب مسافروں کو اور مجھے بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ آج جس کی موت یہاں لکھی جا چکی ہے۔ وہ میں ہی ہوں۔ میں بہت ہی گھبرا رہا تھا۔ میری طبیعت تو پہلے ہی خراب تھی۔ مجھے اب اپنی موت کا بھی یقین ہو گیا تھا۔ میں نے بھی کلمہ شہادت پڑھا اور اللہ کو یاد کر کے بس سے نیچے اتر گیا، تمام مسافروں نے حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں ڈرتا اور کاغذ کا ٹپکا ہوا درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ چند ہی لمحوں کے گزرنے سے کچلی زور سے کڑکی اور سیدی بس کے اوپر گر پڑی..... میرے دیکھتے ہی دیکھتے تمام مسافر بس سمیت جل کر راکھ ہو گئے۔ جبکہ میں معجزانہ طور پر زندہ رہا۔ قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ کر میں سجدے میں گر گیا۔



محض ایک سنسنی خیز دینی ایجاد ہے، لیکن حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

جو لوگ نادیدہ مخلوقات پر یقین نہیں رکھتے ان کے ایسا سوچنے سے جو بے وہ بدل نہیں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے وجود کی گواہی دی ہے۔ یہ شیطان ابلیس جو پوری دنیا کو راہ سے بھٹکانے پر لگا ہوا ہے حقیقت میں اس کا تعلق بھی جنات سے تھا لیکن اس نے اتنی عبادت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فرشتوں کی صف میں رہنے کی اجازت دے دی تھی اور پھر اس کی غلطی کی وجہ سے وہ اللہ کی بارگاہ میں مردود اور لعین ٹھہرا۔

بات کہاں سے کہاں چل نکلی۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جو واقعہ اور جو حالات میرے ساتھ پیش آئے ان کو سوچ کر آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ کیا یہ سب کچھ حقیقت میں ہوا تھا.....؟

میرا تعلق آسٹریلیا سے ہے میرا باپ آسٹریلیا میں تھا جبکہ میری ماں کا تعلق ایشیا سے تھا اور وہ مسلمان تھی میرے والدین کی ملاقات ایک تعلیمی ادارے میں ہوئی جو بعد ازاں محبت میں تبدیل ہو گئی۔ محبت اتنی بڑھی کہ انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ میری ماں اپنے مذہب کو کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہیں تھی انہوں نے میرے پاپا سے کہا۔ ”وہ دل سے اسلام کا مطالعہ کریں اگر ان کا دل رضامند ہو تو وہ مسلمان ہو جائیں ورنہ ان کے راستے الگ الگ ہوں گے۔“ پاپا کو ماسے دوری ہرگز گوارہ نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا کہ ٹھیک ہے۔ میں اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔ دوسرے دن ہی انہوں نے ایک اسلامک سینٹر جو ان کر لیا اور دل سے اسلام کو جاننے کی جستجو میں لگ گئے۔

جیسے جیسے وہ اسلام کو پڑھتے گئے ان کا دماغ روشن ہوتا گیا۔ اور آخر کار وہ مسلمان ہو گئے۔ ماما کی خاطر اسلام کو وہ سمجھنے پر راضی ہوئے لیکن جب ان پر اسلام کی حقیقت ظاہر ہوئی تو وہ دل سے ایمان لے آئے۔

ماما پاپا کی شادی کے دو سال بعد میری پیدائش

ہوئی انہوں نے میرا نام میری ماں کی خواہش پر رکھا۔ میرے والدین نے میری پرورش نہایت عمدہ طریقے سے کی۔

میں پڑھائی کے علاوہ ہر قسم کی غیر لسانی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تھا۔ دوسری طرف میں نے مارشل آرٹ بھی سیکھنا شروع کر دیا۔ ہر سال ہونے والی تیراکی میں میرا پہلا نمبر ہوتا تھا، اور جب میں کالج میں داخل ہوا تو میں ہر چیز میں حلق ہو چکا تھا۔ اسلام میری روح میں شامل تھا۔ اس لئے میں اس کھلے معاشرے میں بھی اپنی ذات کے خول میں بند تھا۔ لڑکیاں مجھے روڈ بوائے کہتی تھیں لیکن میں نے کبھی توجہ نہیں دی۔

اور پھر وہ سب شروع ہو گیا جس نے میری زندگی اور میری سوچوں کو ایک نئی سمت دے دی۔ خوابوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ مسلسل ایک ہی طرح کا جواب، ہر رات آنے کے بعد میری نیند اڑا کے رکھ دیتا۔ جب ایک ہفتہ مسلسل اس خواب نے مجھے پریشان کئے رکھا تو میں نے پاپا کو بتایا۔ پاپا نے مجھے تسلی دی تو میں نے انہیں اپنا خواب سنایا۔

ایک چمیل میدان ہے، ارد گرد سوائے ویرانی اور سناٹے کے کچھ نہیں، میں بھاگتا جا رہا ہوں۔ بھاگتا جا رہا ہوں..... میری ٹانگیں شل ہو چکی ہیں لیکن میں خود کو بچانے کے لئے پھر بھی بھاگتا جا رہا ہوں اور سب سے حیرانی کی بات کہ مجھے اپنے بھاگنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی کہ میں کس چیز سے خوف زدہ ہو کے بھاگ رہا ہوں؟ تھک ہار کے گرتا ہوں اور اٹھ کے پھر بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے عجیب و غریب غراہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کے نیچے دیکھتا ہوں کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ پاپا کی یہ تسلی کہ ”بہنا خواب صرف خواب ہوتے ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تم ان کے بارے میں پریشان نہ ہو بلکہ کسی سائیکلرٹسٹ سے چیک اپ کراؤ۔ یہ دماغی پریشانی بھی ہو سکتی ہے جو خواب کی صورت

میں نظر آتی ہے۔ لیکن میں پاپا کو کیسے بتاتا تھا کہ مجھے ان خوابوں کے علاوہ اور کوئی پریشانی نہیں۔ تسلسل سے ایک خواب میں نظر آتی غراہٹیں بات نہیں لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے ہارے تھے ان کے کہنے پر میں نے دماغی ڈاکٹر کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر نے ہر طرح سے اپنا اطمینان کیا لیکن کوئی خاطر خواہ بات معلوم نہ ہو سکی۔

آخر میں ڈاکٹر نے ایک آخری سوال پوچھا جس کو میں خود ابھی تک نظر انداز کر رہا تھا۔ ”جس روز سے تمہیں یہ خواب نظر آنا شروع ہوئے ہیں اس دن کو کیا کوئی غیر معمولی واقعہ یا کوئی بات ہوئی تھی؟“ ڈاکٹر کے سوال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ سب کچھ ایک جگہ کے نمودار ہو گیا۔

اس دن میں کالج سے گھر آ رہا تھا کہ راستے میں مجھے ایک عجیب و غریب شخص ملا اس کا لمبہ بہت لمبا تھا، وہ ہوشی سے سر جھکائے چل رہا تھا لیکن جیسے ہی وہ میرے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے ایک دم اپنی ٹانگیں اوپر اٹھا لیں..... ”اوہ خدا!..... اتنی ڈراؤنی ٹانگیں..... وہ اتنی سرخ تھیں کہ جیسے ابھی ان سے خون بہہ پڑے گا۔ مجھے جھرمجھری سی آگئی لیکن میں نے اپنی ٹانگیں اس کی آنکھوں سے ہٹا نہیں پارہا تھا.....

ایک وہ بولا۔ تو جیسے میں کسی بحر سے آزاد ہو گیا۔ ”تیرے خواب جھوٹ نہیں ہوں گے۔ وہ سب کچھ تیرے ساتھ ہوگا، تو خود کو تیار کر لے۔ تیار کر لے۔ ورنہ بہت پچھتائے گا۔ میں آؤں گا تیرے پاس۔ ضرور آؤں گا۔ اس وقت کا انتظار کرنا۔“

نہ جانے اس نے یہ سب کیوں کہا.....؟“ میری آنکھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کو پاگل سمجھا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

رات کو جب میں سونے کے لئے لیٹا تو وہ عجیب و غریب آواز میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا اور اسی دن خوابوں کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جس نے میرا سکون

مجھ سے چھین لیا۔ آج اچانک ڈاکٹر کی بات پر وہ آدمی میرے ذہن میں آ گیا ایسا کیا ہونے والا ہے میرے ساتھ جس کا اس آدمی نے کہا تھا؟ میں انہی سوچوں میں تھا کہ ڈاکٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا وہ مجھے ایک نسخہ دیتے ہوئے ہدایت کر رہے تھے کہ میں ان دواؤں کو بغیر تاخیر کے استعمال کروں اور اپنے ذہن کو ہر قسم کی فکر سے آزاد کر دوں۔ میں نے نسخہ چھاننا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں گھر کے قریب پہنچنے والا تھا تو اچانک وہی آدمی میرے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں نے ایک بار پھر مجھے خوف زدہ سا کر دیا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے بارے میں لہجے میں بولا۔

”اب وقت آچکا ہے اس لئے میں تیرے پاس آیا ہوں تیرے خوابوں کا کنارہ ملنے والا ہے تیری زندگی تجھے دعا بھی دے سکتی ہے اور تو بھی موت کو دھوکا دے سکتا ہے، اس بارے میں وقت آنے پر تجھ کو خود ہی پتہ چل جائے گا۔ ہاں اگر تیری ضرورت ہوئی تو میں خود تیری مدد کرنے آ جاؤں گا۔ شروع میں بہر حال تجھے خود اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے بہادری کا ثبوت دینا ہے، اگر تو شروع میں ہی موت کا شکار ہو گیا تو تجھے موت کے بعد بھی سکون نہیں ملے گا۔ تیری روح تیرے ناکردہ گناہوں کی سزا اچھیلی رہے گی۔“

میں حیران و پریشان ساس کی باتیں سنے جا رہا تھا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہا ہے۔

”اگر تو کچھ پوچھنا چاہتا ہے تو پوچھ، میرے پاس وقت کم ہوتا ہے۔“ اس کی آواز مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی میں نے جلدی سے اس سے پوچھا۔ ”وہ کون ہے.....؟“ اور میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ لیکن اس نے مجھے صرف یہی کہا کہ ”میرے بارے میں تجھے جلد معلوم ہو جائے گا اور جو کچھ تیرے ساتھ ہو رہا ہے اس کا اندازہ بھی تجھے خود ہی ہوگا..... ہاں صرف اتنا بتا دوں کہ تجھے ایک خطرناک کام کرنا ہے جس میں تیری زندگی کو بھی شدید خطرہ ہوگا لیکن اگر تو وہ



کام کر گیا تو تجھے وہ سب میسر ہوگا جو تو نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

اس کام سے انکار بھی تجھے موت کے منہ میں لے جائے گا۔ اس وقت تیرے پاس دو راستے ہیں یا تو اس کام سے انکار کر کے خود کو موت کے حوالے کر دے۔ یا پھر اس کام کے لئے ہائی بھر لے۔ خوف تو بہر حال اس میں بھی ہے لیکن فتنی فتنی چانس..... بچ گیا تو ایک خوشگوار زندگی تیری منتظر ہوگی..... ایک بات کا مجھے بہر حال یقین ہے کہ تو بہت بہادر ہے۔ موت کو اتنی آسانی سے گلے نہیں لگائے گا اور بے بھی اگر موت تعاقب میں ہو تو انسان خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

موت کا خوف یا تو انسان کو بہت بہادر بنا دیتا ہے یا پھر نہایت بزدل..... اور ہم جانتے ہیں کہ تو بزدل نہیں اور موت کے ڈر سے کبھی منہ نہیں چپائے گا۔

وہ آدمی یا تو مجھے خبردار کر رہا تھا یا پھر ڈرا رہا تھا کیونکہ اس کے ہر لفظ میں ہر بات میں موت کا ذکر تھا اور وہ اسے یوں بیان کر رہا تھا جیسے موت اس کے نزدیک ایک نہایت دل چسپ کھیل ہو۔

مجھے اچانک بہت غصہ آ گیا میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

”بس بہت ہو گیا۔ تم جو کوئی بھی ہو میرا پیچھا چھوڑ دو۔ اگر آئندہ مجھے نظر آئے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

میری بات کے جواب میں اس کے لبوں پر نہایت پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ جانے سے پہلے بولا۔ ”میں تو جا رہا ہوں لیکن اگر کبھی مشکل میں میری ضرورت ہو تو مجھے زور سے ”گبراک“ کہہ کر پکار لینا میں آ جاؤں گا کیونکہ میں تیرا خیر خواہ ہوں دشمن نہیں.....“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہڑتا چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسی دن شام کے اخبار میں، میں نے ایک عجیب و غریب کالم پڑھا، وہ کالم ایک ایسی وادی کے متعلق تھا جہاں ہیروں کی بہتات تھی۔ وہاں جو جشمے،

ندیان، بہتی تھیں، ان کے پانی میں بھی بہت سے سوکھوتے ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جن پہاڑوں سے نکلتی تھیں ان پہاڑوں میں ہیروں کی بہتات تھی۔ پہاڑوں کے اندر غار تھے جو ہیروں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ جشمے ان غاروں سے گزر کر آتے تھے اس لئے وہ ہیروں کے پانی میں بہتے ہوئے دور دور تک چلے جاتے تھے۔

لیکن وہاں تک پہنچنا عام انسان کے بس کی بات نہ تھی، وہاں جو حالات پیش آتے تھے ان سے نمٹنا نہ صرف مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن کام تھا۔

یہ کالم ایک ایسے ہم جو نے لکھا تھا جو وہاں پہنچنے میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن وہاں جو حالات پیش آئے انہوں نے اس کو بخوبی احساس بنادیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح زندہ واپس تو آ گیا لیکن اپنا رمل حالت میں..... لمبے عرصے زیر علاج رہنے کے بعد وہ ٹھیک ہوا تھا اور پھر اس نے یہ کالم لکھا تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ جیسے ہی میں وادی میں داخل ہوا میں نے وہاں ہر طرف ہیروں کے کھرے دیکھے، وہاں کی لہروں میں بہتے ہوئے آتے اور آس پاس نظر جاتے، سورج کی روشنی میں وہ وادی تابناک منظر پیش کرتی، جس کی تاب لا ناممکن نہیں تھا۔

اس نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی جس سے پتہ چلتا کہ وہ وہاں کیسے پہنچا، اسے وہاں کیسے حالات سے گزرنا پڑا، کن مشکلات میں وہ پھنسا، کس چیز نے اسے اپنا رمل کر دیا اور سب سے بڑی بات کہ وہ واپس کیسے آیا.....؟ یہ سب سوالات مجھے بے چین تو کر رہے تھے لیکن اخبار رکھنے سے پہلے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

اس وادی میں جانے کا فیصلہ..... جو مجھے نہ جانے کتنا مہنگا پڑتا لیکن مجھے ہر حال میں جانا تھا مجھے ہیروں کا لالچ نہیں تھا بس میں اس وادی کو دیکھنا چاہتا تھا وہ وادی برازیل میں ایسی جگہ واقع تھی جہاں جانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر کوئی جاتا بھی تو اپنی زندگی لٹا کے آتا تھا اور بعض کا تو کوئی نام نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ میں نے گھر جانے سے پہلے اصرار

کے لئے فریاد کیا کہ گھر جا کر اچھی طرح مطالعہ کر سکوں۔ رات کو مجھے پھر وہی خواب نظر آیا لیکن اس کی وضاحت تھوڑی مختلف تھی۔ میں ایسی پچھل میڈانوں میں گھرا آس پاس حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔ وہی ویرانی، وہی سناٹا جو شروع سے ہی میں خواب دیکھتا آ رہا تھا۔ ابھی میں دیکھ رہا تھا کہ اپنے پیچھے ہونے والی خوفناک غرا میں سن کر کانپ گیا، جلدی سے مڑ کے دیکھا تو خوف سے وہیں ساکت ہو گیا۔

وہ بھڑپے تھے، سینکڑوں کی تعداد میں، جو اپنی مرغ اور خوفناک آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے، ان کے منہ سے نکلنے والی خوفناک غرا میں مجھے دہشت زدہ کر دے رہی تھیں، ان کی سفاکی دیکھ کر مجھے جھرجھری آئی، موت میرے سامنے تھی اور مجھے اپنی زندگی کو بچانے کے لئے کچھ کرنا تھا اس سے پہلے کہ وہ میری طرف بڑھتے میں نے جلدی سے ایک سمت دوڑ لگا دی، مجھے اپنے پیچھے بھیڑیوں کی خوفناک غرا میں اپنے قریب آنی محسوس ہو رہی تھیں۔

اچانک مجھے سامنے ایک کنواں نظر آیا، میں نے اس طرف دوڑ لگا دی، اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی اور.....

میری آنکھ کھلی تو میں پسینے سے شرابور تھا میرا لباس دھوئیں کی مانند پھل رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں میلوں دوڑتا رہا ہوں۔ میں تھوڑی دیر یونہی بیٹھا رہا پھر میں نے اٹھ کر پانی پیا تو میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ اسی خواب کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن بیدار ہوتے ہی میں جانے کی تیاریوں میں لگ گیا، ماما پاپا نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی بہت سمجھایا لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا جو بعد میں مجھے بہت مہنگی پڑی۔

میری ضد کے سامنے انہیں ہار ماننا پڑی اور میں ان سے دعا نہیں لیتا ہوا پہلی ہی دستیاب قلائد سے ہمارے لالچ میں جا پھنسا۔ وہاں جا کے میں نے سب سے پہلے

ڈرڈائجسٹ کا مشہور و معروف سلسلہ

نمبر 5 اور 6

رولوکا

پراسرار قوتوں کا مالک

مکمل اور طویل ترین داستان حیرت

کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قسط نمبر 47 سے قسط نمبر 58 تک

قسط نمبر 59 سے قسط نمبر 70 تک

تحریر: اے وحید قیمت فی کتاب = 150/-

نایدیدہ قوتوں کی زور آزمائی، کالی دنیا کی بدروحوں

کی شرانگیزی، جنات کی دیدہ دلیریاں، خونی

آتماؤں کی تحیر انگیز اور حیرت انگیز ناقابل

فراموش ہاتھ پائی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے

خونچکاں بھونچکاں معرکہ جیسے پڑھ کر پڑھنے

والے مہبوت اور انگشت بدندان رہ جائیں گے

اور طویل ترین عرصہ تک یہ تمام کہانیاں ذہن کے

پردے پر جھلکاتی رہیں گی۔

ڈریکائی کیشنز

کتاب مارکیٹ نیو اورڈ ویلز کاراجی

Ph:32744391



اپنی ضرورت کی ہر چیز خریدی، کھانے پینے کا مکمل سامان اور اس کے ساتھ ہی کچھ اسلحہ جو اپنی حفاظت کے لئے بہت ضروری تھا۔

پھر میں اپنے اصل سفر پر روانہ ہوا، میں نے ایک نہایت مضبوط جیب کرائے پر لی تھی جو مشکل راستوں پر نہایت سبک رفتاری سے مجھے اپنی منزل کی طرف لئے جارہی تھی۔ میرے ذہن میں کوئی واضح پلان تو نہیں تھا لیکن مجھے ہر حال میں اس وادی تک جانا تھا جنگل شروع ہو چکا تھا جو اتنا گہنا بھی نہیں تھا کہ جیب باہر ہی روکنی پڑی۔ کچے راستے پر چلتے ہوئے جیب کو مسلسل دھچکے لگ رہے تھے۔ میں انتہائی احتیاط اور مہارت سے ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا ابھی میں نے کچھ فاصلہ طے ہی کیا تھا کہ ایک شیر کی دہشت ناک دھاڑ سے میں خوف سے جھمد ہو کر رہ گیا۔

میں نے جیب روکی نہیں اور آہستہ رفتار سے آگے بڑھنے لگا میں نے احتیاطاً پستول بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں ڈرائیوگ کے ساتھ ساتھ مسلسل ارد گرد یہ بھی نظر رکھے ہوئے تھا لیکن مجھے کہیں بھی شیر دکھائی نہ دیا۔ جیسے میں کچھ آگے بڑھا ایک بار پھر شیر کی غراہٹ سنائی دی لیکن اس بار آواز میں وہ دہشت شامل نہیں تھی۔

میں نے چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا تو کچھ دور مجھے ایک شیر زمین پر آڑا تر چھالینا دکھائی دیا، اس کے جسم سے نکلنے والا خون دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ شیر کی جان خطرے میں ہے، اس کے منہ سے نکلنے والی اذیت میں ڈوبی غرائیں آہستہ آہستہ معدوم پڑتی جا رہی تھیں۔ اس نے زیادہ دیکھنے میں مجھ میں تاب نہیں تھی۔

میں نے فوراً جیب روکی اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر شیر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ قریب جا کر مجھے احساس ہوا کہ اس کی جسمانی حالت واقعی بہت خراب ہے، جیسے ہی میں اس کے نزدیک پہنچا اس نے ایک لمبے کوچھے نظر بھر کے دیکھا اور پھر ایک طرف اس کی گردن ڈھلک

گئی، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر چپک کیا اس کی سانس آہستہ آہستہ آ رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہوا ہے، میں بھاگ کر جیب کی طرف گیا اور اپنا فرسٹ ایڈ باکس اٹھا لیا۔

شیر کے قریب جا کر میں نیچے بیٹھ گیا اور اس کے زخم کی نوعیت دیکھی۔ اک تیر اس کے جسم میں بیسٹ سے جس کی وجہ سے خون مسلسل شائع ہو رہا تھا، خون کو دیکھ کر گھر رہا تھا کہ وہ نہ جانے کس وقت کا لگا ہوا ہے، نہیں وہ کیسے اس کے جسم میں لگا ہوگا کیونکہ اگر کوئی شکاری مارتا تو وہ یوں چھوڑ کے نہ جاتا اور شیر اپنی جسامت کے لحاظ سے بہت کم عمر لگ رہا تھا۔

میں نے احتیاط سے تیر اس کے جسم سے نکالا اور بیگ سے اسپرٹ اور روئی نکالی۔ اس کا زخم اچھی طرح صاف کر کے اوپر کس کے پٹا باندھ دیا کہ خون جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن نہ جانے کیوں میں کشمکش میں تھا، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں شیر کو یوں چھوڑ کے جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

اک فیصلے کے تحت میں جیب کی طرف بڑھا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اس کے بعد میں شیر کی طرف آ گیا میں شیر کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ میں شیر کو اٹھانے کے لئے جھکا لیکن وہ بہت بھاری تھا لیکن کچھ نہ کچھ تو کرتا تھا شکر تھا کہ جیب قریب کھڑی تھی، کسی نہ کسی طرح میں شیر کو جیب تک لایا اور پورا زور لگا کر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

میرا پورا جسم پسینے میں بھج چکا تھا اور اس سانس میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پانی کی بوتل نکالی اور ہونٹوں سے لگائی تب جا کے کہیں حالت قابو میں آئی۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا شام ہونے کے قریب تھی اور رات میں جنگل کا سفر بہت خطرناک بھی ہو سکتا تھا اس لئے میں مناسب جگہ کی تلاش میں آس پاس نگاہیں دوڑانے لگا، ایک مناسب

جگہ دیکھ کر میں نے جیب روک دی۔

جیب سے باہر نکل کر میں نے چادر بچھائی اور

پانچ ایک خیال میرے ذہن میں آیا کہ اگر شیر ہوش میں آ گیا تو وہ بھوک کی وجہ سے کچھ بھی کر سکتا ہے چونکہ وہ زخمی تھا اس لئے وہ خود بخود شکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی رائفل اٹھائی اور جنگل کے اندرونی طرف بڑھ گیا تھوڑی دیر بعد مطلوبہ شکار میرے ساتھ تھا۔

میں نے ہرن کو ایک طرف لٹایا اور اپنے لئے کھانے کا سامان اٹھا لیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔

میری آنکھ شیر کی خوفناک غراہٹ سے کھلی۔ میں جلدی سے اٹھ کر جیب کی طرف بڑھا، اس وقت صبح ہو چکی تھی اور سورج مشرق سے نکلنے کی تیاریوں میں تھا۔ شیر کی غراہٹ اس بات کی گواہ تھی کہ وہ ہوش میں آ چکا ہے اور موت کا خطرہ ٹل چکا ہے۔

جیب کے قریب پہنچ کر میں نے شیشے سے جھانکا۔ شیر اٹھنے کی کوشش میں گر جاتا تھا۔ زخم کی وجہ سے یا پھر جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے۔ میں نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا شیر باہر آنے کی کوشش کرنے لگا، میں نے جلدی سے اسے پکڑا اور باہر آنے میں مدد دی، جیسے ہی وہ باہر آیا میں نے شکار کیا ہوا ہرن اس کے سامنے لاکر رکھ دیا، اس نے ہرن کو منہ لگانے سے پہلے میری طرف دیکھا جیسے میرا شکر یہ ادا کر رہا ہو اور پھر وہ بڑی رغبت سے گوشت کھانے لگا، میں نے اس کے زخم کی طرف دیکھا خون بہنا یقیناً رکتا چکا تھا، کیونکہ پٹی پہ خون جم چکا تھا۔

میں نے باکس سے اسپرٹ نکالی اور شیر کی طرف بڑھ گیا اور آہستہ سے اس کے پاس بیٹھ گیا، احتیاط سے پٹی کھولی، شیر نے صرف ایک بار پلٹ کے دیکھا اور پھر کھانے میں مشغول ہو گیا، میں نے اچھی طرح اسپرٹ سے زخم صاف کرنے کے بعد نئی پٹی

باندھ دی۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں جیب میں بیٹھ گیا اور جیب اسٹارٹ کی، جیسے ہی میں نے جیب آگے بڑھانے کا ارادہ کیا، شیر اچھل کر آگے آ گیا، اس نے اگلے دونوں پیر جیب کے بونٹ پر رکھ دیئے اور آہستہ آہستہ غرانے لگا میں بہت حیران ہوا کہ اسے کیا ہوا، مجھے ہلکا سا خوف بھی محسوس ہوا کہ شاید شیر اپنی اصلیت پر اتر آیا ہے۔

لیکن اس سے اگلا لمحہ پہلے سے زیادہ حیران کن تھا۔ شیر دروازے کے پاس آیا اور اپنے پاؤں سے کھرچنے لگا جیسے اسے کھولنا چاہتا ہو۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، میں نے اٹھ کر پچھلا دروازہ کھولا اور شیر اچھل کر جیب میں سوار ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”یہ جگہ..... یہ جگہ تو میری جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ میں نے کب اسے دیکھا..... کہاں اور کیسے.....؟“ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے سامنے چمیل میدان تھا۔ ویرانی، سناٹا دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے جیب روکی اور نیچے اتر آیا۔ مجھے نیچے اترنا دیکھ کر شیر بہت بے چین ہو گیا، میں نے پچھلا دروازہ بھی کھول دیا تاکہ شیر بھی باہر آ جائے، میں حیران تھا کہ اتنے گھنے جنگل کے بعد اچانک یہ میدان کیسے آ گیا؟ میں ابھی میدان کے کنارے کھڑا ایک سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے بہت سی غرائیں سنائی دیں۔

میں نے جلدی سے مڑ کر پیچھے دیکھا تو خوف کی ایک تیز لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اور وہ سب کچھ جو میں نے خواب میں دیکھا تھا ایک جھماکے سے میرے ذہن میں نمودار ہو گیا۔ اتنی زیادہ تعداد میں بھڑپے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے ان سے مقابلہ کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور دوسرا میرا اسلحہ بھی جیب میں رکھا تھا



میری اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے ایک طرف دوڑ لگادی وہ سب بھی خوفناک غرائشیں خارج کرتے ہوئے میرے پیچھے آنے لگے، شیر جس کو میں ”ٹوٹی“ کہہ کر پکارنے لگا تھا اس نے جب دیکھا کہ بھیڑیے میری جان کے در پہ ہیں تو وہ ان سے بھڑ گیا۔ بہت سے بھیڑیے اپنی زندگی کی بازی ہار گئے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور کیلا ٹوٹی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بھاگتے بھاگتے پیچھے مڑ کے بھی دیکھ رہا تھا۔ کچھ میرے پیچھے بھاگ رہے تھے اور کچھ ٹوٹی سے لڑنے میں مصروف تھے وہ پہلے ہی زخمی تھا اور اس لڑائی میں پھر اس کا خون بہنا شروع ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔ میں نے زور سے اسے آواز دی تو وہ اپنی طاقت سے دوڑنا ہوا میرے پیچھے آنے لگا میں بھی گرتا پڑتا بھاگتا جا رہا تھا۔

مجھے کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ موت لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آتی جا رہی تھی کہ اچانک میری نظر اس کنوئیں پر پڑی، ہو، ہو، خواب والا..... میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہے کیونکہ خواب میں ایسا کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ میں جلدی سے کنوئیں کے پاس پہنچا اور اندر جھانکا۔ وہ بالکل خالی تھا۔ اس کی گہرائی کا بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ بھیڑیے بس جھمک جھنجھتے ہی والے تھے کہ مجھے اسی آدی کا خیال آیا جس نے مجھے اپنا نام کبرا کہہ کر بتایا تھا۔

میں نے زور زور سے اسے پکارا تو جواب میں اس آدی کی آواز آئی ”آنکھیں بند کر کے اس کنوئیں میں چلا نک لگا دو۔“

☆.....☆.....☆

عجیب قسم کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی، میں نے ارد گرد نظر دوڑائی، انتہائی ویران اور غیر آباد سا علاقہ تھا اونچے نیچے پہاڑ، جھاڑ جھکاڑ سے پر علاقہ شام ہونے کے قریب تھی اور میں نے جو کچھ دیکھا اس نے مجھے بہت زیادہ حیران کر دیا، ٹوٹی میرے نزدیک ہی دیکھا بیٹھا تھا، ہمارے ارد گرد بہت سے لوگ تھے، عجیب و

غریب، اجاڑ حلیوں میں، انہوں نے اپنے چہرہ کو چھپایا ہوا تھا، اس لئے میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ ان کے چہرے کیسے ہونگے.....؟ ان کے منہ سے کچھ عجیب سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں اور انہی آوازوں سے میری آنکھ کھلی تھی، ان کی چال دیکھ کر مجھے حیرت کا بھٹکا لگا، وہ بالکل متوازی چلتے تھے نہ اپنے سر کو حرکت دیتے تھے اور نہ اپنے بازوؤں کو، ان میں سے کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا یہ نہیں وہ ہماری آمد سے بے خبر تھے یا خود کو ظاہر کر رہے تھے۔

مجھے ٹوٹی کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بالکل خاموش سا میرے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اس کی آنکھیں عجیب سا تاثر دے رہی تھیں جیسے جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ اس کے لئے بالکل غیر متوقع ہو۔ میں نے آہستہ سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو اس نے ہلکی سی غرائش خارج کی..... اس کے منہ سے آواز نکلنے کی دیر تھی کہ جیسے ہمارے ارد گرد دھو پھال سا آ گیا ہو، وہ سب لوگ جو پہلے ہماری آمد کو کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے اچانک ہماری طرف دوڑ پڑے، ان کی رفتار بہت کم تھی لیکن وہ دوڑنے کے سے انداز سے ہماری طرف آرہے تھے، ان کے منہ سے بھیا نک اور غیر انسانی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم تک پہنچتے میں ٹوٹی کو ساتھ لیتا ہوا ایک طرف دوڑ پڑا..... تیز دوڑنے کی وجہ سے میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ مجھ میں مزید دوڑنے کی سکت نہیں تھی اس لئے میں نیچے گر پڑا، وہ شور ہمیں بہت دور سنائی دے رہا تھا کیونکہ ان کے دوڑنے کی رفتار بہت کم تھی، میں نیچے گرنا ہی نہیں رہا تھا، ٹوٹی کبھی پیچھے نہ دیکھا اور کبھی میری طرف، اس کی حالت سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

میں نے گرے گرے مڑ کے دیکھا، وہ ہمارے بہت قریب پہنچنے والے تھے، میں نے آخری کوشش کے طور پر اٹھنے کی کوشش کی میں اٹھنے میں کامیاب تو ہو چکا تھا لیکن تھوڑا بہت دوڑنے کے بعد میں پھر گر پڑا۔

لبہ میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔

اچانک ٹوٹی میرے پاس بیٹھ گیا اس کے بیٹھنے کے انداز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پاؤں سے زمین کھرچنے لگا۔ اس کے منہ سے غرائشیں نکل رہی تھیں۔ جانے وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ پیچھے دیکھتا اور پھر میری طرف دیکھ کر غرائشیں لگا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں آ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ وہ خود بھی زخمی تھا ایسے میں ہر آواز کیسے سہار سکتا تھا؟ لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا میں کوشش کر کے اس پہ ہمار ہو گیا میرے اس کے اوپر بیٹھنے کی دیر تھی کہ وہ ایک زوردار دھاڑ سے اٹھا اور سر پٹ دوڑنے لگا، اس کے بجائے کہ انداز سے کہیں بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ زخمی ہے.....!

میں نے خود کو بڑی مشکل سے قابو کیا ہوا تھا۔ بھاگتے بھاگتے نہ جانے کتنی دیر ہوئی کہ اچانک ٹوٹی دک گیا۔ جتنی تیزی سے وہ دوڑ رہا تھا اس کے بعد یکدم اس کے رکنے سے مجھے زوردار جھکا لگا اور میں اچھل کر نیچے گر گیا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد میرے حواس بحال آئے تو میں نے بڑی مشکل سے خود کو کھڑا کیا اور پھر ماسنے دیکھ کر میرے ہوش و حواس بالکل ٹھنڈ ہو گئے۔

وہ سانپ تھے ہزاروں کی تعداد میں اور سب کے سب ایسا چمکنے والے تھے ہمارے طرف بلکہ تیزی سے بڑھ رہے تھے ان کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں، پہلے تو کچھ لمحے میری عقل نے کام کرنا بالکل مجھڑ دیا پھر موت کے خوف نے میرے جسم میں پھر بڑی دوازی، گو کہ آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی لیکن مجھے آخری بار اپنی زندگی کے لئے کچھ کرنا تھا۔

میں جلدی سے ٹوٹی پر سوار ہوا اور اسے ایک طرف بھاگنے کا اشارہ کیا اس سے پہلے کہ ٹوٹی بھاگتا دیکھ کر ڈار آواز میری سماعت سے نکل گئی، لہجہ نہ جانے کس جانا پھانسا لگا رہا تھا۔

”کوبرا کی دنیا میں خوش آمدید دوست.....!“

مجھے یقین تھا کہ تم ضرور یہاں تک پہنچو گے، جو کچھ تمہیں خواب میں نظر آتا تھا وہ سب سچ ہوا، ہو سکتا تھا کہ موت تمہیں چھوٹی لگتی لیکن تمہارے دوست ٹوٹی نے تمہاری جان بچائی، اس نے احسان کا بدلہ اتار دیا جو تم نے اس کی جان بچا کر کیا۔

اب تم چونکہ ہماری دنیا میں پہنچ چکے ہو اس لئے اب اس معاملے کی تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک معاملے میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اور تمہیں یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ صرف تم ہی ہو جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہو۔“ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو میں نے فوراً پوچھا۔

”تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے.....؟“

یہ سوال پوچھتے ہی میرے ذہن میں ایک روشنی سی دوڑ گئی۔ مجھے یاد آ گیا کہ وہ کون ہے.....؟ وہ وہی تھا جو مجھے راستے میں کئی بار ملتا رہا تھا، جس نے مجھے موت سے ڈرانے کی اور خواب کے سچ ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ میرا سوال سنتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”یہ تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ میرا نام کبرا کہہ رہا ہے۔ میں کوبرا کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہوں، یہ ساری سلطنت میری ہے۔ بغیر کسی شرکت کے، لیکن کچھ ایسی مخلوق بھی ہے جو میری اس سلطنت پہ قبضہ کرنا چاہتی ہے، جس کو تم کچھ دیر پہلے دیکھ چکے ہو۔“

اس کا اشارہ یقیناً ان لوگوں کی طرف تھا جنہوں نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔

”تمہیں یہاں لانے کا مقصد یہی ہے کہ تم ان کو ختم کر دو تاکہ ہم پہلے کی طرح پرسکون زندگی گزار سکیں۔“

”لیکن تم انسانی روپ میں کیسے آئے.....؟“ میری الجھن بدستور برقرار تھی۔

”یہ بات سب جانتے ہیں کہ سو سال کی عمر سے گزرنے کے بعد سانپ جو چاہے شکل اختیار کر لیتا



ہے۔ میری عمر بھی سو سال سے اوپر ہے اس لئے مجھے بھی یہ اختیار حاصل ہے۔“

لیکن یہ کون سی مخلوق ہے؟ جو تم کو اس سلطنت سے بے دخل کرنا چاہتی ہے اور تم سب اسے طاقتور ہونے کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ میں نے ابھن بھن سے لہجے میں پوچھا تو جواب دہ بولا۔

”اب سے بہت سال پہلے کی بات ہے اس وقت مجھے نیا دنیا روپ بدلنے کا اختیار ملا تھا۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا..... ہماری بھی کچھ حدود ہوتی ہیں جن کو پار کرنے کی صورت میں ہمیں بہت نقصان ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ ہماری دنیا سے باہر جانے کے لئے کچھ حدود ہوتی ہیں۔ اگر کوئی باہر جانا چاہے تو اسے کچھ شرائط پوری کرنی پڑتی ہیں۔ مجھ سے یہی غلطی ہوگئی میں ان شرائط کو پورا کئے بغیر اپنی حدود سے باہر نکل گیا اور دوسری مخلوق کی حدود میں داخل ہو گیا۔ جیسے ہی میرے قدموں نے ان کی زمین کو چھوا انہیں اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ ہماری دنیا میں با آسانی آسکیں اور پھر اس دنیا کے قانون کے مطابق کچھ عرصہ بعد وہ مکمل طور پر ساری جگہ کے مالک بن جاتے اور ہمیں چن چن کر قتل کر دیا جاتا۔ اور اس مدت کے مکمل ہونے میں کچھ ہی عرصہ رہ گیا ہے اس سے پہلے اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو پھر وہ سب ہو جائے گا جو ہم بالکل نہیں چاہتے۔

ہمارے مہمان گردنے ہمیں ایک عمل بتایا کہ اگر کوئی آدم زاد اس عمل کو کامیابی سے مکمل کر لے تو پھر ہمیں اس مخلوق سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے مل جائیں گے اور اس عمل کے لئے تمہارا نام سامنے آیا، تم میں ہر وہ خوبی ہے جو اس عمل کے لئے ضروری ہے ہم جانتے ہیں کہ تم ہیروں کی وادی میں جانا چاہتے ہو، اس کا راستہ نہایت پرخطر ہے اگر تم نے وہ عمل آسانی سے کر لیا، تو ہم با آسانی تمہیں وہاں تک پہنچا دیں گے۔

اگر کسی بھی طرح کم اس عمل میں ناکامیاب ہوئے تو پھر ہمارے ساتھ تمہاری موت بھی یقینی ہے۔“

میں دم بخود اس کی باتیں سن رہا تھا، جب چپ ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسا عمل ہے اور مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

وہ سب تمہیں پتہ چل جاتا ہے پہلے تم کچھ کھائی لو، یقیناً تمہیں اور تمہارے دوست کو بہت بھوک لگی ہوگی۔ آؤ میرے ساتھ۔“

یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل پڑا اور ہم بھی اس کے پیچھے چل پڑے، اس کی بات سن کر میری بھوک واقعی چمک اٹھی تھی اور ٹوٹی بھی یقیناً بھوکا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو چاروں طرف سے مکمل طور پر بند تھی صرف وہی جگہ تھی جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے۔

سامنے عمدہ قسم کا کھانا موجود تھا اور ایک طرف ایک مردہ ہرن پڑا تھا جو ٹوٹی کے لئے ہی تھا۔

میں نے خوب سیر ہو کے کھایا اور اس کے بعد مجھے اتنی نیند آئی کہ پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ صبح جاگا تو ناشتہ پہلے سے موجود تھا، ٹوٹی بھی میرے قریب ہی بیٹھا تھا، ناشتے کے بعد گبراک آ گیا اور مجھے اس عمل کے متعلق بتانے لگا۔

اس کے مطابق مجھے اک ایسا عمل کرنا تھا جس میں مجھے دو دن بھوکا رہ کر ایک لفظ کو مسلسل دہراتے رہنا تھا۔ پھر دو دن کے بعد مجھے صبح کے وقت اس جگہ کی سرحد پہنچنا تھا جہاں وہ مخلوق رہتی تھی وہاں پہنچ کر مجھے دو دن ہاتھوں میں مٹی اٹھانی تھی اور آسمان کی طرف پینک دینی تھی اور اس کے بعد مجھے فوراً وہاں سے بھاگ آنا تھا اگر اوپر پھینکنے والی مٹی کا ذرا سا بھی ٹکڑا اچھ پڑا کرتا تو فوراً ہلاک ہو جاتا، پھر میرے ہی میں وہاں سے بھاگتا وہ مخلوق فوراً بیدار ہو کے میرے پیچھے لگ جاتی، ان کی رفتار بہت تیز ہوتی اگر ان کے مجھ سے پہلے قدم کوبرا کی سر زمین کو چھو جاتے تو پھر وہ سلطنت انہی کی ہو جاتی اور مجھے ساری زندگی ان کا غلام بن کے رہنا پڑتا، اور وہ وہاں کے مالک بن جاتے اور کوبرا کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو عموماً مفتوح قوموں کے ساتھ ہوتا ہے۔

بظاہر تو وہ عمل اتنا مشکل نہیں تھا لیکن اس کے نتائج بہت بھیاںک ہو سکتے تھے، مجھے تو ہر حال میں وہ عمل کرنا تھا کیونکہ انکار کی صورت میں بھی موت میرا مقدر ہوتی، اور یوں بزدلوں کی طرح مرنے سے بہتر تھا کہ میں لڑ کر مرنا اور اگر مقدر میرا ساتھ دیتی تو میں بچ بھی سکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے وہ عمل شروع کر دیا، ٹوٹی مسلسل میرے ساتھ موجود تھا۔ دو دن بھوکا رہنا اتنا آسان تو نہ تھا لیکن زندہ رہنے کی خواہش بہت سے ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے۔ دو دن بعد جیسے ہی عمل مکمل ہوا گبراک میرے پاس آ گیا پھر اس نے مجھے کھانا پیش کیا دو دن بھوکا پیاسا رہنے کے بعد کھانے کو دیکھ کر میں رہ نہ سکا اور خوب سیر ہو کے کھایا۔

تھوڑی دیر بعد صبح ہوگئی میں ٹوٹی کے ہمراہ اسی جگہ پر موجود تھا جہاں مجھے کہا گیا تھا، میں نے جبکہ کر دونوں ہاتھوں سے مٹی اٹھائی۔ مٹی کیا تھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں تھی اور میں نے اللہ کا نام لے کر اوپر پینک دی اس کے فوراً بعد میں بھاگ کے پیچھے بھاگ گیا۔

جیسے ہی وہ مٹی اوپر بلند ہوئی ایک کان پھاڑ دینے والا شور بلند ہوا اور میں نے دیکھا کہ وہی مخلوق ڈراؤنی آوازیں نکالتی ہوئی میری طرف بھاگی آرہی ہے۔ میں جلدی سے ٹوٹی پہ سوار ہوا اسے بھاگنے کو کہا کیونکہ میں کسی طرح اس مخلوق کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا بھاگتے بھاگتے۔

اچانک ایک اونچی جگہ دیکھ کر ٹوٹی نے چھلانگ لگائی اور میں اس کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک طرف گر گیا۔ وہ مخلوق ہم تک پہنچنے ہی والی تھی کہ ٹوٹی ایک زوردار دھاڑ سے میری طرف بھاگا میں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا اور بہت پھرتی سے اس کے اوپر سوار ہو گیا اور پھر کوبرا کی سرحد پہنچ ہی گئے جیسے ہی میرے قدموں نے اس زمین کو چھوا اس مخلوق کی بھیانک آوازیں بلند ہوئیں اور آٹا فانا ان کے جسم مٹی بن کر بھڑنے لگے اور

تھوڑی دیر بعد ان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

آخر کار میں موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ میں نے جیسے ہی پیچھے مڑ کے دیکھا تو حیران رہ گیا، ہزاروں کی تعداد میں کوبرا میرے پیچھے موجود تھے ان کی سرسراہٹیں مجھے خوف زدہ کئے دے رہی تھیں۔ اچانک گبراک میرے سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے سے خوشی چمک رہی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی مجھے مبارک باد دی اور پھر اپنے منہ سے ایک منکا نکال کے مجھے دیا اور ”یہ منکا دنیا کے چند خوش نصیب لوگوں کے پاس ہے، یہ جب تک تمہارے پاس ہے تم قسمت کے دشمنی رہو گے تم نے ہم پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو ہم کسی صورت نہیں اتار سکتے لیکن اپنی سب سے قیمتی چیز تمہیں دے رہے ہیں، اگر کبھی بھی تم مشکل میں ہو گے تو مجھے آواز دے لینا میں فوراً تمہاری مدد کو آ جاؤں گا۔

اب تم جاؤ ہم تمہیں ہیروں کی وادی میں چھوڑ دیتے ہیں، وہاں سے کیسے نکلنا ہے یہ تمہیں خود سوچنا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل پڑا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہیروں کی وادی میں آسانی سے داخل ہوا جاسکتا تھا۔ یہاں پہنچ کر گبراک نے مجھے الوداع کہا اور میں ٹوٹی کے ساتھ اس وادی کی طرف چل پڑا۔ اونچے نیچے راستے پر چلتے ہوئے ہم آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ پہاڑی علاقہ تھا اس لئے چلتے ہوئے بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی کیونکہ ذرا سا پیر پھسلا تو بندہ سیدھا نیچے سخت زمین پر، اتنی اونچائی سے پتھریلی زمین پر گرنے کا ایک ہی حل نکلا..... موت.....!

سہ پہر ڈھلنے کے قریب تھی اور میں سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے کی مناسب جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں سے ہم گزر رہے تھے وہ راستہ بل کھاتے ہوئے ایک غار میں داخل ہو رہا تھا۔ میں بھی اسی راستے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے پانی کا شور سنائی دینے لگا پھر جیسے ہی میں ایک موڑ مڑا





## جادوگر

عبدالحمید ساگر-کندیاں

نوجوان بولا میں ہر صورت تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں، تمہاری موت کے بعد میں ساری دولت کا مالک بن جاؤں گا لیکن اچانک اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ کچھ ہو گیا جس کا وہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔

جرم و سزا کی ایک اچھوتی اور دل و دماغ کو مبہوت کرتی حیرت انگیز خونی کہانی

”ہاں، میں واقعی جادوگر ہوں، اگر میں جادوگر نہ ہوتا، تو تم جیسی امیر اور خوب صورت حسینہ کو اپنے جال میں کیسے پھنساتا۔“ فرانک نے جواب دیا۔

”ہاں..... ہاں.....! اچھا مذاق کر لیتے ہو تم..... لیکن تم بتاؤ نہ مجھے جادو کے بارے میں۔“ جولی نے کہا۔ جولی ایک امیر لڑکی تھی۔ ٹوکیو شہر کے مہنگے علاقے میں اس کا شاندار بنگلہ تھا۔ ایک مرشد یزیدی، جو ایک حادثے میں

”جادو کے زور سے امیر بن گیا تھا۔“

”کیا تم واقعی، جادو جانتے ہو؟ کیا تم واقعی ایک جادوگر ہو؟“ فرانک، بتاؤ ناں، مجھے۔“ شہر کے ایک مہنگے عیسائیوں میں ایک گول میز کے گرد ایک تیس سالہ شخص جس کا نام فرانک تھا، ایک خوب صورت، سنہری بالوں والی لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ لڑکی جس کا نام جولی تھا، فرانک سے بات کر رہی تھی۔

میری آنکھیں روشنی کی وجہ سے چکا چوند ہو گئیں۔

جی ہاں..... وہ ہیروں کا غارتھا اور وہ روشنی انہیں کی تھی۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پانی ان ہیروں کو چھوٹا ہوا گزر رہا تھا۔ پانی کی رفتار چونکہ بہت تیز تھی اس لئے جب وہ جوش سے غار کی دیواروں سے ٹکراتا تو ہیرے اپنی جگہ سے ٹوٹ کر پانی میں بہہ جاتے۔

جو کچھ میں نے سنا تھا اس کی حقیقت میرے سامنے تھی کچھ یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن وہ خواب نہیں تھا، میں دیوار کے قریب جا کے ہیروں کو چیک کرنے لگا وہ مضبوطی سے چپکے ہوئے تھے میں نے ایک کو پکڑ کر زور سے کھینچا جس کے نتیجے میں میرا پاؤں پھسل گیا اور میں پانی میں بہتا جا رہا تھا۔ ٹوٹی بے چینی سے میرے ساتھ ساتھ ہی دوڑ رہا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب سی غرائشیں نکل رہی تھیں، اس لمحے مجھے ٹوٹی بہت پیارا آیا، میرے اک احسان کے بدلے اس نے ان گنت احسان مجھ پر کر دیئے تھے، پانی بہت تیز تھا جس کی وجہ سے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا، ایک جگہ کچھ گہرائی تھی جہاں پانی گر رہا تھا، میں نے بہت کوشش کی کسی طرح خود کو قابو کر کے نیچے گرنے سے بچاؤں..... لیکن بے سود.....

میرا سر زور سے ایک پتھر سے ٹکرایا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا.....

سورج کی تیز چمبن کی وجہ سے میں نے بمشکل آنکھ کھولی، پہلے تو مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ میں کہاں ہوں پھر ٹوٹی کی موجودگی اور علاقہ غیر..... میرے سارے حواس یکلفت بیدار ہو گئے۔

میں آنکھیں سے اٹھا۔ میرا سرا بھی بھی بہت درد کر رہا تھا۔ ارد گرد نظر دوڑائی تو میں حیران رہ گیا۔ سورج کی روشنی میں وہ وادی جنت کا منظر پیش کر رہی تھی، میں نہیں جانتا تھا کہ میں پانی سے کیسے نکلا لیکن اس وقت میں جس جگہ لیٹا تھا وہاں آس پاس ہیرے بھرے بھرے پڑے تھے اور پانی بھی اپنی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ سورج



ہائی وے سے مل جاتی تھی۔

”فرائک“ گنجیا آدمی بولا۔ ”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی۔“ ”تم فکر مت کرو ایڈی“ ”فرائک نے کہا۔“ ”تم برس اپنے مشن کے بارے میں سوچو، اس کے بعد ملنے والی دولت کے بارے میں۔“ ”اسی کے بارے میں تو سوچ رہا ہوں فرائک“ ایڈی نے کافی کا گھونٹ حلق میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن فرائک میں بھی اسی شہر میں رہتا ہوں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم آتی اہم معلومات کیسے اکٹھی کر لیتے ہو؟“ ”تمہیں یہ بات آہستہ آہستہ سمجھ میں آئے گی، ایڈی“ ”فرائک نے اپنا چشمہ اتارتے ہوئے کہا۔“ ”تم ابھی بچے ہو، عقل کے کپے ہوا بھی تم کیسے کے مسائل میں ہو مجھ جیسے جادوگر کے ساتھ رہو تو بہت جلد سمجھ جاؤ گے، تم ایک بات یاد رکھنا، جتنا میں نے سمجھا ہے صرف اتنا کرنا اپنی عقل لڑانے کی کوشش مت کرنا، اور ویسے بھی میں تمہیں آزما چکا ہوں، تم جب ہمیشہ اپنا ذہن استعمال کرتے رہو مصیبت میں پھنس جاتے ہو۔“ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ایڈی نے گردن جھکائی۔ ”میں ہمیشہ تمہارا کہنا مانوں گا، اچھا فرائک مجھے اگر کچھ تم دے دو تو۔“

”کیا مطلب۔ کیسی رقم..... کیا تم نے پھر سے شراب پینی شروع کر دی ہے۔“ ”فرائک نے بھونٹیں اچکاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں.....“ ایڈی بولا۔ ”دراصل ایک نئی کال گرل دیکھی ہے کل اس نے مجھ سے بات بھی کی، وہ مجھے ایک رات کے لئے پانچ سو یورو میں لے گی، اگر تم کچھ مدد کرو، آج کل اپنا نام خراب چل رہا ہے۔ فرائک“ ”اوحو..... تو تم لڑکی کا مزہ لینا چاہتے ہو۔“ ”فرائک نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں پورے ایک ہزار یورو دوں گا، کیونکہ میں لڑکی کے بالکل خلاف نہیں ہوں، لڑکی چیز ہی ایسی ہے، اس کے بعد وہ دونوں کچھ دیر تک بیٹھے رہے، پھر اٹھ کر چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

ایڈی پانچ منٹ سے پولیس پٹرول کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا۔ جس کا سیاہ رنگ تھا۔ اس نے احتیاط کے طور

تھوڑی سی چپک گئی تھی، لیکن ابھی تک شاندار تھی، اس کا کروڑوں کا بزنس تھا، لیکن اس کا رشتہ دار کوئی نہیں تھا۔ فرائک نے چند روز پہلے ہی جولی سے شادی کر لی تھی۔ جولی اسے اسی کیسینو میں لے گئی تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی ہو گئی۔ پھر بہت جلد ان دونوں نے شادی کر لی۔ فرائک ہلکی موٹھوں والا، ایک عام انسان تھا۔ اس کے سر کے بال کافی گر گئے تھے۔ لیکن اتنے باقی تھے کہ اس کا سر ڈھانپ سکیں۔ فرائک کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جادو جانتا ہے۔ جادو کے ذریعے جو اچیتنا ہے اور پیسے کما تا ہے۔ ”ارے تھوڑا بہت جانتا ہوں۔“ ”فرائک نے کہا۔ ”لیکن یہ مت سمجھنا میں خود غائب ہو سکتا ہوں، یا کسی کو غائب کر سکتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ دراصل اس دنیا میں جو شخص بھی رہتا ہے وہ تھوڑا بہت جادو جانتا ہے۔ یہ دماغ..... یہ انسانی دماغ یہ جادو ہے۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔“

جولی بولی۔ ”اچھا..... تم کو میں شام میں پیک کر لوں گی۔ تم انجوائے کرو، مجھے تھوڑا اپنی ایک فرینڈ سے ملنے جانا ہے۔“ ”ٹھیک ہے بے بی، جادو لویو۔“ ”فرائک نے ہونٹوں کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے کہا۔ بدلے میں جولی نے بھی مخصوص اشارہ کیا اور ہتھے ہوئے کیسینو سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

”تم جانتے ہو کہ اس سڑک پر پورے بیس منٹ بعد پولیس پٹرول آتی ہے جیسے ہی پولیس کی کار گزر جائے تم سامنے والے بنگلے میں کود جانا، دیوار چھوٹی ہے، تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی، تم نے اپنا کام میں منٹ کے اندر اندر کرنا ہے۔ بنگلے کا مین گیٹ تمہیں کھلا ملے گا۔ سرسبز کی چابی بھی اسی میں لگی ہوگی۔ تمہیں بس کم وقت میں اپنا مشن مکمل کرنا ہے۔“

یہ فرائک کے الفاظ تھے۔ اس کے سامنے، ایک گنجیا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک ہنگے ہوٹل میں سینڈویچ اور کافی کا مزہ لے رہے تھے۔ ہوٹل کی اس منزل سے شہر کے وسط میں بنا ہوا وہ بنگلہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ارد گرد ایک گھومتی ہوئی سڑک تھی، جو آخر کار



پرائیک چاقو بھی اپنی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے معمول کے کپڑوں پر کالے رنگ کے کپڑے جو ڈانگری کی طرح تھے پہن رکھے تھے۔ وہ سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس نے دیکھا پولیس پٹرول کی گاڑی گزر گئی۔ سفید رنگ کی یہ کار بہت آہستہ سے گزری تھی۔ کار کے جاتے ہی ایڈی نے سڑک پار کی اور مختلف کیار یوں میں سے گزرتا ہوا بنگلے کی دیوار تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا، پھر جلدی سے بنگلے کی دیوار پھلانگ کر کود گیا۔ ایڈی کو کمرے میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا، وہ اندھیرے میں احتیاط سے چلتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کچھ روشنی نظر آئی۔ اس کمرے میں زبردست بل رہا تھا، ایک مردانا سوا ہوا تھا۔ اس کا منہ نیچے کی طرف تھا۔ اس کے ساتھ ہی پلنگ پر ایک خوب صورت لڑکی سوئی ہوئی تھی۔ اس کے سنہری بال اس کے کندھوں پر پکھڑے ہوئے تھے۔

ایڈی کچھ دیر کا رہا یہ تسلی کرنے کے لئے کہ وہ دونوں کہیں جاگ تو نہیں رہے۔ پھر وہ تیزی سے حرکت میں آیا، اس نے الماری سے دھڑاڑ چھوڑی نکالنی شروع کر دی۔ الماری پہلے سے ہی کھلی ہوئی تھی۔ جس سائڈ پر لڑکی سوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر ایک ٹیکس پڑا ہوا تھا جو کہ خالص ہیروں کا تھا۔ ایڈی نے اسے بھی اپنے بیک میں ڈالا، پھر اس نے کچھ درازیں چیک کیں، جن میں کچھ خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں تھیں، ایڈی نے انہیں اپنی جیب میں ٹھونس لیا، پھر وہ دوسرے لاکر کی طرف بڑھا، اس میں اسے نوٹوں کی بہت سی گڈیاں ملیں، دوسرے ہی لمحے وہ بیک کی زینت بن گئیں، ایڈی اس دوران پلنگ پر سوئے ہوئے مرد اور عورت کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا، کہیں وہ جاگ نہ جائیں، چھوٹی ٹیکس کی ایک دراز میں اسے کچھ کریڈٹ کارڈ، سونے کے کچھ سکے، اور کچھ نقدی ملی، اس نے وہ بھی بیک میں ڈال لی، پھر وہ جب جانے کے لئے مڑا، تو اچانک اس کی نظر میز پر پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈ پر پڑی، ایڈی مسکرایا اور اسے بھی اٹھا کر اپنی جیب میں ٹھونس لیا، وہ کمرے سے باہر نکل کر بنگلے کی چار دیواری میں کھڑی مرشد کے قریب

☆.....☆.....☆

جونہی مرشد کے اشارت ہونے کی آواز آئی، جولی اٹھ بیٹھی، وہ چچی اور اگلے ہی لمحے اس نے فراٹک کو بھی جگا دیا۔ "فراٹک..... ڈارلنگ..... اٹھو کوئی ہماری کار لے جا رہا ہے۔"

"کیا..... تم کیا کہہ رہی ہو۔" فراٹک جو اناسویا ہوا تھا اچانک اٹھ بیٹھا۔ "کون..... کلک..... کون..... ہے..... جولی۔" پھر وہ تیزی سے بھاگا، جولی اٹھ بیٹھی، وہ بھی اس کے پیچھے جا رہا ہے لگی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی، فراٹک ہاتھ میں پستل لئے اندر داخل ہوا، اس نے جولی پر پستل تان لی۔ "آج تم مرد گی، جولی آئی ایم سوری۔"

"کلک..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم فراٹک، یہ کیا مذاق ہے۔" جولی کا منہ پتے ہوئے بولی۔

"مذاق نہیں ہے۔" فراٹک غرایا۔ "آج میں تمہیں واقعی مار دوں گا، پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ میں واقعی جادوگر ہوں۔"

"فراٹک..... مگر ڈارلنگ، میں تمہاری بیوی ہوں۔" جولی نے احتجاج کیونکہ وہ فراٹک کی آنکھوں میں خون دیکھ چکی تھی، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو، میں تو تم سے پیار

کرتی ہوں۔"

"تم لو نام پیار کا۔" فراٹک غرایا۔ "پیار نام کی کوئی چیز پر میں یقین نہیں کرتا، میں دولت کمانا چاہتا ہوں۔ صرف دولت، میرے پاس فاتو وقت نہیں ہے۔ میں آج تمہیں مار دوں گا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مرنے سے پہلے ضرور جان لو کہ میرا پلان کیا ہے اور تم یہ ضرور جاننا چاہو گی۔" جولی خاموش رہی تھی۔ لیکن وہ موت کا خوف محسوس کر چکی تھی۔ وہ ہم گئی تھی۔ اس کا سرخ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دی جو اشارہ تھا کہ وہ واقعی جاننا چاہتی ہے کہ فراٹک اسے کیوں مارنا چاہتا ہے۔

"تم نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔" فراٹک بولا۔ "چور واقعی تمہاری مرشد بن لے گیا ہے، صرف گاڑی ہی نہیں وہ تمام نقلی چیزیں بھی جو میں نے اس کے لئے الماری میں رکھی تھیں۔"

"نقلی..... جولی مشکل سے بولی۔

"ہاں..... نقلی۔" فراٹک نے پستل پر ہاتھ بھرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ پستل اصلی ہے، میں تمہیں مار دوں گا اور پولیس کو بتاؤں گا کہ چور نے تمہیں گولی مار دی، کیونکہ تم نے اس کی بات نہیں مانی، تم نے مزاحمت کی تھی۔ اصلی زیورات بھی میں نے سنبھال لئے ہیں اور زیورات کی انشورنس کی رقم بھی میں لے لوں گا۔ یہی نہیں، گاڑی کی بھی بیمہ کی رقم مجھے ملے گی اور یہی گاڑی بھی۔ وہ چکی ہوئی گاڑی تھی، کی بات تمہیں کہا کس سے سچ دو لیکن تم نے میری بات نہیں مانی لیتا، مجھے پرانی چیزوں سے بہت لگاؤ تھا۔"

"مہ..... مجھے یقین نہیں ہو رہا۔" جولی نے کہا۔

"کس بات پر..... کہ میں سب سے بڑا جادوگر ہوں۔ لیکن تمہارے مرنے کے بعد تمہیں یقین آ جائے گا کہ میں نے کس طرح چالاکی سے بے پناہ دولت اکٹھی کر لی۔ تمہارے مرنے کے بعد کسی خوب صورت سی لڑکی سے شادی کروں گا۔ ہا..... ہا..... ہا....."

"فراٹک کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟"

جولی نے کہا۔

"تم واقعی خوب صورت ہو جان..... لیکن میں

زندگی بھر تمہارے احسانوں تلے دب کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں کسی غریب خوب صورت لڑکی سے شادی کروں گا جسے صرف میں نظر آؤں، لیکن تم ایسی نہیں تھی۔" فراٹک نے کہا۔

"فراٹک۔" جولی بولی۔ "دیکھو ایسا ظلم مت کرو۔ میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا جیسا تم سوچ رہے ہو اور اگر اس چور نے بھی پولیس کو بتادیا کہ اس نے تمہارے کہنے پر چوری کی تھی تو..... تم بخیر نہیں پاؤ گے۔"

"ہا..... ہا..... ہا..... فراٹک نے قہقہہ لگایا۔ "تو..... مجھے کچھ پکلا ڈیڑی بھجھتی ہے۔ وہ چور تب پولیس کو بتائے گا، جب وہ زندہ بچ پائے گا مجھے معلوم تھا کہ اسے مغربی میوزک بہت پسند ہے۔ میں نے ایک چھوٹے ٹیپ ریکارڈ میں ہم فٹ کر دیا تھا اور میز پر رکھ دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اسے ضرور اٹھائے گا۔ اور وہ واقعی اسے لے گیا، پتھارا جیسے ہی آن کرے گا، ہمیشہ کے لئے اوپر چلا جائے گا۔"

"لیکن..... لیکن فراٹک....." جولی بھلائی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس رک گئی ہو۔ "تم مجھے چھوڑ دو، تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو، میری دولت تو تم لے ہی رہے ہو مجھے چھوڑ دو۔"

"تم بھول رہی ہو شاید۔" فراٹک نے کہا۔ "ہم نے تمہاری بھی تو انشورنس کرائی تھی۔ وہ پیسے بھی مجھے مل جائیں گے اور پیسے بھی میں تمہیں زندہ چھوڑ کر کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا۔ گڈ بائی میڈم جولی مجھے افسوس رہے گا کہ تم بے موت مر رہی ہو لیکن کیا کروں تم نے مجھ پر بھروسہ کر کے دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی کی تھی..... ہا..... ہا....."

"ہا..... اس کے ساتھ ہی دھماکے کی آواز آئی اور جولی فرش پر اوندھے منہ گر پڑی، جبکہ فراٹک کپڑے تبدیل کرنے واش روم میں داخل ہو گیا۔

واش روم سے چند منٹ میں فراٹک باہر نکلا اچانک دروازے کو کسی نے زور زور سے کھٹکھٹایا۔

دروازے پر ایک پولیس والا کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆



# بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

قسط نمبر 8

دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لوزیدہ لوزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کھانی۔

بجس اور سپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

**میری** شادی بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہوئی تھی جس کو پریس میڈیا نے زبردست کوریج دیا تھا۔ کون سے اخبارات اور جرائد تھے جس میں ہماری شادی کی نگین تصاویر نہیں چھپی تھیں اور کون سا چینل ایسا تھا جس نے شادی کی تقریب کی فلم نہ دکھائی ہو۔ میں ایک عام سی دلہن کے بناؤ سنگار میں تھی۔ ہماری شادی ایسی تھی جیسے ہندوستان کے راجا رانی کی..... ہماری شادی اور ساجن کے جذبے سخاوت کو خوب سراہا گیا تھا..... کیوں کہ اس روز شہر کے دو ہزار مساکین کو نہ صرف کھانا کھلایا گیا بلکہ کپڑے اور ملبوسات تقسیم کئے گئے۔ اس کے علاوہ پانچ سو ایسی لڑکیوں کا بیاہ کیا گیا جو جہیز نہ ہونے کے سبب گھر بیٹھی تھیں۔ انہیں اتنا جہیز دیا گیا تھا کہ کل سسرال والے انہیں کم جہیز نہ لانے کی پاداش میں نہ طعنہ دیں اور انہیں جلاویں اور ان کی زندگی اجیرن اور حرام کر دیں۔

اس کے علاوہ اس شادی کی تقریب میں نہ صرف فلمی دنیا کی سرکردہ شخصیتیں بلکہ صنعت کار اور بزنس مین اور عام ملازمین اور صحافت کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس یادگار شادی کے بارے میں ایک عام خیال تھا آج تک ممبئی شہر کیا بلکہ پورے ہندوستان میں

ایسی شادی کسی کی بھی نہیں ہوئی..... کئی دنوں تک اس شادی کا چرچا رہا۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ میں جس ساوگی میں تھی اس نے میرے حسن و شباب کو ایسا نمایاں اور اجاگر کیا کہ اس میں چار چاند لگ گئے.....

مہی مومن ہم نے اپنے ہی دیس میں منایا۔ پونا میں آبشار نال کے پاس اس کی ایک کٹھی تھی۔ اس نے سہاگ کی پہلی رات مجھ سے کہا۔

”سرو جا.....! میں نے تم سے اس لئے شادی کہ کہ تم حسن و جمال کی دولت سے مالا مال ہو اور تم نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر جیسے جادو کر دیا تھا..... اور پھر میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ تم نہ صرف بہترین چوہن ساتھی ثابت ہوگی بلکہ پر خلوص بھی..... تم میں ہر جانی پن نہیں ہوگا۔ تم با وفا ثابت ہوگی۔

میں تمہاری محبت اور رفاقت کا بھوکا ہوں..... مجھے کبھی عورت کے گداز بدن کی طلب اور ہوس نہیں رہی..... اگر ہوتی تو میں فلمی اداکارہ، ماڈل کر لڑ اور نو جوان حسین سے حسین لڑکیوں کو بہتر کی زینت بنا سکتا تھا۔ اس لئے کہ میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں..... دولت میں اتنی کشش اور طاقت ہے کہ میں





جس پتی، بہن اور بیٹی کو خریدنا چاہتا تھا خرید سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔۔۔۔۔ میں بے داغ رہا۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اپنی ساری محبت میری جھولی میں ڈال دو۔۔۔۔۔ تمہاری رفاقت اور جذبے کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ تم ہر ماہ جیب خرچ کے لئے جتنی رقم کی ضرورت ہے مجھ سے لے سکتی ہو۔۔۔۔۔ تمہارے اکاؤنٹ میں ہر ماہ پانچ لاکھ روپے جمع ہوتے رہیں گے۔۔۔۔۔ تم اس کی مالک ہوگی۔۔۔۔۔ میں تم سے حساب نہیں لوں گا نہ یہ پوچھوں گا کہ تم اپنی رقم کس طرح خرچ کرتی ہو۔ اس کے علاوہ مزید رقم چاہئے تو وہ بھی مل جایا کرے گی۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات یاد رکھو۔۔۔۔۔ اگر میں نے تم میں ہر جاپانی پن کی بو بھی محسوس کی تو تمہیں دودھ کی کھی کی طرح نکال پھینک دوں گا۔

میں نے کبھی جن کے بارے میں بھولے سے بھی نہیں سوچا اور نہ ہی اس کا خیال آیا۔ آخر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ لیکن اس کے خلاف میرے دل کے کسی کونے میں جو نفرت تھی وہ بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس لئے کہ اس نے مجھے فریب دیا تھا۔ میری محبت اور عزت کو پامال کیا تھا۔ اس طرح دو برس کا عرصہ بیت گیا میں اور ساجن اپنی اپنی دنیا میں گم رہے۔ میں واقعی ساجن سے بچی اور بے حد محبت کرنے لگی۔ ہم دونوں کتنے مگن، خوش اور سرشار تھے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

دو برس کے بعد میں نے سنا کہ شو بھا اور جن میں علیحدگی ہوگئی۔ اس بات سے حیرت تو نہ ہوئی البتہ خوشی ضرور ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس لئے جن کی متعدد فلمیں بری طرح فلاپ ہو گئیں۔ اس جوڑی پر زوال آ گیا تھا۔ پھر اس جوڑی کو فلم سازوں نے اپنی فلموں میں لینا بند کر دیا۔ وہ ایک طوائف مرد تھا لیکن یہ دھند ابھی متاثر ہو گیا جس نے اس کا مستقبل تاریک کر دیا تھا۔ اس کی جگہ نئے اور ابھرتے ہوئے نوجوان ہیروں نے لے لی تھی۔۔۔۔۔ ادھر شو بھا کا سحر ماند پڑنے لگا تو اس نے ایک مارواڑی بڑھے سے شادی کر لی جو

بزنس میں تھا اور وہ اس کی حصہ دار بن گئی تھی۔

پھر ایک روز میری اس سے اتفاقہ ملاقات ہوگئی۔ میں ایک ریستورنٹ میں شام کے وقت اکیلی بیٹھی آکس کریم کھا رہی تھی کہ جن ایک ایسی عورت کے ساتھ داخل ہوا جو عمر میں اس سے دس بارہ برس بڑی تھی۔ جن نے مجھے نہیں دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے اندر نفرت کی لہر اٹھی اور تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہتی تھی لیکن چوں کہ وہ بیرونی دروازے کے پاس جو میز تھی اس پر بیٹھا تھا اور مجھ پر اس کی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ میں اس سے سامنا کرنا اور اس کی شکل دیکھنا نہیں بلکہ اس کے منہ پر تھوکانا چاہتی تھی۔ وہ پوری طرح اس عورت کی طرف متوجہ تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں پوست کئے باتیں کئے جارہے تھے۔ ان کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی پھرے کے تاثرات اور آنکھوں کے والہانہ پن، وارفتگی اور خود پیردگی سے ہو رہی تھی۔ اس ریستورنٹ کے ہال میں لڑکیاں لڑکے۔۔۔۔۔ مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے اسے دیکھا تھا لیکن ان میں سے اسے کسی نے لفٹ نہیں دی تھی اور ایک سر نظر انداز کر دیا تھا۔۔۔۔۔ جب اس کا عروج تھا وہ کسی تقریب اور ریستورنٹ میں گھستا تو مرد اور عورتیں کیا لڑکے اور لڑکیاں اس پر روانہ بن کر ٹار ہوتی تھیں۔ میں نے اس کا عروج دیکھا اور آج اب زوال دیکھ رہی تھی۔ ایک ستارہ تھا جو ڈوب گیا تھا۔ لوگ بھی چڑھتے سورج کی ہی تو پوجا کرتے ہیں۔

دوران گفتگو اس عورت نے اپنے پرس سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ عورت اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے مال دار معلوم ہوئی تھی۔ اس کی تین انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جگ مگاری تھیں۔ اس عورت نے ناشتے کا بل ادا کیا تھا۔ اٹھتے وقت محاسن کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ بڑے زور سے چوکا۔ اس نے ان میزوں کی طرف جن پر مرد بیٹھے تھے اشارہ کرتے

ہوئے شاید اس عورت سے کہا تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہے۔ عورت نے اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر وہ اسے رخصت کرنے باہر گیا۔ دوسرے لمحے میں واپس آ گیا۔ پھر میری میز پر آ گیا۔

اسے دیکھ کر میری سوتی ہوئی پہلی محبت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ نفرت اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ”اوسرو جا۔۔۔۔۔!“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم کیسی ہو۔۔۔۔۔؟ آسمان پر چاند ہر ماہ نظر آ جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی یہ چاند دوسرے کے بعد نظر آیا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے رکی انداز میں کہا۔ ”یہ محض اتفاق ہے۔ آدمی قریب رہ کر بھی دور ہو جاتا ہے۔“

اس نے مجھے اوپر سے نیچے دیکھا۔ پھر بولا۔ ”ان دو برسوں میں تم پہلے سے کہیں حسین، پر شاب، گداز بدن کی اور سولہ برس کی دو شیرازہ ہوگئی ہو۔۔۔۔۔ عمر بڑھنے کے بجائے کم ہوگئی ہے۔۔۔۔۔ تم بڑی خوش قسمت ہو۔ تم نے ایک کھر پتی سے شادی کر کے گھر بسالیا۔“

”یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔“ میں نے تکی سے کہا۔ ”تم نے محبت مجھ سے کی اور شادی کی اور سے کر لی۔۔۔۔۔ آخر مجھے تو اپنا گھر بسانا تھا۔۔۔۔۔ جیون گزارنے کے لئے کسی نہ کسی کا ہاتھ تھا مانتا تھا سو میں نے ساجن کا ہاتھ تمام لیا۔۔۔۔۔ اس نے مجھے جو محبت اور آسودگی دی تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ سے۔۔۔۔۔ میں نے اسے اتنی محبت دی ہے کہ اپنی زندگی میں کسی کو نہیں دی۔ وہ میری محبت کی بڑی قدر کرتا ہے۔“

افسردگی سے کہنے لگا۔ ”میں ناکامی اور مالی مشکلات کے دلدل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی دھنستا چلا جا رہا ہوں۔ اب بہت برے دن آگئے ہیں۔ مالی حالت بڑی ابتر ہے۔ ٹنگ دتی اور قرضوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ پہلے فلم ساز

اپنی فلموں میں لینے کے لئے گفتگوں میری دہلیز پر کتوں کی طرح دم ہلاتے رہتے تھے۔ اب وہ میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔ اب جب میں ان کی منتیں اور ساجن میں کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ایک وقت ہم بھی تمہاری منتیں ساجن میں کرتے تھے تم گھاس بھی نہیں ڈالتے تھے۔۔۔۔۔ لہذا اب تم ہم سے کوئی امید نہ رکھو۔۔۔۔۔ اور پھر تمہاری مانگ اور مقبولیت صفر کے برابر بھی نہیں رہی۔ تم سے کہیں اچھے نئے ہیرو آگئے ہیں جن کا طوطی بول رہا ہے۔۔۔۔۔ بہتر ہے کہ اب تم سخت مزدوری کر کے زندگی گزارو۔“

جب وہ اپنا رونا رو چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہاری شو بھا سے علیحدگی کیوں ہوگئی؟“

”ہم دونوں میں ایک معاہدہ شادی سے قبل ہوا تھا کہ ہم دونوں شادی کے بعد ایک دوسرے کی ذاتی زندگی اور معاملات میں نہیں جھانکیں گے۔ نہ ہی آمدنی سے سروکار رکھیں گے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”جانتی ہو ہندوستانی اداکارائیں دینی، کناڈا اور دوسرے غیر ممالک میں کیوں جاتی ہیں۔ وہاں ان کی بڑی مانگ ہوتی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہیروؤں سے ان سرمایہ داروں کی بیویاں۔۔۔۔۔ ہم میں اس لئے بھید نہ سکی کہ وہ بیک وقت اداکارہ اور کال گرل تھیں۔ بیوی نہیں تھی۔۔۔۔۔ میں نے جو پونجی بچا کر رکھی تھی اسے بڑی احتیاط اور کفایت شعاری اور قناعت سے خرچ کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا یہ کب تک ساتھ دے گی۔۔۔۔۔ کاش! میں نے شو بھا سے شادی کی بھول نہ کی ہوتی اور ہم دونوں نے گھر بسالیا ہوتا۔“

”بھگوان جو کرتا ہے وہ اچھا ہی کرتا ہے۔۔۔۔۔ اس نے بڑے دیا کی جو میں غلاطی کے دلدل میں گرنے سے بچ گئی۔“

”سنو سرو جا۔۔۔۔۔!“ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”پران باتوں کو بھول کر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی محبت کی تجدید کرتے رہیں۔۔۔۔۔ میں آج تک تمہاری محبت نہیں بھولا ہوں نہ کبھی بھول سکتا ہوں۔ شو بھا نے



مجھے بڑے سبز باغ دکھائے کہ میں اس کے فریب کے جال میں پھنس گیا۔ سارا تصور میرا اپنا ہے۔ مجھے کتنا دکھ، افسوس اور شرمندگی ہے میں بتا نہیں سکتا۔ میری جان..... میری سرو جا.....! میری محبت میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے چروں میں گر جاؤں۔“

”سنو بچن.....!“ میں نے سپاٹ لہجے میں غیر جذباتی انداز سے کہا۔ ”میری وہ پہلی محبت جس پر میں نے اپنا تن من سب کچھ بچھا کر دیا یہ جانتے ہوئے بھی تم ایک بھورا ہو..... مجھے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا..... ذم اور گھمنڈ تھا..... غرور اور مان تھا کہ میری محبت میں ڈوب کر کسی اور پر ٹوٹ نہیں پڑو گے..... یہ میری بھول تھی..... تم نے شو بھا سے شادی کر لی جس کا مجھے بڑا صدمہ اور دکھ ہوا..... حالاں کہ ساجن کا رشتہ آیا تو میں نے ٹھکرادیا۔ جب میں نے تمہاری شو بھا سے شادی کی خبر سنی تو میں نے انتقاماً ساجن سے شادی کر لی..... ساجن نے مجھے جو محبت کی دولت دی تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے..... اب میں نہ صرف ساجن کی پتی بلکہ محبوبہ بھی ہوں۔ اس کی عزت میں..... لہذا اب تم مجھے اور میری محبت کو بھول جاؤ اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا..... مجھے تمہاری صورت تک دیکھنا گوارا نہیں۔“

”میری جان.....! یہ فلمی مکالمے رہنے دو.....“ وہ بڑی بے غیرتی سے بولا۔ ”تم کتنے دنوں تک میرے سنگ رہی ہو..... ایک پتی کی طرح..... کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ میں تمہاری سدا کے لئے پتی بن چکی ہوں۔“

”اب تم پرانے دنوں اور باتوں کو بھول جاؤ..... اب ماضی حال نہیں بن سکتا۔“ میں نے زہر خند کہا۔

”تم چاہو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا.....؟“ وہ ہنس کر بولا۔ ”تمہارا پتی بے حد مصروف ترین آدمی ہے۔ لہذا اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کچھ مشکل نہیں ہے اور پھر وہ ان دنوں شہر میں نہیں ہے۔ وہ سات دنوں کے لئے ملک سے باہر ہے۔ ہم اس غیر حاضری میں محبت کی

تجدید کر سکتے ہیں۔“

یہ تمہیں کس نے بتایا کہ میرے پتی سات دنوں کے لئے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں..... اس لئے کہ یہ ان کا خفیہ کاروبار ہے۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”دفتر والوں کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا وہ بیرون ملک کے دورے پر ہیں۔“

اس نے میری اس بات کا جواب نہیں دیا۔ سجن کہنے لگا۔ ”میں چار دنوں سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ خوار ہو رہا ہوں۔ میرے جوتے ہس گئے ہیں۔ آج اتفاق سے تم مل گئیں تو لگا کہ مجھے میرا اپنا مل گیا ہے..... تم اتنی بے رحم، ظالم اور سنگ دل نہ ہو۔ کیا سنہرا موقع ملا ہے ملن کا..... وہ فلیٹ جو میرے دوست کا ہے اب بھی میرے پاس ہے جہاں ہم نے یادگار اور ناقابل فراموش گھڑیاں گزاریں..... کیا سنہرا موقع ملا ہے ملن کا.....“

”سجن.....“ میں پھنکاری۔ ”بہتر ہے تم میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ..... ایسا نہ ہو کہ میرا ہاتھ اٹھ جائے اور تم تماشا بن جاؤ۔ تم میرے سینڈل دیکھ رہے ہو کتنے مضبوط ہیں۔“

”وری گڈ سوٹ ہارٹ.....“ وہ ہنسا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں کبھی چکی گولیاں نہیں کھیلیں..... میری زندگی اور اس فلیٹ میں جتنی بھی لڑکیاں اور عورتیں آئیں وہ آج بھی پچھی بنی ہوئی ہیں..... جن کی بدولت میں ایک حسین اور رنگین زندگی گزار رہا ہوں..... وہ پنجرہ ایسا مضبوط ہے کہ تو نہیں سکتیں..... میری کئی فلمیں فلاب ہو گئیں لیکن میں نے جو فلم بنائی وہ کبھی فلاب ہوئی اور نہ ہوگی..... نہ ہو سکتی ہے..... روز اول کی طرح باکس آفس پر ہٹ جا رہی ہے..... یا یوں سمجھ لو کہ مجھے ایک طرح سے پیش مل رہی ہے..... ویسے ان سب میں ہر لحاظ سے تم ٹھکراؤ شکار ہو..... مولی مرغی..... سو نے کا انڈا دینے والی.....“ وہ پھر کہنے پن سے ہنسا۔ پھر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ خراب تم ایسا کرو کہ یہ لفافہ لے جا کر گھر

میں آرام سے دیکھنا..... اس میں تمہارے وہ جذباتی اور رومانی تین خط جوتے نے میرے نام پر لکھے تھے ان کے فوٹو اسٹٹ ہیں..... ملن کی راتوں میں ہونے والی گفتگو جنہیں تم نے سہاگ رات کا نام دیا..... اس کا ٹیپ..... اور پھر جشن کی عکس بندی..... اس کی سی ڈیز بھی ہے..... میں نے تمہارے لئے کوئٹہ مقرر کیا ہے..... ہر سات دن میں دو دن..... اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ماہانہ پانچ لاکھ روپے کا نذرانہ پیش کر دوگی..... اگر تم نے ادائیگی میں تاخیر کی تو جرمانہ پھرنا پڑے گا.....“

میرے جی میں آیا کہ پیر سے جوتی نکال کر اس کے چرے کا جغرافیہ بگاڑ دوں..... پھر خیال آیا کہ بات کا چنگیز بن جائے گا۔ ایک اسکیٹل بن جائے گا۔ اس لئے کہ میں نہ صرف ایک حسین و جمیل عورت ہوں بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت کی پتی ہوں۔ رسوائی اور بدنامی ہوگی۔ میں نے بڑا ضبط و تحمل کیا۔ پھر اس سے پوچھا۔

”کیا یہ ساری غلاظت تمہارے پاس ہے.....؟“

”نہیں.....“ اس نے سر ہلایا۔ ”میرے پاس صرف ٹیپ اور ویڈیو فلم ہے۔ تمہارے تینوں خط و نوڈرما کے پاس ہیں۔“

”کیا میں وہ خط خریدنا چاہوں تو تم اس کے لئے تیار ہو.....؟“

”ان میں سے کوئی ایک چیز بھی قابل فروخت نہیں ہے.....؟“ وہ استہزاء سے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں خط کے لئے نوڈرما سے رابطہ کرنا ہوگا..... وہ ایک تیرے دو شکار کا چاہتا ہے.....“

میں بری طرح ان دونوں شیطانوں کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ میرا سر گھوم گیا۔ مجھے ان دونوں کو خوش کرنا ہوگا..... او بھگوان..... میں نے سر تھام لیا۔

مجھے اپنے کئے کی کیسی سزا مل رہی تھی۔ وہ مجھے خاموش اور بے بس پا کر مسکرایا۔ پھر اس کیلئے بڑی بے غیرتی سے کہا۔

”آج کیم تاریخ ہے۔ میں تمہیں سات دنوں کی مہلت دے رہا ہوں۔ تم سات تاریخ کی شام نوڈرما کے فلیٹ پر آؤ گی اور ساتھ میں پانچ لاکھ کی رقم بھی لیتی آؤ گی..... پھر صبح جاؤ گی..... پھر دوسرے دن آٹھ تاریخ ہے..... دوپہر کے وقت نوڈرما تمہارے اور ایک لاکھ روپے کے انتظار میں ہوگا۔ تم وہاں سے سات بجے شام نکلو گی اور اس کی ہر بات مانو گی..... تم نوڈرما سے واقف ہو..... اس سے دو ایک مرتبہ مل بھی چکی ہو.....“

اتنا کہہ کر اٹھا اور مجھے ایک لفظ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا۔ جاتے جاتے بولا۔

”دو برسوں کے بعد نہ صرف سپنا پورا ہو گیا اور دل کے ارمان سارے نکلیں گے۔“

اگر میں ساجن کی پتی نہ ہوتی تو میں اپنے دل کے سارے ارمان پورے کر لیتی..... ایک خون خوار بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑتی نہ صرف اس کا چہرہ نوچ لیتی بلکہ آنکھیں بھی پھوڑ کر اسے بیٹائی سے محروم کر دیتی۔

میں گھر آئی۔ بیڈروم کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹنی لگا دی۔ میں نے ملازمہ سے کہہ دیا کہ چوکیدار سے کہو کہ گاڑی گیراج میں بند کر دے۔ کوئی بھی آئے تو اس سے کہہ دے کہ بیگم صاحبہ پونا گئی ہوئی ہیں۔ دو دن بعد آئیں گی۔ کوئی بھی ٹیلی فون آئے تو اس سے یہی کہہ دینا..... میں نے اپنا فون بند کر دیا اور موبائل بھی..... میں نے ملازمہ سے کہہ دیا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

میں نے لفافے میں سے تمام چیزیں نکالیں۔ سب سے پہلے میں نے تین خط پڑھے تو سر پیٹ لیا..... ہائے رام..... یہ خط میں نے لکھے ہیں..... میں نے اپنا سر پیٹ لیا..... کیا ایک شریف لڑکی ایسے بے ہودہ فحش اور لغو خط بھی لکھ سکتی ہے.....؟ کوئی یقین نہیں کرے گا..... یہ مجھے کیا ہو گیا تھا.....؟ میں نے اپنے آپ کو جھٹلانا چاہا..... نہیں..... نہیں..... ہرگز نہیں..... یہ خط میں نے نہیں لکھے.....؟ یہ کسی اور کی کارستانی ہے.....



لیکن اس کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دے رہا تھا یہ میری لکھا ہے..... میں اپنا خط پڑھ کر شرم، ندامت اور خجالت سے پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔ پھر میں نے ایک گلاس ششدر پانی پیا۔ اس لئے میرا حلق خشک ہو گیا۔ میرا صرف ایک خط ہی کافی تھا جو میری زندگی تباہ و برباد کر سکتا تھا۔ دوسرے دو خط پہلے کے مقابلے میں انتہائی شرمناک تھے۔ ایسا خط تو صرف ایک طوائف ہی شاید لکھ سکتی ہو۔

پھر میں نے ٹیپ ریکارڈ میں کیسٹ لگا کر سنا..... میری گفتگو ان خطوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی داشتہ کی گفتگو ہو..... میں زیادہ سن نہ سکی۔ ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا۔

پھر میں نے سہاگ راتوں کی ویڈیو دیکھی..... بھونچکی ہو گئی..... اس انداز سے عکس بندی کی گئی تھی کہ جن کا چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میری حرکات و سکنات اور ایک حیوان میں فرق نہ تھا..... میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی..... اس فلیٹ میں خفیہ کیمروں کا حال بچھایا ہوا تھا۔ مجھے ممنوعہ لیکچر اور شرمناک فلمیں یاد آئیں..... میرا سر گھومنے لگا تو اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر میں بے ہوش ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ میں خاصی دیر تک تکیے میں منہ دیے روتی رہی۔ جب آنسو تھے تو دل بھی تھما..... مجھے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی کچن میں آئی اور کافی بنائی۔ بیڈروم میں آ کر کافی پیتے ہوئے سوچنے لگی کیا کروں..... کیا خودکشی کروں.....؟ مرنا بچنا آسان تھا اتنا ہی مشکل بھی..... پھر میرے اندر کی عورت غضب ناک ہو اٹھی..... میری عورت نے جج کر کہا..... انتقام..... انتقام..... اس سے انتقام لیا جاسکتا ہے..... اس کی ایک صورت تھی کہ خط، تصویریں اور فلم خریدوں..... جب وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو کسی اجرتی قاتل کی خدمات حاصل کر کے وودو شرما اور جن کو موت کی نیند سلا دوں۔

نہ رہے ہانس نہ بچے ہانسری.....

پھر میں نے دوسرے دن ان پرائیویٹ سرائے رسالوں سے بہروپ بدل کر اور ایک سہیلی کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی۔ انہوں نے ماجرا سن کر کہا کہ تصویریں، فلم اور خطوں کا حصول اتنا آسان نہیں ہے..... پہلے تو ان کی نقلیں دکھائیں..... پھر منہ مانگی فیس دینی پڑے گی۔ پھر میں نے سوچا کہ اب کیا کروں..... پھر تمہارا خیال آیا۔ تمہارے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اس لئے آئی ہوں کہ ان سے نجات دلاؤ..... مجھے ہر قیمت پر ان دونوں بلیک میلروں سے نجات پانا ہے..... مجھے نہ صرف ایک کروڑ کی رقم..... اگر مجھے تمہاری ہر خواہش بھی پوری کرنی پڑی اور تمہیں خوش بھی کرنا پڑا تو انکار نہ کروں گی..... اس لئے کہ اس وقت میرے اعصاب پر انتقام کا جنون شامل ہے..... میں اس کے لئے بہت دور بھی جاسکتی ہوں۔ میں ذہنی طور پر ہر بات کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں..... مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کرنے والی ہوں۔“

پھر میں نے پرس سے ایک لفافہ نکال کر ٹائیگر کے سامنے ڈال دیا۔ پھر بولی۔

”اس میں میرے تینوں خط، کیسٹ اور فلم بھی ہے۔ تم اطمینان سے گھر جا کر دیکھ لینا..... صرف پانچ دن کی مہلت رہ گئی ہے.....“ پھر میں نے اپنے پرس سے ایک بلیک چیک نکال کر سامنے رکھ دیا۔

ٹائیگر نے اس لفافے اور چیک کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر وہ حیرت سے بولا۔

”تم ایک طرف تو میری بھابھی ہو اور دوسری طرف ایک ایسی عورت جو اپنے کئے کا خمیازہ بھگت رہی ہو..... کیا تم مجھے اس قدر گھٹیا، بچ اور قبیح سمجھتی ہو کہ..... میں تمہیں اس حالت میں دیکھوں جو ایک شوہر دیکھتا ہے..... مجھے خط پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ گفتگو سننا پسند کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری کہانی سن کر اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کس غلاطی کے دلدل میں گری ہوئی ہو۔“

”تو تم کیا میرا کیس نہیں لو گے.....؟“ سروجا پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ ”تم نے میرا کیس نہیں لیا تو

میں نیچے جا کر کسی گاڑی کے نیچے آ جاؤں گی..... میں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئی تھی۔“

”میں نے کب کیس لینے سے انکار کیا..... تمہارا کیس ضرور لوں گا۔ بھابھی سمجھ کر نہیں..... ستم زدہ سمجھ کر..... تم سے فیس لوں گا۔“

ٹائیگر کی گہری سوچ میں ڈوب گیا تو چند لمحوں کے بعد سروجانے پوچھا۔ ”تم کیا سوچتے لگے ہو؟“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دو برس بعد باسی کڑاہی میں ابال کیوں آیا.....؟“ ٹائیگر کہنے لگا۔ ”اس نے ان دو برسوں میں تم سے ہر طرح کا فائدہ کیوں نہیں اٹھایا.....؟“

”اس لئے کہ دو برس قبل اس کا طوطی بول رہا تھا..... بات یہ تھی کہ ان کے اور شوہما کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ یہ تھا دونوں ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیں گے..... ان دونوں نے اپنی اپنی شہرت، جوانی اور کشش سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ دونوں اپنی اپنی گندگی چھپا رہے تھے..... شوہما کی کالی راتوں سے اس کی دولت میں اضافہ ہو رہا تھا اور جن کی زندگی میں امیر کبیر گھبرانوں کی لڑکیاں اور عورتیں آ رہی تھیں۔ صرف چھ ماہ میں اس کی چار فلمیں ایسی فلاح ہوئیں کہ اس نے ان کا حال مستقبل تاریک کر دیا۔

چوں کہ کوئی بھی فلم ساز انہیں فلموں میں نہیں لے رہا تھا اس سے علیحدگی ہو گئی۔ جن نے شادی سے قبل جو لڑکیوں عورتوں کو بلیک میل کرنے کے لئے غلاطی سے بھری فلمیں بنا رکھی تھیں وہ ان سے فائدہ اٹھانے لگا اور اٹھا رکھا ہے۔ اس روز رینٹورنٹ میں جو عورت جن کے ساتھ آئی تھی اس سے پہچانتی ہوں وہ بڑی رنگین مزاج عورت ہے۔ اس شہر کے سب سے بڑے سٹ باز کی بیوی ہے جس کا نام پچل برکاش ہے۔ وہ کرکٹ کھلاڑیوں کو پھانسی ہے۔ میچز جس کرائی ہے۔ کون سا ایسا ہیرو ہے اور کھلاڑی ہے جن سے اس کی دوستی اور تعلقات نہیں ہیں۔ دیکھنے میں اٹھائیس برس کی لگتی ہے لیکن اس کی کاٹھی ایسی ہے کہ عمر کا پتا نہیں چلتا۔ اس کی

عمر پچیس برس سے زیادہ ہے۔ اس میں بے پناہ جسمانی کشش ہے جو مردوں کو متاثر کرتی ہے۔ معلوم نہیں کیا حالات تھے کہ جن کا شکار ہو گئی۔ وہ آج اب بھی اس کے اشاروں پر ناپجی ہے۔“

”دال میں کچھ کالا ہے.....“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں وہ قدرے توجہ اور دھیان سے سنو..... میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے جس سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے گی۔ وودو شرما اور جن دونوں موذی سانپ ہیں۔ ان کا سر پچل دینا اشد ضروری ہے۔ اب تم جاؤ۔“

یہ لفافہ میں اسے اٹھایا اور اسی وقت نہر آتش کر دینا چاہوں گا۔“

☆.....☆.....☆

سروجانے وودو دھن کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ ٹھیک پانچ بجے ایک لاکھ کی رقم لے کر اس کے فلیٹ پر پہنچ رہی ہے۔ صرف آٹھ بجے تک رہے۔ اس سے زیادہ پانچ منٹ بھی نہیں..... لیکن اس کی ایک شرط ہے کہ وہ صرف ایک نظر تینوں خط دیکھے گی۔

ٹھیک پانچ بجے سروجانے اس کے گھر پر دستک دی۔ وودو شرما چار بجے سے اس کے انتظار میں مرا جا رہا تھا۔ کھڑکی میں کھڑا مین گیٹ اور پارکنگ لاث پرنگا ہیں جمائے ہوئے تھے۔ پانچ بجتے میں پانچ منٹ پہلے سروجا کی مرشد یز اس اپارٹمنٹ کے احاطے میں داخل ہوئی۔

جب وہ گاڑی سے اتری اور لفٹ کی طرف بڑھی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ شعلہ جسم بنی ہوئی تھی۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا ہوا تھا وہ سروجا کو شراب میں بے ہوشی کی دوا پلا کر اس کی ایسی تصویریں بنائے گا جو جن کے پاس ہیں تاکہ سروجا سے خوب دولت بٹور سکے۔ اس کے دو تین شکار تھے لیکن ان میں سروجا جیسا گھڑا شکار نہ تھا۔

اس نے پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا۔ سروجانے ایک دل کش مسکراہٹ سے اسے نمسکار کیا جس کی وودو شرما کو قوت نہ تھی پھر وہ اسے نشست گاہ میں لے آیا اور اس سے کہا کہ بیڈروم میں چلتے ہیں۔ سروجا







”ایک منٹ.....“ وودوشرما بولا۔ ”شکنتلا میں تمہاری تصویریں لا کر دے رہا ہوں..... تم دونوں ساتھ چلی جانا..... جانے کیوں مجھے تم دونوں پر رحم آ رہا ہے..... میں اب اپنے سارے پاپ دھو دینا چاہتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر وودوشرما کمرے سے تیزی سے نکلا اور سامنے والے بیڈروم میں گیا۔ بیڈروم کا دروازہ بند کرنا بھول گیا یا غلطی کے باعث اسے خیال ہی نہیں رہا..... دیوار پر ایک عورت کی پورٹریٹ آویزاں تھی۔ اسے اتارا تو دیوار میں ایک تجوری نصب تھی۔ پھر اس نے تجوری کھول کر ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خنجر چمک رہا تھا۔ پھر وہ لپک کر آیا۔ دبیز پرکھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک خنجر دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے۔

”شکنتلا.....! تم اس واش روم میں جاؤ..... اس وقت تک بند رہو گی جب تک اس سے سارے ارمان پورے نہ کر لوں۔ یہ مجھے خوش کئے اور مہربان ہوئے بنا جا رہی تھی..... چلو..... واش روم میں چلو..... میں تم سے بعد میں نمٹوں گا..... ہاں شور مچانے کی حماقت نہ کرنا.....“

وودوشرما کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر شکنتلا کا بدن لرزے لگا۔ وہ غش کھا کر فرش پر گر گئی۔ وودوشرما کو شکنتلا پر زہرہ برابر بھی رحم نہیں آیا۔ واش روم دبیز کے قریب دائیں ہاتھ پر تھا۔ اس نے ٹوپکڑ کر گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ پھر اس نے سروجا سے کہا کہ وہ چند قدم پیچھے ہٹ جائے۔ جب وہ پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ چوں کہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور لات مار کر پورا کھول دیا۔ پھر اس کی چوٹی پکڑ کر واش روم میں گھسٹ کر فرش پر ڈال دیا۔ پھر دروازہ بند کر کے باہر سے پختی لگا دی۔

اگر وودوشرما کے ہاتھ میں خوف ناک قسم کا خنجر نہ ہوتا تو وہ اسے دھکا دے کر یا ٹیبل لیپ سر پر مار کر نکل جاتی اور نیچے جا کر بدن کو بتا دیتی..... خنجر کی دھار ایسی تیز تھی کہ اس کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ ایک فٹ سے زیادہ

لمبا تھا۔ اس نے خود کو قابو میں برسکون رکھا۔ پھر اس نے پرس میں سے ایک پڑیا نکال کر مٹھی میں دبائی۔ اس کی حرکت وودوشرما کی نظروں سے پوشیدہ رہی۔ پھر اس نے سروجا سے اتہڑائی لہجے میں کہا۔

”میری آرزو پوری کیے بنا جا رہی ہو..... اب تم شرافت سے بیڈروم میں چلو..... پرس اور لباس نکال کر ایک طرف ڈال دو..... ایک بات سن لو..... تم جتنی محبت، خود سیر دگی اور فیاضی سے پیش آؤ گی تو میں بھی ایسا ہی پیش آؤں گا۔ میں خطوں کے چھن جانے کا فم مٹانا چاہتا ہوں..... لیکن وہ کیسے مٹ سکتا ہے..... میں نے جن کو پانچ لاکھ کی رقم دی ہے۔ میں تمہاری تصویریں اتاروں گا۔ تم قرض نہیں کرو گی اس لئے کہ وہ خطوں کا نعم البدل ہوگی..... خطوں کے جانے کا اب ملال نہیں ہوگا..... چلو..... اگر تم نے تعاون نہ کیا تو تمہارے جسم پر خنجر کی نوک سے خراشیں ڈال دوں گا۔“

اس نے بائیں ہاتھ میں خنجر تھام لیا اور دایاں ہاتھ سروجا کی کمر میں ڈال کر اسے قریب کر لیا تو پشیم زون میں سروجا نے وہ پڑیا جس میں سفید غوف تھا اس کی دونوں آنکھوں میں جھونک کر اس کا سر اتارے زور سے دبیز کو چوکھٹ سے لگرایا کہ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے گالیاں دینے لگا اور دھمکیاں بھی..... پہلے تو سروجا نے خنجر اٹھایا۔ پھر لپک کر میز پر رکھا ہوا جیتیل کا لیپ اٹھایا اور وودوشرما کے سر پر ایک زور دار ضرب لگائی..... وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکا اور لڑکھڑایا۔ فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کے سر میں گومڑ نکل آیا۔ سروجا نے جا کر دیکھا۔ اسے خوب ہلایا۔ چوں کہ لیپ کی ضرب زبردست تھی وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ دو ایک گھنٹے سے پہلے اس کا ہوش میں آنا مشکل تھا۔

سروجا نے سب سے پہلے باہر کا دروازہ بند کیا وودوشرما کا کوئی دوست جن بھی آ سکتا تھا۔ پھر اس نے خنجر کو کچن میں لا کر ایک کینٹن میں چھپا دیا۔ پھر وہ اس

واش روم میں آئی جس میں شکنتلا کو وودوشرما نے بند کیا ہوا تھا۔ وہ غشی کی حالت میں کراہ رہی تھی۔ پھر وہ شکنتلا کو کسی نہ کسی طرح سہارا دے کر بیڈروم میں لائی۔ پھر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں آئی۔ پھر اسے پانی پلایا تو اس کے حواس بحال ہوئے۔ لیکن وہ خوف زدہ تھی۔

سروجا نے اسے بتایا کہ وودوشرما بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ اس نے وہ خنجر کچن میں چھپا دیا ہے۔ وہ دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتا..... اور پھر اس نے جو سفوف اس شیطان کی آنکھوں میں ڈالا ہے وہ پندرہ سے بیس دن تک دیکھ نہیں سکتا..... یہ سفوف ٹائیگر نے دیا تھا کہ اگر وودوشرما اس پر قابو پا کر بے بس کر دے تو تب وہ اس کی آنکھوں میں جھونک دے۔ وہ اندھے کی طرح ہو جائے گا۔

شکنتلا نے یہ سنا تو اس کی جان میں جان آئی۔ ان دونوں نے مل کر رسی اور ٹیپ تلاش کیا۔ اس کی ٹھیکیں کس کمر نہ پر ٹیپ چپکا دیا۔

ایک دم سے سروجا کی نظر بیڈروم کی تجوری پر پڑی جو کھلی ہوئی تھی جس میں سے وودوشرما نے خنجر نکالا تھا۔ سروجا لپک کر گئی تو شکنتلا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس میں جتنی چیزیں تھیں وہ نکال کر بستر پر رکھ دی گئیں۔ دس بارہ عدد دفاف نے تھے جن میں تصویریں اور ان کے نام پتے اور موبائل نمبر تھے۔ ایک فہرست میں لڑکیوں اور عورتوں کے ناموں کے آگے ان سے ہر ماہ رومات کی وصولی لکھی ہوئی تھی۔ ہر ماہ وہ ڈیڑھ لاکھ بلک میٹلک سے وصول کر رہا تھا۔ اور سات لاکھ نیا لیس ہزاری رقم بھی تھی۔ ویڈیو فلمیں بھی.....

سب سے پہلے سروجا نے شکنتلا کو ایک لاکھ کی رقم دی۔ پھر اس کی تصویر پر زور آتش کرویں۔ وودوشرما کو جلد ہی ہوش آ گیا تو سروجا نے اس کے منہ سے ٹیپ نکال دیا۔ پھر وہ ہڈیانی لہجے میں چیخ کر بولا۔

”یہ مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے..... میرا کردار کے مارے پھٹا جا رہا ہے..... سروجا.....

شکنتلا..... تم دونوں نے میرے ساتھ جو حرکت کی ہے میں بخشوں گا نہیں..... جن تم سے بدلہ لے گا۔“

”تمہیں بیس دن تک کچھ دکھائی نہیں دے گا..... تم اندھوں کی حالت میں رہو گے..... دوسری بات یہ ہے کہ تمہاری تجوری میں جو غلاظت تھی وہ میں نے نکال لی ہے..... سات لاکھ سے زیادہ جو رقم تھی وہ بھی..... اس کے علاوہ زیورات بھی ہیں جو تم نے معصوم لڑکیوں کو بلیک میل کر کے حاصل کئے تھے..... تمہاری شکار لڑکیوں کو فون کر دیا ہے کہ وہ تصویریں اور رومات لے جائیں..... وہ سب کچھ دیر میں پہنچ رہی ہیں..... وہ تمہارا کیا حشر نشر کریں گی یہ بھگوان جانے.....“

”سروجا.....! کینی..... پڑیل..... حرام زادی.....“ وہ خش گالیاں بٹکا ہوا بولا۔ ”ایک لفافہ اور ایک پانی بھی تم نے کسی کو دی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ بخشوں گا نہیں..... تمہارے پتی کو سب کچھ بتا دوں گا..... شکنتلا کی بھی جان لے لوں گا.....“

نفرت اور غصے سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کی نکواسن کمر سروجا بولی۔

”تمہارا خنجر اب میرے قبضے میں ہے..... تم تعاون نہ کرنے کی صورت میں میرے بدن پر اس کی نوک سے خراشیں ڈالنے والے تھے..... اب بتاؤ.....؟ میں کیا کروں..... کیا تم نے سائیں کہ خون کا بدلہ خون ہوتا ہے..... کیوں نہ تمہارے جسم پر خراشیں ڈال دی جائیں..... میں بہترین ڈیزائنر ہوں..... تمہیں کون سا ڈیزائن پسند ہے؟“

وودوشرما دہشت زدہ ہو کر چیخیں مارنے لگا کہ اڑوس پڑوس کے لوگ سن کر اس کی مدد کو جائیں۔ شکنتلا نے فوراً ہی اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ وہ تڑپ کر بے بس ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی۔ لیکن ناکام رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تمام لڑکیاں اور عورتیں یہ خوش خبری سنتے ہی ایک ایک کر کے آ گئیں۔ وہ سروجا کی بے پناہ ممنون تھیں۔ ان میں سے ہر ایک لڑکی اور عورت نے خوب اس کی خاطر مدارت کی..... لاتوں گھونٹوں



اور جوتیوں سے دل کی حسرت نکالی۔ منہ پر تھوکا بھی.....  
ان میں ایک بھی ایسی نہ تھی جس نے جی بھر کے اس کی  
سیوانہ کی ہو..... وہ حرام زادہ چوں کہ بہت ڈھیٹ تھا۔  
توانا جسم کا تھا۔ مرانہیں۔ لیکن بے ہوش ہو گیا۔ سب  
ایک ایک کر کے ٹھیک ٹوسنا سا چھا گیا۔  
اتفاق سے دوسرے دن صبح جن کی کام سے آیا۔  
اس وقت وودو شرما مانی بے آب کی طرح ترپ رہا تھا۔ ان  
لڑکیوں نے اس کے شان دار فلیٹ کی جیسے اینٹ سے  
اینٹ بجا دی..... ایک ایک کمرے، کچن اور ڈرائنگ روم  
کا جغرافیہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ کسی چیز کو سلامت نہ پایا۔ وہ بڑا  
حیران بھونچکا سا ہو گیا۔ اسے یقین نہ آیا۔

وودو شرما نے اسے سارا قصہ سنایا اور بتایا کہ  
سرو جانے اس کی آنکھوں میں جو سفوف ڈالا ہے اس  
سے وہ اندھا ہو گیا ہے۔ میں دنوں تک اس کی بیٹائی  
لوٹ کر نہیں آئے کی۔ میں دنوں کے بعد رفتہ رفتہ وہ  
دیکھنے سے قابل ہو سکے گا۔ اس کے فلیٹ کا جو حشر نشر کیا  
ہے ان لڑکیوں اور عورتوں نے جنہیں وہ بلیک میل کر رہا  
تھا۔ انہوں نے اس کی خوب درگت بنائی۔ اسے ذلیل  
کیا۔ اس پر تھوکا..... معلوم نہیں..... فلیٹ پر اب کتنا  
خرچ آئے گا۔ انہوں نے کوڑی تک نہیں چھوڑی۔ اب  
وہ کی کو بلیک میل کرنے سے رہا۔ کیوں کہ اب اس کے  
پاس کچھ ہے ہی نہیں..... ان لڑکیوں عورتوں نے  
میرے بے ہوش ہونے پر کہا کہ اب میں فلیٹ کے نیچے  
بیٹھ کر بھیک مانگوں۔ اندھا ہونے کے باعث شاید کچھ  
بھیک گزارہ کے لئے مل جائے۔

فلیٹ اور فرنیچر اور تینوں بیڈرومز کی درنگی اور  
مرمت پر تین چار لاکھ سے کم لاگت نہیں آئے گی۔ یہ  
رہنے کے قابل نہیں تاوقتیکہ اسے ٹھیک نہ کیا جائے۔ تم  
میرے فلیٹ پر چل کر رہو..... یہ بہت برا ہوا کہ لاکھ کی  
رقم بھی گئی اور خطوط بھی..... وہ ڈاکو میرے دوستوں میں  
ہی سے ہوگا۔ جب وہ سرو جا کو بلیک میل کرے گا اس  
سیاہ پوش کا پتا چل جائے گا اب تم فکر مند اور پریشان نہ  
ہو۔ تمہارا نقصان اس سے معرود وصول کر لوں گا۔ اسے

بخشوں کا نہیں..... میں نے اس سے پانچ لاکھ کا مطالبہ  
کیا تھا اب تم پندرہ لاکھ کا ہوگا.....  
”تم برا راست ساجن سے بات کیوں نہیں  
کرتے.....؟“ وودو شرما بولا۔ ”وہ ہر ماہ میں لاکھ بھی  
دے سکتا ہے۔“  
”لیکن اس میں ایک بات کا نقصان اور اندیشہ  
ہے۔“ جن نے کہا۔ ”وہ فوراً ہی سرو جا کو طلاق دے  
دے گا۔ وہ میں لاکھ کیا نہیں روپے بھی نہیں ملیں  
گے..... لہذا سرو جا کو بلیک میل کرنے میں ہی فائدہ  
رہے گا۔“

☆.....☆.....☆

جن نے سرو جا سے رابطہ کیا تو وہ بہت برہم تھا۔  
اس نے سرو جا سے کہا کہ میں میں لاکھ سے تیس روپے کم  
نہیں لوں گا..... کیوں کہ تم..... لڑکیوں عورتوں نے  
کر وودو شرما کے فلیٹ کا ستیاناس کر دیا۔ اس کا نقصان  
پورا کرنا ہوگا۔

سرو جانے اس سے کہا کہ تم جس ٹیپ اور قلم کے  
اور تصویروں کے عوض میں لاکھ وصول کرنا چاہتے ہو میں  
اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں..... کیوں کہ یہ ساری  
غلاظت دو تین برس پہلے کی ہے۔ تم نے یہ سب کچھ  
جعل سازی کی ہے۔ لاکھوں ہتھیلیاں چاہتے ہو..... یہ  
اصلی ہونے تو میں تمہیں میں لاکھ کیا پچیس لاکھ دینے کو  
تیار ہوں اور رات تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم پونا کی  
کوٹھی پر آ جانا..... ایک مہمان کی حیثیت سے۔ وہاں ہم  
دونوں سکون اور اطمینان سے وقت گزاری کریں گے۔

دوسرے دن جن شام کے وقت سرو جا کی کوٹھی  
پر ساری غلاظت لے کر پچھا..... اس نے پہلے میں لاکھ  
روپے وصول کئے..... پھر اس نے ساری غلاظت سرو جا  
کو چیک کر کے تسلی کرا دی..... پھر وہ بریف کیس لے  
کر یہ کہہ کر نکلا کہ وہ تم اپنے دوست کے ہاں رکھ کر ایک  
گھنٹے بعد آئے گا۔ اس نے بریف کیس گاڑی کی ڈی  
میں رکھا۔ جب وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھولنے والا تھا  
تب اندر سے ملازم نے آکر کہا کہ اس کے دوست وودو

شرما کا فون مبین سے آیا ہے..... اس کی طبیعت خراب  
ہے..... جن فون پر بات کرنے اندر آیا۔ دوسری طرف  
وودو شرما تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس کی آواز  
لبک سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ یہ مشکل اتنا کہہ پایا کہ  
میری طبیعت ٹھیک نہیں..... جن نے کہا کہ میں ابھی نکل  
رہا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔ تم ایسا کرو راجا کو  
لے کر جے جے اسپتال ملے جاؤ۔

”گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے اس نے سرو جا سے  
کہا۔ ”ڈرائنگ میں مبین جا کر وودو شرما کو اسپتال میں  
دیکھ کر رات نو بجے تک واپس آ جاؤں گا..... تم میرا  
انتظار کرنا.....“

تھوڑی دیر بعد جن کی گاڑی سڑک پر تیزی سے  
روڑ رہی تھی۔ سرو جا افسردہ سی بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔  
ٹانگیں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا تو اسے خبر نہ ہوئی۔  
اس کی آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔  
”سرو جا! کیا سوچ رہی ہو.....؟“ ٹانگیں  
نے کہا۔

سرو جا ایک دم سے چونک کر خیالوں کی دنیا سے  
باہر آئی۔ ”تم.....؟ کہاں تھے.....؟ وہ کمینہ.....  
ذلیل..... نہ صرف میں لاکھ روپے لے گیا بلکہ یہ بھی کہہ  
گیا میں بنی سنوری اس کے انتظار میں راہ ہکتی  
رہوں..... وہ اس حرام زادے وودو شرما کی عیادت  
کرنے کے بعد رات نو بجے واپس آ رہا ہے..... وہ  
تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ٹانگیں  
نے بے پرواہی سے کہا۔

”کیا پریشانی کی کوئی بات نہیں.....؟“ سرو جا  
نے شک کر کہا۔ ”اس کی ہر بات ماننا پڑے گی۔“

”تم صاف انکار کر دو.....؟“ ٹانگیں نے کہا۔  
”تم اس کی غلام نہیں ہو..... نوکرانی یا باندی نہیں ہو۔“

”اس کی پچھی تو ہوں.....؟“ سرو جا کہنے لگی۔  
”میری ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ کھ پٹکی ہوں۔  
ساری چیزیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ میں کیا

کروں.....؟ کہاں جاؤں.....؟ تم نے مجھے بڑا دلادیا  
دیا۔ لیکن تم اس کمینے سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔“  
”تم نے کیا کیسٹ قلم اور تصویریں چیک  
کیں.....؟“ ٹانگیں نے پوچھا۔ ”جعل سازی تو نہیں  
تھی؟“

”نہیں.....“ سرو جا بولی۔ ”اس نے مجھے یہ  
ساری چیزیں چیک کرنے کو دیں تو میری کنپٹی پر ریا اور  
رکھ کر کھڑا رہا۔ اب درندہ..... گلدہ..... خون آشام  
بھیڑیا مجھے درندگی کا نشانہ بناتا رہے گا۔“

ٹانگیں اٹھا اور اس نے بریف کیس لاکر اس کے  
سامنے رکھ دیا اور کھول دیا۔

”یہ وہ لفافہ ہے جس میں تمہاری دی ہوئی میں  
لاکھ کی رقم اور وہ تمام غلاظت سے بھری چیزیں.....  
جنہیں تم نے چیک کیا..... اور یہ ریا اور جو اس نے  
تمہاری کنپٹی پر رکھا تھا.....“ ٹانگیں مسکرایا۔ ”تم اس کے  
لئے پریشان ہو رہی تھیں.....؟“

”کیا.....؟“ سرو جا حیرت اور خوشی سے اچھل  
پڑی۔ ”اسے ساعت اور آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ  
بریف کیس تمہارے ہاتھ لگ گیا۔ وہ تو اپنے ساتھ باہر  
لے گیا تھا..... تم کہاں تھے.....؟ کب آئے تھے؟“

”میں دوسرے کمرے میں موجود تھا..... میں  
نے ملازم کو منع کر دیا تھا کہ میری آمد اور کمرے میں  
موجود ہونے کے بارے میں تمہیں نہ بتائے..... میں  
نے تم دونوں کی ساری گفتگو سنی..... جب اس نے  
بریف کیس گاڑی کی ڈی میں رکھا تب میں نے ملازم کو  
دوڑایا۔ میرا ایک صدا کار دوست جو بالائی منزل کے  
کمرے میں موجود ہے اس نے کمرے سے شست گاہ  
کے کمرے میں فون کیا۔ اس دوران میں گاڑی کے  
پاس گیا۔ پھر میں نے ایک ماسٹر کی سے ڈی کھولی اور  
سروٹ کوائر میں چلا گیا تھا۔“

”اوہ دیو نکار!“ سرو جا نے بے اختیار ہو کر  
اس کا رخسار چوم لیا۔ ”اوہ..... میں تمہارا کیسے شکر یہ ادا  
کروں.....“



”سنو..... آگے نہ بڑھو..... کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا بچہ پھسل جائے اور میں بدویانت بن جاؤں۔“ ٹائیگر نے اسے ٹوکا۔

”بتاؤ..... تمہارے اس عظیم کارنامے پر تمہاری کیا سیوا کروں؟“ وہ سرشاری سے بولی۔

”میں یہ رقم اور ساری غلاظت لئے جا رہا ہوں۔“ ٹائیگر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔  
”وہ کس لئے؟“

”اس لئے کہ تمہیں بلیک میل کر سکوں؟“  
”تم نے جو ایک بڑے عذاب، ذلت و رسوائی اور بدنامی سے نجات دی ہے اس کے عوض میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“

”الحق عورت.....! رقم تو میری فیس ہوئی..... باقی چیزیں اس لئے میرے پاس حفاظت اور امانت کے طور پر رہیں گی تم اپنے شوہر سے بدیانتی کرو اور فلم کے خواب دیکھنے لگو..... اگر تم بہک گئیں میں یہ ساری چیزیں ساجن کو لے جا کر دے دوں گا..... اس لئے بلیک میل کے لئے یہ تپ کار ڈیمیرے پاس ہوگا۔“

☆.....☆.....☆

اس روز کے بعد سے اس نے سرو جاسے رابطہ منقطع کر دیا تھا اور اس سے بھی کہا تھا کہ وہ اسے بھول جائے..... ساجن آ گیا تھا۔ اب وہ اپنے بچے کو زیادہ وقت دینے لگی تھی۔ وہ اس لئے بھی سرو جاسے کوئی تعلق اور رابطہ رکھنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں بچہ نہ پھسل جائے۔ اس نے گھر لاکر وہ غلاظت دیکھی تو وہ ڈانٹ ڈال ہونے لگا۔ اس کی نیت میں فتوہ پیدا ہونے لگا۔ وہ مٹی کا تودہ نہیں تھا۔ زاہد بھی ہو بہک جائے اور غلاظت کے دلدل میں گر جائے..... سرو جاکو چوں کہ بڑی اذیت، ذلالت اور رسوائی کے عذاب سے نجات ملی تھی اس لئے وہ اس کی ہر خواہش اور حسرت پوری کرنے کے لئے تیار تھی۔ مگر وہ آدمی تھا۔ اس کے اندر جو آدمی زندہ تھا اسے ہر برائی سے باز رکھتا تھا۔ بالفرض محال وہ سرو جاکو بستر کی زینت بنا کر بستر اور اس کا تن میلا کر دیتا تو پھر

اس کی عزت کیا رہتی..... بیس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اس نے یہ رقم سرو جاکو سبق دینے کے لئے بطور فیس وصول کی تھی جب کہ جن اس کے بار آور کلوہ کر چکا تھا۔ اسے بھی بہتی نگاہیں تھوہوہوٹے کا ادھر کیا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جن پر بڑی زبردست چوٹ پڑی تھی۔ کیوں کہ اس کے بریف کیس میں اتفاق سے وہ تمام لفافے اور رقمات تھیں جن میں ان لڑکیوں اور اداکاروں اور عورتوں کی تھیں جنہیں وہ بلیک میل کر رہا تھا..... ان میں شوہا کی تصاویر بھی تھیں جو اس نے دھوکا دے کر دوسروں کی ازدواجی زندگی میں مستقبل میں اسے بلیک میل کرنے کے خیال سے منجھ کر رکھی ہوئی تھیں۔ کل رقم بیس لاکھ تھی..... ٹائیگر نے بڑا اونچا ہاتھ مارا تھا۔ یہ رقم اس کے لئے بولس تھی۔

قدرت ہر برائی کا بدلہ دیتی ہے۔ جب جن کوئی پہنچا تو اسے پتا چلا کہ نو دشر مانے اسے کوئی ٹیٹو نہیں کیا اور نہ ہی اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ اسے غصہ آیا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنے فلیٹ آکر سوچا کہ وہ بریف کیس کی چیزیں اور رقم لاکر زمین رکھ کر واپس پونا جائے جہاں سرو جاس کے انتظار میں وہ نئی بیٹی بھی ہوگی۔ دو برس کی جدائی نے اسے تڑپا رکھا تھا۔ اس کی زندگی میں جتنی لڑکیاں عورتیں آئی تھیں ان میں ایک بھی ایسی نہیں تھی جس نے سرو جاکا خلا پورا کیا ہو..... جب اس نے بینک کے سامنے گاڑی روک کر ڈنگی کھولی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کا سر جھکرایا تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بریف کیس نہیں تھا..... سمجھ گیا کہ جب وہ گاڑی میں بریف کیس رکھ کر گاڑی اشارت کرنے والا تھا تب ملازم نے اسے بتایا تھا کہ ممبی سے اس کی کال آئی ہے۔ شاید سرو جاس نے پلاننگ کر کے بریف کیس غائب کر دیا۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ بریف کیس میں کل ساٹھ لاکھ کی رقم تھی۔ چالیس لاکھ جو اس نے آج وصول کئے تھے اور بیس لاکھ سرو جاس کے..... اس کے علاوہ وہ تمام چیزیں جن سے وہ بلیک میل کر کے کماتا تھا..... اس نے

ریوالور اس لئے رکھا تھا کہ راستے میں رہزنی کے واقعات عام تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر سرو جاس نے رقم واپس نہیں کی تو وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ وہ غصے سے بھرا ہوا جا رہا تھا۔ اندھا دھند تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی کار بجلی کے بجھے سے ٹکرائی۔ وہ مرا نہیں..... کیوں کہ قدرت کو کیفر کر دار تک پہنچانا تھا۔ وہ معذور ہو گیا تھا۔ پھر اسے سرکاری اسپتال کے برٹل وارڈ میں علاج کے لئے داخل کر دیا گیا۔ جیسا کہ اسے تین ماہ بعد پتا چلا کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔ اپنے فلیٹ کے نیچے وہیل چیئر پر بیٹھا بھیک مانگتا ہے۔

اس نے ان لڑکیوں عورتوں کو جو بلیک میل ہو رہی تھیں فون کر کے بلایا۔ وہ اپنی گندگی واپس لینے کے لئے اس کی ہر خواہش اور ہر بات پوری کرنے کو تیار تھیں۔ انہوں نے اس بات کا سچے دل سے اعتراف کیا انہیں قدرت نے ان کے کئے کی سزا دی ہے۔ اس میں ان کا اپنا دوش ہے۔ اس نے ان کی تمام غلاظت بغیر کی رقم کے اس شرط پر دے دی کہ اب وہ انٹرنیٹ، موبائل فون اور خوابوں کے پیچھے اندھا دھند نہیں بھاگیں گی۔ اسے اس سبکی سے ایک سرشاری اور روح کو طمانیت بھی ملی تھی۔ اگر وہ ان حسین نوجوان لڑکیوں اور عورتوں سے سرفراز ہوتا تو اسے ایسا کیف و سرور نصیب نہ ہوتا۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر ریڈ روز بار میں آیا تھا جس کی نہ صرف شراب بلکہ دیگر جوس اور دیگر مشروبات بہت مشہور تھے۔ وہ کبھی کبھار آ جاتا تھا۔ ناگپور کے سنٹرل کالج جس نے نہ صرف اس شہر میں بلکہ ناگ پور میں دھوم مچائی ہوئی تھی۔ اس بار کا مالک نہ صرف اس بار کا مالک تھا بلکہ اس کا ناگ پور میں سنٹرل کالج تھا اس کے باغ کے جیسے سنٹرے کسی اور کے باغ میں لگتے نہیں تھے۔ وہ سنٹرے نہ صرف ایکس پورٹ بلکہ اپنے بار میں ان کا جوس بناتا تھا۔ ایک بات زد عام بھی تھی کہ وہ قاف کی پریاں اس کے باغ میں چاندنی راتوں کو سنکترے کھانے آتی تھیں۔

ٹائیگر نے اس عورت کو بار کے اونچے اسٹول پر ایک ادا کے ساتھ بیٹھ دیکھا۔ وہ بڑی زناکت سے مارٹنی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ ہندوستان میں شراب نوشی عام تھی بلکہ روز بروز ہوتی جا رہی تھی۔ نہ صرف جواں سال عورتوں میں نوجوان لڑکیوں میں جو طالبات میں تھیں اور ملازمت کرتی تھیں۔ ایک طرح سے یہ فیشن بن گیا تھا۔ دوسری طرف اتنے گھریلو اور سماجی مسائل تھے کہ ان کے نزدیک سے نوشی سے ان کی پریشانیاں، تلخیاں اور غم مٹ جاتے تھے۔ دل و دماغ کو ایک سکون سے ملتا تھا..... لیکن اس کا خیال تھا یہ سب کچھ آدمی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ جب آدمی مذہب سے دور اور خوابوں کے پیچھے بھاگتا تو اس کی یہ سزا ملتی تھی۔ مسائل کا حل شراب نوشی نہیں تھا۔

اس نے اس عورت کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا وہ جواں سال تھی اور آنکھوں کے لئے اسے تراوٹ کہا جاسکتا تھا..... اس کا لباس جدید طرز کا تھا اور اس نے اپنے انداز بے پروائی سے لباس میں جا بجا جھروکے بنائے تھے جس میں سے اس کا گورا گورا بدن چھانک رہا تھا جس میں شہد کی آمیزش سی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت کی سڈول ہاتھوں کے خنجر کھلے پڑے تھے۔

اس کے قریب خالی اسٹول پر ایک ادھیڑ عمر کی کرچن عورت بیٹھی وہ کسی پی رہی تھی۔ اپنا پیک ختم کرنے کے بعد وہ اپنا پرس اور سراپا سمیٹ کر اٹھی تو وہ اسٹول خالی ہو گیا تو وہ تیزی سے بڑھ گیا کہ کہیں کوئی اور شخص اس پر قابض نہ ہو جائے۔ قریب سے اس کا جائزہ لینے پر ٹائیگر کو اس کے خوب صورت سینے پر بھونرا اچھی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں اور اس کی خفیف سی مڑی ہوئی سبک ٹاک کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ وہ باوجود کوشش کے اس بت طراز کو پہچان نہ سکا۔ اس لئے کہ اسے نہ جانے کتنی عورتوں لڑکیوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا۔ اس لئے اس نے شناسائی کے احساس کا اظہار نامناسب جان کر وہ خاموش رہا۔ عورتیں لڑکیاں غلط فہمی کا شکار ہو جاتی تھیں اور اس کا غلط مطلب یہی تھیں۔ یوں بھی یہ بار



تھا۔ ہر قسم اور طرح کی عورتیں آتی تھیں۔ ان کی طرف پیش قدمی ناگوار اور زہریلی تھی۔

اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور شام کے اخبار کا جائزہ لینے لگا۔ اخبار تو ایک حیلہ بہانہ تھا۔ وہ اس کا چہرہ اور سراپا اس لئے نظروں میں جذب کر رہا تھا کہ شاید پہچان لے۔ پھر اسے یہ احساس ستانے لگا کہ حیلے بہانوں سے گھورے جانے پر بیشتر لوگوں کو ہوتا ہے اور سامنے والا جان لیتا ہے کہ یہ نظر بازی ہے۔ اور پھر اسے بھی اچھا نہیں لگا۔ ہاں کوئی کھل کر دیکھے تو برا بھی نہیں لگتا۔ چنانچہ اس نے اخبار تہہ کر کے کاؤنٹر پر رکھا اور اپنا سنسٹروں کے جوس کا گلاس اٹھایا۔ جوس گلاس کے عین کنارے ان کی نگاہیں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔

اس طرح نظر بازی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اس عورت کے چہرے پر کوئی متمتاہٹ نہیں دوڑی۔ اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس عورت کے لئے۔ وہ دن میں جب بھی باہر نکلتی ہے تو اسے مردوں کی بھوکی، ندیدی اور ہوسناک نگاہوں سے واسطہ پڑتا ہے اور مردوں اور لڑکوں کا عورت کو اس طرح دیکھنا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا کوئی نئی بات نہیں اور پھر چشم تصور میں کس کس زاویے اور ان جانی نظروں سے دیکھنا عام کی بات تھی۔ اس لئے لڑکیاں عورتیں نظر بازی اور ان کی عامیانہ حرکتوں کی عادی ہوتی تھیں بلکہ خوش بھی ہوتی تھیں کہ ان کی طرف مرد متوجہ ہوتے ہیں۔

”آپ دیوکار عرف ٹائیگر ہیں؟“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے اور سارکت پلکوں سے دیکھا۔ اس کی آواز مترجم تھی اور سرگوشی کے انداز میں تھی جو اس کی خود اعتمادی کی غمازی کر رہی تھی۔

”میں اس سے بھی زیادہ معزز ناموں سے پکارا جاتا رہا ہوں۔ لیکن وہ نام ایسے ہیں کہ خوب صورت عورتوں کی موجودگی میں نہیں۔“ اس نے قدرے

شوخی لہجے میں کہا اور جوس پینے لگا۔

”میں نے خواتین کی تقریبات اور محفلوں میں تمہارا بہت تذکرہ سنا ہے۔“ وہ بولی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہیں یاد نہیں رہی۔ تمہارے حلقے میں لڑکیاں اور عورتیں زیادہ ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بازوؤں کے حلقے میں ایک بھی نہیں البتہ ملاقاتیوں میں بہت ساری ہیں۔ کسے کسے یاد رکھوں۔۔۔۔۔ میرا چوں کہ کسی سے سستی خیز عشق کبھی نہیں رہا اس لئے تم یاد نہیں رہیں۔ تم اپنا تعارف کراؤ تو شاید یاد آ جائے کہ کبھی تم سے آشنائی رہی ہو۔۔۔۔۔ اور کچھ ملاقاتیں رہی ہوں۔“

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی یادداشت کس قدر خراب ہے کہ اس بت کا فرکی یاد نہ آسکی۔ یہ بے پناہ پرکشش پیکر ایک بار ملنے کے بعد بھولے والی چیز نہیں۔ یاد آتی ہے ہی اس نے فوراً کہا۔

”شاید یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے کہ جو ہو کے ساحل پر میں نے تمہیں ایک بار بد معاش سے پہچان لیا تھا جو تمہارا پرستار چھین کر بھاگنے کے لئے چاقو سے زخمی کر کے دو بوجھ رکھا تھا۔ اتنے سارے لوگوں میں سے کوئی تمہاری مدد کو آگے نہیں بڑھا تب میں نے اس بد معاش سے نہ صرف نجات دلائی بلکہ اس کی وہ درکت بنائی کہ پولیس اسے اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال لے گئی تھی۔ کیوں تم وہی ہو۔۔۔۔۔؟“

پھر اسے یاد آیا کہ وہ خوب صورت ہستی ایک دولت مند شخص سے شادی کرنے والی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک گھٹیا قسم کا بلیک میلر جو کبھی اس کے کالج میں ہم جماعت رہا تھا ماضی کی ناخوشگوار یادوں کے حوالے دے رہا تھا۔ اس نے اس عورت کو دو مرتبہ بے عزت کرنے کی کوشش کی تو عورت نے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ اب بھی وہ اسے تنگ ہراساں اور بے عزت کرنے کی کوشش سے باز نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے بارٹینڈر کو اشارے سے بلایا سابقہ آرڈر دہرایا۔ پھر

”چلو۔۔۔۔۔ لاؤنج میں چلیں۔۔۔۔۔ وہاں بیٹھ کر جان اور وطنان سے باتیں کریں گے۔“

پھر اس نے اپنا جوس کا گلاس اور عورت نے اپنا پانی کا پیگ لیا۔ ویٹر چلا گیا تو دونوں اٹھے۔ پھر دونوں لاؤنج میں کارز والی میز پر بیٹھ گئے تو ٹائیگر نے کہا۔

”تمہارا حسن و آج اب بھی اتنا ہی جان لیوا ہے جتنا پانچ برس قبل تھا۔۔۔۔۔ اس میں تمہارے ہم جنسیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔۔۔۔۔ ایسے میں کسی کروڑ پتی کا ازدواجی زندگی میں الجھ جانا کچھ اتنا تعجب خیز نہیں۔۔۔۔۔ اور سناؤ۔۔۔۔۔ بچے کتنے ہیں تمہارے۔۔۔۔۔؟“

”تمہارا بچہ دیوتا کا کیا حال ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ابھی تک میں بچوں کے جنجال سے آزاد ہوں اور جانے کب تک رہوں یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔“ اس نے بے حد تحدیدگی سے کہا۔

”وہ کس لئے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جم کر پوچھا۔ ”شادی کے بعد ہر عورت کی زندگی ہوتی ہے وہ ماں بن جائے اس لئے کہ ماں بننے سے مکمل ہو جاتی ہے جس سے عورت کا تقدس بڑھ جاتا ہے۔“

”مجھے ماں بننے سے زیادہ دلچسپی اپنی جوانی اور جسمانی نشیب و فراز سے ہے۔۔۔۔۔ ماں بننے سے عورت کا بدن اپنی کشش کھو جاتا اور ڈھل جاتا ہے۔ عورت کا اصل حسن اس کے جسم کی خوب صورتی میں ہے۔ جب عمر ڈھلنے لگے گی جب سوچوں میں ماں بننے کے لئے۔۔۔۔۔ زنجب ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔۔۔“

”تو تو جانتے ہو کہ وہ کتنا سخت اور بد مزاج ہے۔“

”میں سمجھا کہ وہ مذاق میں کہہ رہی ہے لیکن وہ واقعی بے حد خبیثہ تھی۔“

لیکن ایسی حسین اور شعلہ جسم بیوی کا شوہر کو خست کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ ورنہ بیویاں شوہر کو اپنے سے باز نہیں آتی ہیں۔۔۔۔۔ اس نے منہ کر کہا۔

”تم مرد ہو اس لئے اپنے جنس کی تعریف کرو گے۔۔۔۔۔“ پھر وہ اس کی طرف جھک آئی۔ ”تم نے دہلی میں میری مدد کی تھی۔ ان دنوں تم نمائش دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ میں تمہارا وہ احسان کبھی نہیں بھولی۔۔۔۔۔ تم نے اس لفٹنگے راسن کو بہت اچھی طرح ہینڈل کیا تھا۔ تم نے اسے ایسا سبق دیا جو شاید وہ اب تک یاد کرتا ہوگا۔“

”چھوڑو۔۔۔۔۔ یہ تو میرا کام ہے جو آئے دن بڑی ثابت قدمی سے انجام دیتا رہتا ہوں۔ یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”لیکن تم جیسی خوب صورت عورت کو خوش کرنے کا سنہرا موقع کم ہی ملتا ہے۔“

وہ بڑی شان و دلربائی نظریں چرانے لگی۔ جیسے پہلی بار اس قسم کی ستائش سے واسطہ پڑا ہو۔۔۔۔۔ اسے یاد آیا کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ رات آکر ہوٹل میں صبح تک سیوا کرے گی۔ لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا کہ جو کچھ اس نے کیا اس میں کوئی غرض ورجہ نہ پوشیدہ نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آج بھی اسے اس احسان کا بدلہ ہر طرح سے اتارنے کو تیار ہے۔

”خیر۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ۔۔۔۔۔ تم یہاں کیسے؟“

ٹائیگر نے فوراً ہی موضوع بدلا۔ ”کیا ان دنوں ممبئی میں رہ رہی ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ بینراری سے محسوس ہوئی تو یکسانیت سے اکتا کر یونیونی تفریحی کے لئے آئی ہوئی تھی۔ آج رات بنگلور واپس جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ ہم کافی عرصے سے بنگلور کے فارم ہاؤس میں رہ رہے ہیں۔“

”شکار؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ اس نے اداسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی تفریح میر نہیں۔۔۔۔۔ میں مرجانے کی حد تک بور ہو چکی ہوں۔ ٹائیگر! تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ زندگی کس قدر خشک اور بے رنگ ہو گئی ہے۔“

”میں تصور کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اسی بے رنگی کی بنیاد پر میرا کاروبار چلتا ہے۔۔۔۔۔ دو دن یاد دہرائیں کبھی ایک



جیسے نہیں ہو سکتے اور نہ ہوتے ہیں۔“

”یہ تو ہے۔ تبدیلی تو بہر حال ملتی ہے۔ ابھی میں نے یہاں مٹی میں ایک خوش گوار مہینہ گزارا ہے۔“ وہ مسکرائی اور ایک گھونٹ لے کر اپنا جام خالی کر دیا۔ میں نے ویٹر کو بلا کر اپنے لئے جوس اور اس کے لئے ایک پیگ لانے کے لئے کہا۔

”ہر برس میں ایک ماہ کے لئے ممبئی ضرور آتی ہوں۔“ وہ گفتگو لہجے میں بولی۔

”میرا خیال ہے۔۔۔ تم کس نفسی سے کام لے رہی ہو۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

ویٹر آرڈر لے آیا تھا۔ اس نے مارٹنی کا پیگ اس عورت کی طرف بڑھادیا۔۔۔ ”لو یہ جام پیو۔۔۔ سیکرٹ سروس والوں کے نام۔۔۔“ پھر اس نے اپنا جوس گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ ”میرا بس چلو تو سارا دن سنٹرول کا جوس پیتا رہوں۔“

سیکرٹ سروس والوں کا انتساب عورت کے لئے جیسے قابل قبول نہیں تھا۔ اس نے اپنا جام رکھا اور ٹائیگر کے قریب سرک آئی۔ ”تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کس قدر خوف زدہ ہوں۔ ویٹر کا مار عرف ٹائیگر۔!“ اس کی آواز سرگوشی سے بلند ہرگز نہیں تھی۔ حالانکہ لاؤنج میں کوئی ان سے اتنا قریب نہیں تھا کہ نائل آواز میں کی جانے والی گفتگو کوئی سن سکے۔

اس کی حالت سن کر ٹائیگر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اسے متوقع نظروں سے دیکھتا رہا۔

”میری تعظیلات کے پچھلے دو دن بہت پریشان کن ثابت ہوئے ہیں۔“ راکھی نے کہا۔ ”مشکل وہی ہے۔۔۔ پرانی والی۔۔۔“ اس نے گہرا سانس لیا تو سینے میں سانسوں کا متوجج کا سا تھا۔

وہ ایک دم سے اس طرح اچھلا جیسے اسے بھڑنے کا ٹھکانا تھا۔ پھر اس نے سنبھلنے ہوئے راکھی کی طرف دیکھا۔

”کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ رامن پھر

تمہیں۔۔۔؟“

وہ شدت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ ”نہیں۔۔۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں نے غلطی نہیں کی ہے۔ آدمی البتہ مختلف ہے۔“

”راکھی۔۔۔!“ مجھے یہ سن کر نہ صرف ہلاک بلکہ مایوس ہوئی۔۔۔ ٹائیگر نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ”اس لئے کہ تم ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہو۔ تمہارے سخت گیر بچی نے ہر طرح کا تمہیں سکھ دیا ہوا ہے۔“

”یقین مانو میں اس کی ذات سے ذرا برابر بھی خوش نہیں ہوں۔“ اس نے تکرار کے لہجے میں کہا۔ ”میں سونے کے بنجرے میں پچھی کی طرح ہوں۔۔۔ یکسانیت نے مجھے بے زار کر دیا ہے۔۔۔“

ایسے میں ذرا سی آزادی ملتی ہے تو وہ میرے دماغ پر کسی نئے کی طرح چڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ کوئی افیئر۔۔۔ اور اب میرے عائشی محبوب۔۔۔ دوست میری حماقت کو کیش کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔“

”تمہاری ذہنی حالت درست نہیں رہی ہوگی۔۔۔ ورنہ تم گفتگوں میں بیٹھنے کے بجائے ان سے دور رہتیں۔“ ٹائیگر نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کوئی اپنے پیروں پر کھلاڑی مارے تو کیا کہا جاسکتا ہے؟“

”تم نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ یہ بات کوئی عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔۔۔ کسی نے مجھے اس سے متعارف کرایا تھا۔۔۔ پھر اس کا طرز عمل اور طور طریقے ہمیشہ اچھے اور مہذبانہ رہے۔“

”یہ تو کوئی اچھا ہونے کی دلیل نہ ہوئی؟“ ٹائیگر نے معترضانہ انداز میں ٹوکا۔

”مجھے بارہا ایسے لوگوں سے متعارف کرایا گیا ہے جن کے طور طریقے بے حد شریفانہ اور پر خلوص بھی تھے۔“ وہ بتانے لگی۔ ”لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ وحشی قاتل ہیں۔“

وحشی سے کیا مراد۔۔۔؟ آدمی جب تک وحشی

پرعت نہ ہو جائے وہ قاتل بن ہی نہیں سکتا۔۔۔“

اس نے اپنا گلاس خالی کیا اور ویٹر کو بلایا۔ وہ اسے گلاس میں جوس پی رہا تھا اور راکھی بھی چھوٹے پھراسے ٹائیگر نے آرڈر دیا تو وہ آرڈر لے کر باہر ٹائیگر کہنے لگا۔

”راکھی۔۔۔!“ مجھے تم پر نہ صرف حیرت ہے بلکہ حیرت آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بہت ہوشیار ہو اور اپنے کار عورت ہو۔ تم نے مجھے ہمیشہ یہ تاثر دیا کہ تم لوں کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو کہ شاید ہی کوئی اور ایسی جانتی ہو۔ خاص طور پر لیبرے مردوں کے بارے میں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ تم ذاتی طور پر چینی بستی میں جا گری ہو؟

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ٹائیگر۔۔۔! یہی بات ہے۔“ اس نے اعتراف کیا اور اس کی آنکھوں میں کی پڑ چھائیاں پھیل گئیں۔ شادی کے بعد دنیا کی کئی کچھ چیزیں۔۔۔ مردوں سے میرا رابطہ نہیں ہے۔ مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میری ایک سیاسی سی کی ہو کر رہ گئی۔“

ٹائیگر نے اس کا سراپا توجہ سے دیکھا۔ ”تم نے اقامت خیزی ذرا بھی کم نہیں کی۔ شادی کے بعد تم ایک ایسا گداز پن آ گیا جس سے لگتا ہے کہ تم نے اپنی یونیاں استعمال کی ہوں۔“

”ہر عورت کی طرح میری بھی یہ کمزوری رہی کہ حسن سے حسین ہوتی رہوں۔۔۔“ وہ بولی۔ ”یاد یہ ہو کہ ایک طرح سے میری اس وقت سے ہالی رہی کہ میں نے نوجوانی کی دلہیز پر قدم رکھا۔“

”اور اسے استعمال کرنے میں بھی تمہاری دلچسپی نہیں ہوئی۔۔۔ یہ چکر شروع ہوتے ہی تم نے مجھ سے ہٹ کر نہیں کیا۔۔۔ میں سرچل کر رکھ دیتا۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں نے سوچا تھا کہ تم سے ملوں۔۔۔ مجھے اس کا علم تھا کہ تم ممبئی میں ہی ہو۔ تمہارا آفس تلاش کرنا کام نہ تھا۔ پتا کچھ کچھ یاد تھا۔ جانے کیوں یہ بات

مجھے اچھی نہیں لگی۔ تم ایک بار میری مدد کر چکے تھے۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ تمہیں بتاؤں کہ اس مشکل میں پھنس گئی ہوں جس سے تم نے پانچ برس پہلے نکالا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم دوسری مرتبہ میری مدد کرنے سے انکاری ہو جاؤ گے۔ مگر بعد میں۔۔۔ میں نے سوچا کہ کاش میں نے تم سے رابطہ کر لیا ہوتا۔۔۔ یہ احساس مجھے کل شام ہوا۔۔۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔۔۔ مجھ پر نظر رکھی جا رہی ہے۔۔۔ کڑی نگرانی میں ہوں۔۔۔ اب میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔۔۔ میں تو اب اپنے ہوٹل بھی نہیں جاسکتی کہ جا کر اپنا سامان لے آؤں۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”پچھا کرنے والوں میں سے ایک مستقل طور پر وہاں موجود ہے۔ ڈنر سے پہلے میں نے بہت کوشش کی تھی لیکن میں اپنے کمرے تک نہیں پہنچ سکی۔ میں کچھ پینے کے ارادے سے یہاں آ گئی تاکہ بیٹھ کر غور کر سکوں کہ اب کیا کیا جائے۔۔۔ کوئی تدبیر ذہن میں بھی ہی نہیں آ رہی تھی۔ حسن اتفاق سے تم سے اچانک اور غیر متوقع ملاقات ہو گئی۔ مجھے اپنی اس خوشی پر دیر تک یقین نہیں آیا۔۔۔ ایسا لگا کہ میں کوئی سپنا دیکھ رہی ہوں۔“

تو تم سامان پر لعنت بھیج کر گھر واپس جاسکتی ہو۔ وہاں سے ہوٹل والوں کو پے آرڈر کے ذریعے ادائیگی کر دینا۔ پھر وہ تمہارا سامان ارسال کر دیں گے۔“

”لیکن سوکٹ کیس میں تو میرا سب کچھ رکھا ہوا تھا۔ میرا لکٹ۔۔۔ اے بی ایم کارڈ۔۔۔ کریڈٹ کارڈ اور رقم۔۔۔ لیکن میں زیادہ رقم دستی بیک میں نہیں رکھتی لیکن میک اپ کی لوازمات تمام رکھتی ہوں۔“

یہ کہتے کہتے وہ خطرناک حد تک میری طرف جھک گئی۔ جھروکوں سے ہوش اڑانے والی خوشبو کے جھوکے آنے لگے۔ پھر وہ بولی۔

”لیکن اب میری مشکل آسان ہو گئی ہے کیوں



کہ وہ لوگ تمہیں نہیں جانتے ہیں۔“  
 ”تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان پانچ  
 برسوں میں کتنے سارے لوگ مجھے جاننے لگے ہیں۔“  
 ٹائیگر نے دامن بچانے کی کوشش کی۔  
 ”ویسے تمہاری ٹرین کی روانگی کا وقت کیا  
 ہے؟“

بارہ بجتے میں پانچ منٹ پر..... اس نے  
 جواب دیا۔ اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”دیوا  
 کمار.....! تم میرا یہ کام کرو گے نا؟ پلیز!“  
 ”میں اب کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“ اس نے  
 مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہارا قیام کون سے  
 ہوٹل میں تھا؟“  
 ”باندروہ کے ہوٹل..... ڈریم لینڈ میں..... کمرہ  
 نمبر اکتیس۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”رجسٹریشن تمہارے اس  
 پرانے نام سے ہے نا؟“  
 راہی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 وہ اٹھ کر ٹائیگر کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ ”اور تم  
 یہ چاہتی ہو کہ وہ ہوٹل کا بل بھی میں ادا کروں؟“

اس نے ٹائیگر کو ایک پگھلا دینے والی نگاہ سے  
 نوازا..... جس میں خود سپردی اور انجانا سا پیغام محبت  
 تھا۔ وہ لگاؤ سے بولی۔ ”بل ادا کئے بغیر وہ تمہیں میرا  
 سامان دھر نہیں دیں گے..... پلیز ڈارلنگ.....! تم  
 ٹائیگر ہو۔“ وہ بولی۔

”ڈارلنگ نہیں..... پرلے درجے کا میں احق  
 ہوں جو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے ہیں۔“

پلیز!..... میرا یہ کام کرو۔..... میری بہتری کی  
 خاطر..... بیک ہاتھ میں آتے ہی تمہارا حساب چکا دوں  
 گی۔“ میں نے دتی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ مجھ سے ملنے کے  
 بعد سے وہ ہر چند منٹ بعد گھڑی دیکھتی رہتی تھی۔ پھر اس  
 نے سابقہ سوال دہرایا۔ ”تمہیں میرا سامان لانے میں  
 کتنی دیر لگے گی.....؟“

میں بہت ست آدی ہوں..... کچھ عرصے کی سی

رفار ہے۔ زرا زیادہ وقت دینا مجھے۔“  
 ”ٹھیک ہے..... گیارہ بجے میں ٹرین پر ملوں  
 گی۔“

”کون سے ٹرین پر.....“  
 ”دی ٹی..... بوری بندر.....“

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے نو بجے  
 تھے۔ ٹھیک ہے راہی.....! تم اتنے میں ایک اور ٹیکس  
 لے لو۔“ اس نے ویٹر کو بلا کر اس کے لئے ڈرنگ کا  
 آرڈر دیا۔ راہی نے بیٹھے ہوئے ایک سگریٹ اس سے  
 لے کر سلگایا۔  
 پھر وہ باہر نکل آیا۔

وہ باہر نکلا ہی تھا کہ ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ وہ ٹیکسی  
 کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اسے وہ فضل نظر  
 آیا جو اس ٹیکسی سے اترا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھا ہٹا اور  
 ایک ستون کو ڈھال بنا لیا۔ اس کی آڑ میں وہ چھپ سا  
 گیا تھا۔ اس شام دوسرا موقع تھا کہ اسے کوئی جانی پہچانی  
 شکل نظر آئی تھی۔ اس شخص نے کراہ ادا کیا اور دروازے  
 کی طرف بڑھا۔ جیسے اس کا چہرہ روشنی میں آیا اس نے  
 فوراً شناخت کر لی۔

وہ رتن کمار تھا..... جرائم کی دنیا میں ایک جانا  
 پہچانا اور نامور آدمی..... وہ نہ صرف بہت بڑا بدعاش تھا  
 بلکہ اتنا جالاک بھی تھا کہ پولیس کو بھی اس پر ہاتھ ڈالنے  
 کا موقع نہیں ملا تھا۔ سلور پار میں اس کی موجودگی ٹائیگر  
 کے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔ اسے اچانک ایک خیال  
 آ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خیام شام ہی سے اس  
 کے زہن میں چھپر رہا تھا۔

وہ رتن کمار کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔ اس نے  
 اپنے اور اس کے درمیان اچھا فاصلہ رکھا تھا۔ پھر وہ  
 لوگوں کے درمیان خود کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے  
 رتن کمار کو بار بار میں ایک اسٹول پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔  
 اس نے اخبار کھول کر اپنے سامنے یوں پھیلا لیا جیسے  
 پڑھ رہا ہو۔ ڈرا دیر بعد راہی نمودار ہوئی۔ راہی اور رتن  
 کمار نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ راہی بھی دہشت

اور ڈرک کا آرڈر دے دیا۔ اپنا جام لے کر لاؤنج کی  
 طرف چل دی۔ چند لمحوں کے بعد رتن کمار بھی اس کے  
 پیچھے چل دیا۔

ٹائیگر نے جو کچھ دیکھا وہ بہت کافی تھا۔ وہ بار  
 سے نکلا اور سامنے سے گزرنے والی خالی ٹیکسی کو روکا۔

ڈریم لینڈ ہوٹل جاتے ہوئے وہ دہشتی طور پر  
 صورت حال کی ایک مکمل اور واضح تصویر بنانے کی  
 کوشش میں مصروف رہا۔ اسے راہی کے متعلق اور بھی  
 بہت سی باتیں یاد آ گئیں..... اسے یاد آ گیا کہ وہی میں  
 راہی کا بلیک میلنگ والا معاملہ بھی خاصا پراسرار تھا۔ وہ  
 اس وقت بھی معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا..... اور  
 اس واقعے سے بھی پہلے وہ کچھ اچھے لوگوں میں اشتہ  
 بھی نہیں تھی۔ پھر اس نے اچانک ہی شادی کر لی  
 تھی۔ اس نے اپنے بچی کو شادی کا فیصلہ بدلنے کی مہلت  
 ہی نہیں دی تھی۔ لوگوں کا کہنا ہی یہی تھا۔ بہر وہ راہی پر  
 ریشہ رکھی ہو گیا تھا۔

دس منٹ بعد وہ ڈریم لینڈ ہوٹل کی پریچوم لابی  
 میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف کھڑے ہو کر استقبالیہ  
 ڈیسک کا اور پھر ادھر کھڑے لوگوں کا غور سے معائنہ کیا۔  
 بالآخر وہ ڈیسک کی طرف بڑھ گیا۔

ڈیسک پر موجود لڑکی بہت چمکی ہوئی لگ رہی  
 تھی۔ ٹائیگر نے محسوس کیا کہ لمبی ڈیوٹی دے چکی ہے اور  
 جلد سے جلد جانا چاہتی ہے۔ اس نے ٹائیگر کو دیکھ کر  
 خوش اخلاقی سے مسکراتے کی کوشش کی۔

”ہیلو بس.....! ٹائیگر نے مسکرا کر کہا۔ ”پلیز!  
 مجھے کتنی نمبر کمرے کی چابی دے دیں۔“

لڑکی نے کی بورڈ کی طرف دیکھا اور بڑھ گئی۔  
 جس پر کمروں کے نمبر لکھے تھے اور جا بجا جہاز لگی ہوئی  
 تھیں۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چابی نہیں تھی۔  
 ”یہ کمر تو اس راہی آئندہ کا ہے۔“

”جی ہاں..... میں ان کا سیکریٹری ہوں.....  
 انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں یہاں سے ان کا  
 سامان لے جا کر ان تک پہنچا دوں۔ کیوں کہ وہ یہاں

آنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے  
 مجھے یہ ہدایت بھی کی ہے کہ میں آپ کا بل ادا  
 کر دوں۔“

لڑکی نے سر گھما کر لاؤنج کی سمت دیکھا۔  
 ”بہت بہتر جناب.....“ بالا خراس نے کہا۔ پھر وہ دیکش  
 ڈیسک کے پیچھے گئی۔ ڈرا دیر بعد وہ ایک پرچا ہاتھ میں  
 لئے آئی۔ ”دو ہزار روپے ادا کر دیں..... پلیز.....!“  
 اس نے رقم ادا کی اور لڑکی نے کمرے کی چابی  
 اس کی طرف بڑھا دی۔

”راہی کو کوئی پوچھنے تو نہیں آیا.....؟“ ٹائیگر  
 نے بڑی مصحوبیت سے دریافت کیا۔

”ایک صاحب کوئی دو تین مرتبہ ان کے بارے  
 میں دریافت کر چکے ہیں..... بلکہ میرا خیال تو ہے کہ وہ  
 اس وقت ہوٹل میں ہی نہیں کہیں ہوں گے..... کچھ دیر  
 پہلے سامنے والے صوفے پر براجمان تھے۔“

”اوہ..... میرا خیال ہے کہ ان کے منگیترا راجا  
 کپور ہوں گے..... میں خود ہی انہیں تلاش کر لوں گا۔  
 بہت بہت شکریہ۔“

اس نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔  
 کیوں کہ لفٹ میں بہت بھیڑ تھی۔ اوپر اور نیچے آنے  
 والوں کی۔ کمرہ چونکہ پہلی منزل پر تھا۔ سیڑھیاں بھی  
 آرام دہ تھیں۔

پہلی منزل پر وہ پہنچا دہشتی طور پر ہر قسم کے  
 حالات کے لئے تیار تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا  
 کہ اس کا واسطہ جرائم پیشہ سے پڑے گا۔ وہ راہی کی  
 جان کے دشمن ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک خیال اور  
 آیا کہ اس کے کمرے میں جو اس کا دشتی بیک وغیرہ ہوگا  
 یقیناً اس میں بڑی رقم ہوگی۔ وہ چھن جانے کے خوف  
 سے نہیں جارہی ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید  
 کسی کمرے کے دروازے کی جھری سے راہی کے  
 کمرے پر نظر ہوگی اور گرانی کی جاری ہوگی۔

پہلی منزل کے کارڈ پر وہیں کمروں کے نمبر  
 دیکھتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا۔ اکتیس نمبر آخری کمرہ تھا۔



اس نے تالے میں چابی لگائی اور ہینڈل گھماتے ہوئے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ اس کا سواگت بڑا پر تپاک ہوگا۔ کمرے میں شاید قاتل ہوگا۔ وہ اس تاک اور گھات میں ہوگا کہ راکھی سے کمرے کی تنہائی میں خوب فائدہ اٹھا کر پھر اسے قتل کر کے اس کا سامان لے کر فرار ہو جائے۔ وہ بھی ہر طرح سے تیار تھا کہ قاتل کی کوئی حسرت پوری کرنے نہیں دے گا۔ لیکن کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اس نے وائش روم جھانک لیا۔ الماری اور پلنگ کے نیچے اس خیال سے بھی دیکھ لیا کہ شاید اس میں چھپا ہوا ہو۔ خیریت تھی۔ اس کا سایہ تک نہ تھا۔ شاید نیچے ہی اس کا تعاقب کرنے کے لئے کوئی بد معاش ہوگا۔ بہر حال اس نے اندر سے کبرا مقفل کر دیا۔

کرسگریٹ پیئے اور مسافروں کو دیکھنے میں وقت گزارا۔  
پھر ٹھیک وقت پر وہ بیک ہاتھ میں لئے ہال کی طرف  
بڑھ گیا۔ اسی لمحے لیڈیز ویننگ روم سے راجھی آئی اور  
پھر اس نے آکر میر ہاتھ تھام لیا۔

چلی لے رہا تھا۔ اس نے بوتھ سے ٹیک لگائے اجنبی کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھا۔ وہ دونوں اچانک ہی رک گئے۔ راگھی نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

ملاقات ہوئی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آج اتفاقاً ہماری ملاقات ہو گئی۔“





## خلاء سے واپسی

ہنری ہٹس - انتخاب: عابد علی لاہور

رات کے گھٹنا ٹوپ اندھیرے میں ملک کا نامور سائنسدان اغوا کر لیا گیا اور پلک جھپکتے ہی ایک اور سیارے میں پہنچا دیا گیا، اس سیارے پر وہ کوئی چار ماہ رہا اور جب پراسرار حالت میں واپس آیا تو.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ دوسرے سیارے والے زمینی سائنسدانوں سے آگے ہیں، ایک اچھی کہانی

میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مریخ سیارے میں انسان سے ملتی جلتی ایک نسل آباد ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سامنے کوئی شخص کھڑا ہے۔ یہ بات بہت حیران کن تھی، کیونکہ سرشام ہی اس نے سب دروازے بند کر دیے تھے اور چابیاں اس کی جیب میں تھیں اس نے سرائی کر دیکھا، ایک طویل قامت شخص سیاہ لبادے میں چھپا ہوا

رات کا ایک بجا تھا، مشہور سائنس دان، آفریقا میں اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار خلا باز بھی تھا اور مختلف انسانی نسلوں کے علوم کا ماہر تھا۔ اس وقت جب کہ سارا شہر مٹی میں غرق تھا، وہ ایک طویل رپورٹ مرتب کرنے میں منہمک تھا۔ صبح سے ہی رپورٹ اعلیٰ سطح کی ایک سائنسی کانفرنس میں پیش کرنے کی تیاری تھی۔ وہ یہ محنت سے وہ یہ ثابت کرنے

کچھ بتا سکو۔  
”ضرور بتاؤں گا۔“ ٹائیگر نے لہجے میں بتاؤں غصہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”چند برس ایک معاملے پر راجی نے مجھ سے پیشہ ورانہ مدد لی تھی..... تب سے ہم نے کبھی نہیں..... ہاں کبھی کبھی ٹیلی فون پر بات ہوتی رہی۔ اتفاق سے آج سلور بار میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے پھر ایک بار مجھ سے مدد طلب کی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ان کے کچھ خراب لوگوں سے روابط رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اب انہیں بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ ان کے ہونٹ کے گرد وہ لوگ منڈلا رہے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ وہ لوگ ہونٹ جانا نہیں چاہتی تھیں۔“

ٹائیگر نے توقف کیا۔ انپکٹر کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھری رہی تھی۔  
”ان کے ہونٹ کے گرد منڈلانے والوں میں پولیس کا ایک آدمی سادے لباس میں بھی تھا۔“ وہ بولا۔  
”ممکن ہے..... لیکن راجی کے علم میں یہ بات نہیں تھی..... انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ اس صورت حال میں کیا جائے۔ چنانچہ میں ہونٹ چلا گیا۔ وہاں میں نے ان کا بل ادا کیا۔ ان کے کمرے سے بیک نکالا اور یہاں چلا آیا۔ یہ طے تھا کہ یہ رات کی ٹرین..... کے کے ایکسپریس سے بنگلور جا رہی تھی۔ لہذا ہمارے ملنے کے لئے یہ مناسب ترین مقام تھا۔“  
”اگر ان کے بیک سے الماس ہیروں کا بار نکلا تو مجھے ذرا برابر بھی حیرت نہیں ہوگی۔“ سب انپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹائیگر نے راجی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں اس بات کی چٹکی کھا رہی تھیں۔ الماس ہیروں کا بار اس نے حیران ہے اور وہ تلاشی لینے پر آمادہ ہوگا..... راجی اپنے ساتھ اسے لے مری تھی۔ اسے لینے کے مفت میں دینے پڑے تھے۔  
(جاری ہے)

سے جواب دیا۔ ”چوں کہ میرے پتی سے صلح ہو گئی ہے۔ اس لئے بنگلور جا رہی ہوں۔“  
”آپ گزشتہ کئی ہفتوں سے لندن میں مقیم ہیں اور آپ کا میل جول ایسے لوگوں سے رہا ہے جنہیں پولیس عادی مجرم کی حیثیت سے جانتی ہے اور ان کے خلاف سنگین جرائم کے مقدمات عدالتوں میں چل رہے ہیں..... ہماری معلومات اور مشاہدے کے مطابق گزشتہ رات سابقہ ملکہ حسن کی کوٹھی میں جو کچھ ہوا اس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ آپ کی سرگرمیاں نہ صرف بے حد پراسرار بلکہ مشکوک ہیں۔“ وہ کہتے کہتے رکا اور راجی کے بیک کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔

ٹائیگر میز کے سرے پر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگائی۔ ”آپ اس شریعتی پر کوئی الزام عائد کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ ”ایک معزز ہستی پر۔“  
اس نے پلٹ کر بڑی گھمبیر نظروں سے ٹائیگر کو دیکھا۔ ”کیا آپ نے اخبارات نہیں دیکھے جن میں یہ خبر سرخ شیروں کے ساتھ شائع ہوئی ہے کہ رات ملکہ حسن کا الماس ہیروں کا بار چوری ہوا ہے جس کی مالیت پچاس لاکھ روپے کی تھی۔ یہ بار جب وہ ملکہ حسن بنی تھی وہی کے ایک شیخ نے بحیثیت میزبان دس دنوں تک مہمان داری کرنے کے بعد دیا تھا۔“

”تو آپ کے خیال میں چور یہ شریعتی ہیں.....؟“ وہ بگڑ گیا۔  
”میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔“ سب انپکٹر نے دامن بجاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ہماری معلومات کے مطابق انہیں استعمال کیا گیا ہے اس جرم میں۔“  
”وہ کیسے.....؟“

”واردات رتن کمار کے طرز کے انداز کی ہے۔ ہم نے تفتیش کے سلسلے میں رتن کمار کو سلور بار سے پکڑا تو یہ شریعتی اس کے ساتھ موجود تھیں۔ ہم نے ان کی نگرانی کا فیصلہ کیا۔ ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے۔ یہاں دیکھا کہ تم ہونٹ سے ان کا بیک لئے چلے آ رہے ہو۔ اب تم بھی کچھ کہو..... ممکن ہے..... تم ہمیں



اسے گھور ہاتھ۔ اس کی پیشانی کشادہ آنکھیں بہت چھوٹی اور ناک تقریباً غائب تھی۔ سارا جسم ایک طرف کو جھکا ہوا تھا کندھے اتنے اونچے کہ سر ان میں چھپ گیا تھا ڈاکٹر ایلین سن پہلی نظر میں سمجھ گیا کہ وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے۔ اجنبی ایک قدم آگے بڑھا اور انگریزی میں بولا۔

”کیا آپ ڈاکٹر ایلین سن ہیں؟“

”جی، جی ہاں۔“ ڈاکٹر نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ ”اور آپ کی تعریف؟“

”میں آپ سے ملنے ایک سیارے سے آیا ہوں۔“

”کس سیارے سے؟ ضرور بیان کیجیے۔ تشریف رکھیے نا۔“

اجنبی بیٹھ گیا اور پروقار لہجے میں بولا۔  
”میں ایسے سیارے کا رہنے والا ہوں جو آپ کے نظام شمسی سے باہر ہے۔ آپ ہزاروں سال بعد بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ ایک نظام شمسی سے دوسرے نظام شمسی تک پہنچنا آپ کے بس میں نہیں۔ آپ نے اب تک جو سیارے دریافت کئے ہیں، وہ آپ کے اپنے نظام شمسی میں ہیں، میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔“

”آپ کہتے جانیے، میں سن رہا ہوں۔“

”ہم چاہتے ہیں آپ کی دنیا کے کسی فرد کو اپنے ہاں کی سیر کرائیں اور اس مقصد کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہے۔ آپ کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ علوم انسانی کے ماہر ہیں اور ہم لوگ دنیا ہی کے رہنے والے ہیں۔ یوں سمجھئے، ہمارے ہاں کا انسان آپ کا چچرا بھائی ہے، میرا مطلب ہے نسل کے اعتبار سے..... ہمارے ہاں سائنس اور ٹیکنالوجی آپ کی سائنس سے کوئی چار لاکھ گنا ترقی یافتہ ہے۔ آپ لوگ ہماری صلاحیتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ صرف ایک مثال دیکھئے: ہم جاپان تو کہہ ارض کو پانچ دن میں مکمل طور پر تباہ کر سکتے ہیں، نسل انسانی کے خاتمے

کے لئے ہمیں تیرہ گھنٹے کی ضرورت ہے اور نظام شمسی کو درہم برہم کرنے میں صرف پندرہ دن کا عرصہ درکار ہے تاہم ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے، کیونکہ یہ ہمارے لئے بے فائدہ ہے ہمیں آپ سے کوئی نقص نہیں کبھی کسی ہم دنیا والوں میں سے ایک شخص کو منتخب کر کے اپنے ہاں لے جاتے ہیں اور اسے اپنی دنیا کی سیر کراتے ہیں سیر کے دوران میں اسے ہمارے لئے تھوڑا بہت کام کرنا پڑتا ہے یوں سمجھئے، یہ ایک طرح کا کاروبار ہے ہم آپ کو خلاؤں میں معلق وسیع و عریض سیاروں کی سیر کرائیں گے، اپنے سائنسی آلات دکھائیں گے اور آپ کے علم میں اضافہ کریں گے اس کے بدلے اگر آپ تھوڑا بہت کام ہمارے لئے بھی کریں، تو کیا مضائقہ ہے۔“

”میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ہر پچیس سال بعد آپ کی دنیا میں سے ہم ایک شخص کو اپنے ہاں لے جاتے ہیں اور چار ماہ بعد یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس مرتبہ آپ کو لینے آئے ہیں۔“

”اگر میں جانے سے انکار کر دوں تو.....؟“

”ہم زبردستی لے جائیں گے۔“  
”لیکن مجھے صبح ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جانا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، آپ صبح ہونے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔“  
”یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ مجھے چار ماہ وہاں رہنا ہوگا۔“

”ڈاکٹر ایلین، میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں آپ سے بہت آگے ہیں۔ گو ہم پوری طرح وقت کو اپنے قابو میں نہیں کر سکے، لیکن یہ قدرت ضرور رکھتے ہیں کہ اسے چھ ماہ کے لئے اتنا میں رکھ سکیں چار ماہ بعد آپ واپس آئیں گے تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے ابھی ابھی میز پر سے اٹھ کر گئے ہوں۔“

”میرے محسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرے ساتھی اور دوست بھی یہی محسوس کریں ورنہ وہ میری تلاش میں زمین کا چپہ چپہ چھان لیں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں وعدہ کرتا ہوں آپ کی واپسی تک یہ چیزیں اسی طرح میز پر پڑی رہیں گی اور آپ صبح ہونے سے پہلے اپنا مقالہ مکمل کر سکیں گے۔ بہت سیدھی سی بات ہے، دنیا والوں کی نظر میں آپ ایک لمحے کے لئے غائب ہوں گے اور اپنی دانست میں چار ماہ کے لئے، امید ہے اب آپ کو تامل نہ ہوگا۔“

”بہت اچھا لیکن جانے سے پہلے میں آپ کے پاؤں ضرور دیکھوں گا۔“

اجنبی نے ہتھ لگاتے ہوئے کہا۔  
”میں سمجھ گیا، آپ سمجھتے ہیں شاید میں مرخ سے آیا ہوں۔ لیجئے دیکھئے اور تصدیق کر لیجئے۔“  
ڈاکٹر ایلین نے اجنبی کے پاؤں دیکھے وہ مرخ کی مخلوق کے پیروں سے قطعی طور پر مختلف اور کسی حیوانی پنچے سے مشابہ تھے۔ ایلین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اجنبی ٹھیک کہہ رہا ہے اور واقعی کسی دوسرے سیارے سے آیا ہے۔ علم کی پیاس نے اسے بے چین کر دیا وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور اجنبی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”مجھے آپ کی دعوت منظور ہے، چلیئے۔“  
”بہت خوب، آپ نے ہاں کہہ کر عقلمندی کا ثبوت دیا ہے مجھے پہلے ہی امید تھی، آپ ایسا سنہری موتی ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔“

”مسٹر..... معاف کیجئے، آپ کا نام؟“  
”نام تو آپ سمجھ نہیں سکیں گے۔ ویسے آپ مجھے جواز کہہ سکتے ہیں میں اسی نام سے آپ کی ہر بات کا جواب دوں گا۔“

”تو مسٹر جوز ہمیں کب چلنا ہوگا؟“ ڈاکٹر ایلین نے اشتیاق سے پوچھا۔  
”ابھی اور اسی وقت۔“

یہ کہہ کر اجنبی نے اپنا ہاتھ ایلین کی طرف بڑھایا۔ ایلین نے یہ ہاتھ چھوا ہی تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی پتیلی میں تیز سوئی چھو دی ہو۔ اگلے ہی لمحے اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے کئی بار اس کی آنکھ کھلی غالباً وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا اس کے دامن بائیں ستارے تھے اور وہ نہایت تیزی سے خلا میں پرواز کر رہا تھا پھر اسے چھوٹے چھوٹے چہرے نظر آئے اس نے غور سے دیکھا یہ اس کے اپنے چہرے تھے جی ہاں، ان سب کی شکل ڈاکٹر ایلین سن سے مشابہ تھی، پھر تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا چاروں طرف اتھاہ تاریکی تھی۔ وہ دھند میں نیچے ہی نیچے جا رہا تھا اس کا سر گھونگنا لگا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا جبرا کیا ہے کبھی سردی کے مارے اس کے دانت بچتے تو کبھی گرم سے جسم جھلنے لگتا۔ یہ ایک طویل سفر تھا۔ غودگی میں اسے ایک لڑکی بھی دکھائی دی بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی معصوم صورت دو تیز۔ وہ اس پر جھکی ہوئی تھی اور بار بار اسے جگانے کی کوشش کر رہی تھی پھر اسے ایک طویل خود فراموشی نے آیا۔

ڈاکٹر ایلین کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ اس کے لئے بالکل نیا تھا، دیواریں گول اور پکٹی تھیں اور نظر ان پر پڑھ رہی تھیں۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی اس کے باوجود چاروں طرف دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اسے کوئی بلب یا ٹیوب دکھائی نہ دیا وہ آہستہ سے اٹھا اور دروازے تک گیا۔ زور لگا کر دیکھا تو معلوم ہوا دروازہ باہر سے بند ہے اس نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ”مسٹر جوز، دروازہ کھولو۔“ وہ زور سے چلایا مگر بے سود۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دور دور تک کسی جاندار کا وجود نہ ہو۔ وہ دیر تک چیخا رہا لیکن دروازہ نہ کھلا تو تھک ہار کر اس نے دوبارہ سونے کا فیصلہ کر لیا اور بستر میں لیٹ گیا۔ گزری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں تجربہ گاہ میں اجنبی کی آمد، عجب و غریب سیارے کا ذکر اور پھر چار ماہ کے لئے سیر کی دعوت، تاہم وہ راستے



کے واقعات اچھی طرح ذہن میں نہ لاسکا۔ غالباً اسے کوئی نشہ آور چیز دی گئی تھی اچانک دروازے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر ایک کھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ جوز اس کے سامنے کھڑا تھا وہی اجنبی جو اسے یہاں لایا تھا۔

”ہیلو ڈاکٹر ایلی سن، مجھے امید ہے آپ کی تھکن دور ہوگئی ہوگی۔ واقعی یہ ایک طویل سفر تھا بہر کیف آپ منزل تک پہنچ گئے۔“

”جی ہاں، مگر یہ کیا حرکت ہے، آپ نے مجھے قید کیوں کر رکھا ہے؟“

”اس قید میں آپ کو تکلیف محسوس ہوئی ہو، تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ جونہی مجھے آپ کی بیداری کی اطلاع ملی میں یہاں پہنچ گیا میں آپ کی خدمت کے لئے ایک خوبصورت نرس ساتھ لایا ہوں۔“

”نرس! وہ کس لئے، کیا میں بیمار ہوں؟“

”جی نہیں، بیمار تو نہیں، مگر آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے، ایسے ساتھی کی جو دکھ سکھ میں آپ کا ساتھ دے سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کو یہاں کی دنیا میں گھما پھرا سکے۔“

”آپ کا مطلب کسی گانڈ سے ہے؟“

”گانڈ نہیں، بیوی کہئے۔“

”بیوی؟ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“

”ہم آپ کی شادی نہایت دھوم دھام سے کریں گے، اس ٹھاٹھ سے جیسے آپ کے ہاں شہزادوں کی ہوتی ہے۔“

”بکواس بند کرو، تم نہایت دھوکے باز اور چالاک معلوم ہوتے ہو مجھے اپنے جال میں پھنسا کر یہاں لے آئے اور اب نہ جانے کیا انٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔ یاد رکھو میں تمہارے کسی فریب میں آنے کے لئے تیار نہیں۔“

یہ سن کر اجنبی نرم لہجے میں بولا۔

”ڈاکٹر ایلی سن، میں نے وعدہ کیا تھا کہ چار ماہ

بعد آپ کو صحیح سلامت زمین پر پہنچاؤں گا، میں اس وعدے پر قائم ہوں، مگر آپ تعاون پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ بہر حال میں مسی بی 301 کو یہاں چھوڑے جارہا ہوں، باقی باتیں آپ اس سے دریافت کر لیجئے گا۔“

دروازہ کھول کر اس نے ایک لڑکی کو اندر بلا دیا۔ ایلی سن حیران رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔ خدوخال سے پتہ چلتا تھا وہ بھی زمین ہی کی رہنے والی ہے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جوز بولا۔

”مجھے اجازت دیجیے چند ضروری کام ہیں ورنہ میں آپ سے ضرور گفتگو کرتا۔ مسی بی 301 آپ کی زبان بخوبی جانتی ہے۔ امید ہے آپ اس کی موجودگی میں اس کمرے کو جیل خانہ تصور نہیں کریں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ ایلی سن خاموشی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ شروع سے ہی آخر تک سانس دان تھا اور سانس کی تجربات کے سوا اسے کسی بات سے دلچسپی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ سینتیس برس کا ہونے کے باوجود اس نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ اب وہ بستر پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے کیا گفتگو کرے۔ لڑکی بلاشبہ خوبصورت تھی، لیکن اسے ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ بالآخر لڑکی خود ہی بولی۔

”ڈاکٹر ایلی سن، غالباً آپ کا یہی نام ہے، میں بہت خوش ہوں کہ آپ سے ملاقات ہوئی۔“

اچانک ایلی سن کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے کہا:

”مس، کیا میں آپ کے پاؤں دیکھ سکتا ہوں؟“

”میرے پاؤں بہت بدنما ہیں اور مجھے شرم بھی آرہی ہے۔ میرا مطلب ہے میرے پاؤں کچھ زیادہ خوبصورت نہیں۔“

”جیسے بھی ہوں، میں ایک نظر انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ شاید نہیں جانتیں، میں انسانی نسلوں کے علم میں بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔“

”ڈاکٹر، خدا کے لئے مجھے ان بدنما دھبوں سے بچائیے۔ میں یہاں کے مقامی باشندوں سے کسی قیمت پر شادی نہیں کر سکتی۔ وہ بھوت ہیں۔ جی ہاں، وہ یقیناً بھوت ہیں۔ انکے پاؤں بلی کے پنچوں کی طرح اور ناک چہرے میں دھنسی ہوئی ہے۔ آپ انہیں دیکھ لیں تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں۔ یقیناً چاہیے اگر آپ نے مجھ سے شادی نہ کی تو آپ کو ان میں سے کسی بھتنی سے بیاہ کرنا پڑے گا۔“

”کیا شادی کرنا ایسا ہی ضروری ہے۔ فرض کیجئے، میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ جو چاہتے ہیں، وہی ہوگا۔“

”تمہاری مراد جوز سے ہے؟“

”ہاں، جوز اور اس کے ساتھی جو اس سیارے کے اصل باشندے ہیں، یہی چاہتے ہیں اگر آپ نے انکار کیا تو وہ آپ کو مشین میں ڈال دیں گے اور وہاں سے اور ہال ہو کر باہر نکلیں گے، تو فوراً ان بھتنیوں میں

”مجھے معلوم ہے، مسٹر جوز نے آپ کا تفصیلی تعارف کرایا تھا۔“ لڑکی ہچکچاتے ہوئے بولی، پھر اس نے جوتے اتار دیے۔ ایلی سن نے دیکھا اس کے پاؤں بالکل ویسے ہی تھے جیسے دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی چیز غیر انسانی نہ تھی۔

”کیا آپ بھی دنیا سے آئی ہیں؟“ ایلی نے بے اختیار سوال کیا۔

”اوہ! میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ سر دست صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ ہمیں فوراً شادی کر لینی چاہئے۔“

”شادی، کیا فضول بات ہے کیا میں دنیا سے یہاں اس لئے آیا ہوں کہ شادی رچا تا پھروں۔ بھلی مانس، مجھے دنیا میں شادی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، یہاں کیونکر ہو سکتی ہے۔“

لڑکی اپنے گھٹنوں پر جھکی اور تقریباً روتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر، خدا کے لئے مجھے ان بدنما دھبوں سے بچائیے۔ میں یہاں کے مقامی باشندوں سے کسی قیمت پر شادی نہیں کر سکتی۔ وہ بھوت ہیں۔ جی ہاں، وہ یقیناً بھوت ہیں۔ انکے پاؤں بلی کے پنچوں کی طرح اور ناک چہرے میں دھنسی ہوئی ہے۔ آپ انہیں دیکھ لیں تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں۔ یقیناً چاہیے اگر آپ نے مجھ سے شادی نہ کی تو آپ کو ان میں سے کسی بھتنی سے بیاہ کرنا پڑے گا۔“

”کیا شادی کرنا ایسا ہی ضروری ہے۔ فرض کیجئے، میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ جو چاہتے ہیں، وہی ہوگا۔“

”تمہاری مراد جوز سے ہے؟“

”ہاں، جوز اور اس کے ساتھی جو اس سیارے کے اصل باشندے ہیں، یہی چاہتے ہیں اگر آپ نے انکار کیا تو وہ آپ کو مشین میں ڈال دیں گے اور وہاں سے اور ہال ہو کر باہر نکلیں گے، تو فوراً ان بھتنیوں میں

”ڈاکٹر، خدا کے لئے مجھے ان بدنما دھبوں سے بچائیے۔ میں یہاں کے مقامی باشندوں سے کسی قیمت پر شادی نہیں کر سکتی۔ وہ بھوت ہیں۔ جی ہاں، وہ یقیناً بھوت ہیں۔ انکے پاؤں بلی کے پنچوں کی طرح اور ناک چہرے میں دھنسی ہوئی ہے۔ آپ انہیں دیکھ لیں تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں۔ یقیناً چاہیے اگر آپ نے مجھ سے شادی نہ کی تو آپ کو ان میں سے کسی بھتنی سے بیاہ کرنا پڑے گا۔“

”کیا شادی کرنا ایسا ہی ضروری ہے۔ فرض کیجئے، میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ جو چاہتے ہیں، وہی ہوگا۔“

”تمہاری مراد جوز سے ہے؟“

”ہاں، جوز اور اس کے ساتھی جو اس سیارے کے اصل باشندے ہیں، یہی چاہتے ہیں اگر آپ نے انکار کیا تو وہ آپ کو مشین میں ڈال دیں گے اور وہاں سے اور ہال ہو کر باہر نکلیں گے، تو فوراً ان بھتنیوں میں

سے کسی ایک سے شادی کر لیں گے اور اچھے برے کی تیز کھودیں گے خدا کے لئے ڈاکٹر، میری بات مان لیجئے۔ ان کے پاس ایک مشین ہے جو انسان کے دماغ میں وہ سب کچھ ڈال سکتی ہے جو مشین کے مالک چاہتے ہیں۔“

”معلوم ہوتا ہے تم نے کوئی بھیا نک خواب دیکھا ہے۔ اچھا، ان باتوں کو ذہن سے نکال دو اور سیارے کے باشندوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔ کیا وہ سب تمہاری طرح ہیں یا ان بھوتوں کی طرح جن کا تم ابھی ابھی ذکر کر رہی تھیں۔“

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میں اس سیارے میں تنہا مٹی لڑکی ہوں، لیکن آپ ان باتوں میں وقت ضائع کیوں کر رہے ہیں جلدی سے ہائی بھر لیجئے ورنہ ابھی وہ جوز آ کر آپ کو مشین کی طرف لے جائے گا۔“

”پھر وہی مشین، عجیب، بیکسی، بیکسی باتیں کر رہی ہو تم۔“

لڑکی نے زچ ہو کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس کی کلائی پر گھڑی سے ملتی جلتی کوئی چیز بندھی تھی ڈائل بالکل سفید تھا۔ اور ایک کے بجائے چابی دینے کی پانچ سوئیاں نظر آرہی تھیں۔ ایلی سن نے جھک کر دیکھا، پھر بولا۔

”یہ کیا ہے؟“

لڑکی نے ایک چابی گھمائی اور ڈائل پر چھوٹی چھوٹی تصویریں ابھرنے لگیں سیاہ کپڑوں میں چھ سات عورتیں اور مرد ایک میز پر جھکے ہوئے تھے ان کی شکلیں غیر انسانی تھیں۔ ڈاکٹر ایلی سن نے کہا۔

”گویا یہ ٹیلی ویژن ہے۔“

”جی نہیں، اسے یہ لوگ ”سرجیم“ کہتے ہیں۔ اسکی مدد سے میں جہاں چاہوں دیکھ سکتی ہوں دس میل کے دائرے میں ہر شے باسانی دیکھی جاسکتی ہے تصویر میں آپ کو جو لوگ نظر آرہے ہیں، وہ آپ ہی کے منتظر ہیں۔“

”میرے منتظر! وہ کس لئے؟“

”جی نہیں، اسے یہ لوگ ”سرجیم“ کہتے ہیں۔ اسکی مدد سے میں جہاں چاہوں دیکھ سکتی ہوں دس میل کے دائرے میں ہر شے باسانی دیکھی جاسکتی ہے تصویر میں آپ کو جو لوگ نظر آرہے ہیں، وہ آپ ہی کے منتظر ہیں۔“

”میرے منتظر! وہ کس لئے؟“

”جی نہیں، اسے یہ لوگ ”سرجیم“ کہتے ہیں۔ اسکی مدد سے میں جہاں چاہوں دیکھ سکتی ہوں دس میل کے دائرے میں ہر شے باسانی دیکھی جاسکتی ہے تصویر میں آپ کو جو لوگ نظر آرہے ہیں، وہ آپ ہی کے منتظر ہیں۔“

”میرے منتظر! وہ کس لئے؟“

”جی نہیں، اسے یہ لوگ ”سرجیم“ کہتے ہیں۔ اسکی مدد سے میں جہاں چاہوں دیکھ سکتی ہوں دس میل کے دائرے میں ہر شے باسانی دیکھی جاسکتی ہے تصویر میں آپ کو جو لوگ نظر آرہے ہیں، وہ آپ ہی کے منتظر ہیں۔“



”وہ آپ کی کھوپڑی کھول کر اس میں نیا دماغ ڈالیں گے۔ پھر آپ وہی کریں گے جو وہ چاہیں گے۔“  
 ”ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، میں جواز سے شکایت کروں گا اس نے وعدہ کیا تھا مجھے سالم زمین تک پہنچا دیا جائے گا۔ کہاں ہے وہ؟“  
 یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن لڑکی نے اسے پکڑ لیا۔

”آپ کا باہر جانا ٹھیک نہیں ہے، میں خود جا کر اسے بلاتی ہوں۔“  
 وہ دروازے کی طرف بڑھی، ایلی سن نے جلدی سے اس کی کلائی پکڑ لی اور مہلتیا نہ لے کر لپک لپکا۔  
 ”مس، کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے ”سرج تیم“ دے سکتی ہیں وہیں آ کر لے لیجے گا۔“

لڑکی نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر گھڑی نما آلہ اس کے حوالے کر دیا جب وہ چلی گئی تو ایلی سن نے اسے غور سے دیکھا اور پھر ایک سوئی دبا۔ ڈائل پر چند تصویریں ابھریں لق ووق میدان جنگ اور پھر ایک وسیع و عریض جمیل دور دور تک پانی پھر ٹیڑھے میڑھے مکان تصویریں مسلسل بدل رہی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ وہ خود حرکت کر رہا ہے اس نے ”سرج تیم“ بستر پر رکھ دی تصویریں ساکن ہو گئیں۔ ڈائل پر ایک طویل برآمدے کی تصویر ابھرائی مختلف سوئیاں دبا کر وہ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ایک تصویر دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا یہ اس کی اپنی تصویر تھی جی ہاں، وہ خود یعنی ڈاکٹر ایلی سن ایک مقامی عورت کے ساتھ سرک پر چلا جا رہا تھا جلد ہی وہ منظر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دوسری تصویریں ابھرائیں اسی لمحے دروازہ کھلا اور جواز مسکراتا ہوا اندر آیا۔ ایلی سن نے جلدی سے سرج تیم بستر کے نیچے رکھ دی اور جواز کی طرف دیکھنے لگا اس کے پیچھے سفید کپڑوں میں ایک شخص سرج تیم میں لپک رہا تھا۔ وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا وہ ڈاکٹر ایلی سن نے کچھ کہنا چاہا لیکن جواز نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اسے سوئی کی جبین محسوس ہوئی اور وہ

فرش پر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک بہت بڑے ہال میں کرسی پر بیٹھا تھا سامنے اس کے کچھ لوگ نظر آ رہے تھے کسی نے اس کی آنکھوں پر دو رہین لگا دی۔ اب وہ آسانی سے ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا اس کے وسط میں ایک بہت بڑی مشین نصب تھی دائیں جانب سے پہریدار ایک چیختی چلاتی لڑکی کو گھسیٹ کر لائے اور ایک کرسی پر بٹھوایا ایلی سن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ مسی بی 301 تھی وہی لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے اس کے کمرے میں موجود تھی ایلی سن نے اٹھنا چاہا مگر وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا، ناچار کسمار کر رہ گیا تھوڑی دیر بعد وہ ایک مقامی نوجوان کو پکڑ لائے نوجوان بہت غصے میں تھا اور بار بار خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا پہریداروں نے اسے بھی ایک کرسی کے ساتھ جکڑ دیا اور پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

مشین کے قریب ایک شخص چرمی لباس پہنے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک مشن دبا یا اور دو پیکل مشین حرکت میں آ گئی۔ وہ دونوں کرسیاں جن میں سے ایک پرمسی بی 301 اور دوسرے پرمقامی نوجوان بیٹھا تھا، ایک جھٹکے سے مشین کے اندر چلی گئیں ایلی سن نے بت بنایہ منظر دیکھتا رہا ایک ناک مشین کی دوسری جانب سے ایک دروازہ کھلا اور دونوں کرسیاں باہر آ گئیں چند پہریداروں نے آگے بڑھ کر کرسیاں کھولیں اور مسی بی 301 اور وہ نوجوان آزاد ہو گئے اور بڑی بے تابی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت مدت کے بعد ملے ہوں ڈاکٹر ایلی سن پکلیں جھپکا تارہ گیا اور وہ ہاتھوں میں ہاتھیں ڈالے اس کے نیچے اتر کر نظروں سے غائب ہو گئے ادھر پہریداروں نے ایک مقامی لڑکی کو اس کے پر لاکھڑا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے کرسی سے باندھ دیا گیا پھر وہ ایک اور آدمی لائے۔ ایلی سن ہولکا گیا۔ آنے والا شخص وہ خود تھا۔ پہریداروں نے آنے والے ایلی سن کو دوسری کرسی کے ساتھ جکڑ دیا اور مشین

ایک باہر حرکت میں آ گئی دونوں کرسیاں مشین کے اندر غائب ہو گئیں اور تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے لکلیں تو کرسی پر بیٹھے ہوئے ایلی سن کا دماغ کھل طور پر بدلا جا چکا تھا وہ اٹھا اور اس کا یہ صورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر مسکراتا ہوا ہال سے باہر چلا گیا غصے اور بے چارگی کے شدید احساس سے ڈاکٹر ایلی سن کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔

اچانک اس کے پھر کچھ لوگ دکھائی دیئے اس بار مسی بی 301 اس کے پر لائی گئی۔ ایک مقامی نوجوان اس کے ساتھ تھا وہ دونوں مشین کے اندر سے ہو کر آئے تو مایاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے کو قبول کر چکے تھے اگلے ہی لمحے ایک اور ایلی سن مقامی لڑکی کے ساتھ اس کے پر آ یا پھر وہی عمل ڈاکٹر ایلی سن کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں وہ کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوری قوت سے چیخا۔

”بند کرو یہ ناپاک کھیل۔“  
 کسی نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ سوئی کی جبین محسوس ہوئی اور وہ ایک باہر پھر بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ وہ بات ظاہر تھی کہ اب تک وہ صحیح سالم تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا اور گزشتہ باتیں اس کے ذہن سے بخونہ ہوئی تھیں۔ وہ زمینی باشندہ تھا اور جواز کے ساتھ چار ماہ کے لئے اس سیارے پر رہنے کے لئے آیا تھا۔ مسی بی 301 کی دی ہوئی ”سرج تیم“ ابھی تک بستر کے نیچے بڑی تھی اور اسے یقین تھا وہ زمینی لڑکی اس کی ہمدرد اور بھنی خواہ ہے ابھی ابھی اس نے جو منظر دیکھا اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جواز اور اس کے ساتھی کسی خطرناک کھیل میں مصروف ہیں اور وہ عقرب ان کا آلہ کار بننے والا ہے۔ اس نے سوچا جو بھی ہو، وہ ان کے ناپاک عزائم پورے نہ ہونے دے گا۔ اس نے ”سرج تیم“ کی کئی ایک سوئیاں گھمائیں، لیکن جواز یا وہ لڑکی دکھائی نہ دی۔

شاید اسے سمت کا ٹھیک اندازہ نہ تھا۔  
 اچانک دروازہ کھلا اور لڑکی اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں سیب سے مشابہہ کوئی پھل تھا۔  
 ”ڈاکٹر ایلی سن، معلوم ہوتا ہے آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا، لیجیے، یہ پھل بہت لذیذ ہے۔“ ایلی سن نے اس کے ہاتھ سے پھل لے لیا اور سرج تیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”مس براؤنڈ، کیا آپ بتا سکتی ہیں یہ عمارت کہاں ہے؟“  
 ”ڈاکٹر میرا نام سی بی 301 ہے، مس براؤنڈ نہیں۔“

”جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“  
 ”میں کچھ نہیں کہہ سکتی، مجھے اس سے ڈر لگا ہے۔“  
 ”کس سے؟ کیا جواز سے؟“  
 ”جی ہاں“

یہ کہہ کر لڑکی جلدی سے ہاتھ بڑھا کر وہ سرج تیم اٹھانے لگی، ایلی سن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ڈانٹ کر کہا۔

”بیٹا، وہ سب لوگ اس عمارت میں کیا کر رہے تھے؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی، مجھے ان سے خوف آتا ہے، میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ آپ مجھ سے شادی کر رہے ہیں یا نہیں؟“

”پھر وہی شادی کی رٹ میں پوچھتا ہوں وہ لوگ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے تم کون ہو اور یہاں کیسے پہنچیں؟ میرے سوالوں کا صاف صاف جواب دو، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

جواب دینے کے بجائے لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایلی سن سمجھ گیا کہ اس سے مزید افسار فضول ہے۔ اس نے دروازے کے قریب جا کر اسے باہر کی طرف دھکیلا لیکن وہ بند تھا۔ وہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ دروازہ کھلا اور جواز اندر آ گیا۔ ایلی سن



موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے پہلے ہی سے طے کر لیا تھا کہ اس مرتبہ جونز کی زہریلی سوئی سے بچے گا۔ جونہی جونز اس کے قریب ہوا، اس نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی اور بازو ورم وڈ کر اسے فرش پر گرا دیا۔ ابھی جونز سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایلی سن نے اس کی ہتھیلی پر لگی ہوئی ایک لمبی سی نیوب اور زہریلی سوئی اتار لی اور اگلے ہی لمبے سوئی جونز کے جسم میں داخل کر دی جونز فوراً بے ہوش ہو گیا۔ ایلی سن نے اس کی تلاشی لی، لیکن اور کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ اس نے جونز کو بلیک کے نیچے دھکیل دیا اور نیوب اور زہریلی سوئی اپنی دائیں ہتھیلی پر چڑھا لی۔ وہ خوفناک ہتھیار اس کے قابو میں آچکا تھا جس کی مدد سے جونز نے اسے تین بار بے ہوش کیا تھا۔ لڑکی ابھی تک کمرے کے ایک کونے میں کھڑی خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

”میں ان کے ہاتھ نہیں آسکتا۔ شاید تم نہیں جانتیں، میں ایک ماہر باہر بازو ہوں اور کئی بار زل سیارے تک جا چکا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں، نہیں، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے، میں کہیں نہیں جاسکتی۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ایلی سن نے جلدی سے سوال کیا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو خلائی جہازوں کا اڈہ کہاں ہے؟“

”شہر سے باہر، اس طرف۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا یہاں اٹوم مشینیں بھی ہیں؟“

”جی ہاں، وہ..... وہاں چھت پر ہیں۔“ وہ ابھی تک ہچکیاں لے رہی تھی۔

”دروازے پر کوئی پیریدار تو نہیں؟“

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایلی سن دروازے کے قریب گیا اور ایک طرف ہٹ کر دستک دی، دروازہ کھلا اور سفید کپڑوں میں ایک شخص اندر داخل ہوا۔ ایلی سن نے وقت ضائع کئے بغیر اپنی ہتھیلی میں لگی ہوئی سوئی اس کے جسم میں داخل کر دی جونہی وہ شخص بے حس

و حرکت ہوا، ایلی سن اس کا لباس اتارنے لگا لڑکی پریشان ہو کر باہر بھاگی۔ ایلی سن نے اسے آواز دی مگر وہ جا چکی تھی۔ ایلی سن نے جلدی سے اس شخص کے کپڑے پہنے اور دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ وہ چاہتا تھا لڑکی مل جائے تاکہ اسے خلائی جہازوں کا اڈہ تلاش کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ وہ خطرناک ہتھیار یعنی زہریلی سوئی اب تک اس کے پاس تھی۔ اس نے برابر اگلے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر بھاگا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ فرش پر ایک لاش پڑی تھی۔ ایلی سن نے قریب جا کر دیکھا خوف سے اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ وہ ایلی سن تھا یعنی وہ خود۔ وہ اگلے پاؤں بھاگا اور دوبارہ برآمدے میں آ گیا طویل برآمدے کے دوران اطراف میں ویسے ہی چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جس انداز کے کمرے میں وہ اب تک قید تھا۔ اتفاق سے کوئی شخص وہاں موجود نہ تھا۔ ایلی سن تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہیں نہ کہیں زینہ نظر آ جائے گا۔ ایک موٹر پر اچانک دروازہ کھلا اور سفید کپڑوں میں ایک مقامی شخص برآمدے میں آیا۔ ایلی سن نے اپنی ٹوٹی ماتھے پر جھکا لی اور بے پروائی سے اس کے سامنے سے گزر گیا۔

چونکہ اس نے خود بھی سفید کپڑے پہن رکھے تھے، اس لئے اس شخص نے مطلق توجہ نہ دی اور اس پر ایک اچھتی سی نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ برآمدے کے آخر میں ایلی سن کو اوپر جانے والا زینہ دکھائی دیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک ہی سانس میں چھت پر پہنچ گیا۔ دن کا وقت تھا ایک چھوٹا سا سورج سر پر چمک رہا تھا۔ دو دروازے زینے ہی زینے نظر آ رہے تھے۔ یہ بہت بڑی عمارت تھی چھت پر لگی فضا کی کاریں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی شکل بہت بڑی گیند کی طرح تھی، نیچے ایک چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا ایلی سن نے اب تک ایسی کار نہیں دیکھی تھی پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے اڑانے کی کوشش کرے گا۔ وہ دوڑ کر ایک قریبی کار میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس

کار میں صرف دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، سامنے بہت سے ڈائل تھے اور تین لیور ایک لیور پر تیر کا نشان اوپر کی طرف تھا دوسرے پر نیچے کی طرف تیسرے لیور پر کوئی نشان نہ تھا۔ ایلی سن سمجھ گیا کہ پہلا لیور کار کو ہوا میں اٹھانے کے لئے ہے اور دوسرا نیچے لانے کے لئے تیسرا لیور غالباً آئین اسٹارٹ کرنے کے لئے تھا۔ اس نے تیسرے لیور کو ذرا سی حرکت دی۔ ڈائل پر بزم بقی روشن ہو گئی۔ ایلی سن نے پہلا لیور دیا اور کار بغیر کسی شور کے فضا میں بلند ہوئی لڑکی کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ خلائی جہازوں کا اڈہ کس طرف ہے لیکن فضا کی کار کو اس طرف موڑنے کی ترکیب سمجھ میں نہ آتی تھی اس نے تینوں لیوروں کو دائیں بائیں حرکت دینے کی کوشش کی اور بالآخر اسے معلوم ہو گیا کہ تیسرے لیور سے وہ سمت بدل سکتا ہے اس نے فضا کی کار کا رخ لڑکی کے بتائے ہوئے خلائی اڈے کی طرف موڑ دیا اور کڑکڑکیوں سے نیچے دیکھنے لگا جہاں تک نظر کام کرتی تھی ایک وسیع و عریض شہر نظر آ رہا تھا۔ لمبی لمبی سفید گلیاں، گنبد نما عمارتیں اور عجیب و غریب درخت جن کا رنگ بزم نہیں، سرخ تھا کہیں کہیں پراسرار مشینیں اور بڑے بڑے ڈرم بھی نظر آئے۔

ایلی سن سمجھ گیا یہ ان کی سائنسی تجربہ گاہ ہیں۔ جلدی سے خلائی جہازوں کا اڈہ نظر آ گیا۔ اڈہ خالی تھا لیکن کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا جہاز کھڑا تھا۔ اف خدا یا ایلی سن نے سوچا ایتنا بڑا خلائی جہاز اس نے ساری عمر میں نہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا زل والوں نے بنایا ہے کیونکہ ان کے قد زمینی انسانوں سے کئی سو گنا بڑے تھے اور اسی نسبت سے ان کی ہر چیز بڑی تھی۔ اور کوئی جہاز اڈے پر موجود نہ تھا، اس لئے ایلی سن نے سوچا اگر وہ کسی طرح اس جہاز کے اندر پہنچ جائے تو اسے اڑانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

زل سیارے میں وہ ایک سے زائد مرتبہ جا چکا تھا اور وہاں کی سائنس اور ٹیکنالوجی سے بخوبی واقف تھا لیکن اس جہاز تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس کا

دروازہ زمین سے کئی ہزار فٹ اونچا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ ایلی سن فضا کی کار کی مدد سے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائے عام حالات میں ایسا کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن اس وقت ایلی سن کی جان پر مبنی ہوئی تھی اور وہ ہر قیمت پر اس منحوس سیارے سے نکل جانا چاہتا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ فضا کی کار کو کھوٹے فاصلے پر لے گیا۔ اور وہاں سے راستہ متعین کر کے نہایت پھرتی کے ساتھ دروازے کے پاس پہنچ گیا یہاں اس نے لیور کو نیوٹرل کیا اور کار کا دروازہ کھول کر خلائی جہاز کے ہینڈل پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا فضا کی کار ہوا میں معلق تھی لیکن کسی وقت بھی اس کے ہٹنے کا خدشہ تھا۔ اور خلائی جہاز کے دروازے کا ہینڈل اتنا بڑا تھا کہ اسے ایک ہاتھ سے کھولنے کی طاقت نہ تھی بالآخر اس نے ہاتھ اندر کھینچ لیا، فضا کی کار کا دروازہ بند کیا اور لیور دبا کر اسے چھپے لے گیا۔ اس بار وہ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے فضا کی کار اڑاتا ہوا دروازے کے ہینڈل کے قریب آیا اور کار ہینڈل سے نگرادی قسمت اچھی تھی دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور وہ کار سمیت جہاز کے اندر چلا گیا۔ اس کے اندر جاتے ہی خلائی جہاز کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

ایلی سن اتنے بڑے خلائی جہاز میں نہ تھا۔ پہلے تو اسے خوف آیا۔ کہیں جہاز میں زل کا کوئی باشندہ نہ ہو لیکن فضا کی کار کی مدد سے جہاز کے سب کمروں میں پرواز کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں کٹرول روم میں جہاز کے لیور اتنی اونچائی پر تھے کہ فضا کی کار کی مدد کے بغیر ان تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ اس نے نشانہ لیا اور فضا کی کار لیور تک لے گیا انہیں دبانے انسانی طاقت سے باہر تھا۔ لہذا یہاں بھی اسے وہی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے فضا کی کار کو لیوروں سے نگرادیا اور جہاز آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ کٹرول ڈیسک پر اور کوئی مین موجود نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا جہاز کا رخ پہلے سے متعین کر دیا گیا ہے اور وہ اسے تبدیل



نہیں کر سکتا۔ نقشے اور چارٹ اتنے بڑے تھے کہ ایک نظر میں انہیں دیکھنا بہت مشکل تھا۔

بہر حال وہ کار کی مدد سے جو قیوڑا بہت اندازہ کر سکا، جہاز کا رخ زمین ہی کی طرف تھا۔ یہ بات حیران کن تھی، تاہم ایلی سن سمجھ گیا کہ زحل والے اس سیارے سے لوٹ کر زمین پر جانا چاہتے ہوں گے۔ یہ سمجھ میں نہ آیا وہ اس سیارے تک پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہو گئے جبکہ وہ ابھی اسی نظام شمسی میں تھے جس میں زمین واقع تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ اس سیارے والوں سے کوئی ساز باز کر رہے ہیں اور زمین پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ وہ جہاز ایلی سن کے قبضے میں آ گیا۔ وہ صحیح سلامت زمین تک پہنچے یا نہ پہنچے، زحل والے تو واپس نہ آ سکیں گے۔ اسے یقین تھا جہاز اور اس کے ساتھیوں کے پاس اتنا بڑا جہاز ہو ہی نہیں سکتا جس میں زحل کی دیوقامت مخلوق سما سکے۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھا اور جہاز نہایت تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

کنٹرول روم سے پرواز کر کے ایلی سن ایک بار پھر نشست گاہ میں پہنچا اور فضائی کار سے اتر کر ایک وسیع و عریض صوفے پر لیٹ گیا۔ اس کی سوچیں جہاز کے سیارے تک جا پہنچیں جہاز شاید ہوش میں آ چکا ہو۔ اگر ایسا ہوا، تو وہ ہر قیمت پر اسے پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ خلائی جہاز پر راکٹ چھیکنے، یا کسی تیز رفتار جہاز میں سوار ہو کر اس کا پیچھا کرے۔ بہر حال ایلی سن کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ جہاز اور اس کے ساتھی اسے جان سے نہیں ماریں گے اور زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ ان کے نزدیک بہت ”قیمتی“ تھا۔ ایلی سن کے لئے دوسرا بڑا خطرہ یہ تھا کہ زمین پر کس طرح اترے۔ اتنے بڑے جہاز کے لئے ایک وسیع و عریض اڈے کی ضرورت تھی۔ وہ دل ہی دل میں دنیا کے بڑے بڑے ہوائی اڈوں کے متعلق سوچنے لگا ان میں سے کوئی بھی اتنا بڑا نہ تھا کہ اس جہاز کو اتار سکے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ زمین والے اس عفریت کو دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جائیں گے اب وہ کسی طرح

انہیں یہ بتانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا کہ اس جہاز کے اندر ان کا ایک بھائی بند موجود ہے۔ ممکن ہے یہ خلائی جہاز دیکھتے ہی وہ اس پر حملہ آور ہوں اور اسے جس جس کر دیں، اس صورت میں اس کی ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ وہ نہ صرف اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے بلکہ ایک نئے سیارے کے بارے میں دنیا والوں کو کچھ بتانے کے قابل نہ رہے گا۔

جہاز میں سوار ہوتے وقت وہ جلدی میں خوراک اور پانی کے ذخائر کا اندازہ نہ کر سکا تھا جو بھی جہاز نے پرواز کی، اسے یہ خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں ایندھن ختم نہ ہو جائے بھوک بھی زوروں پر تھی، وہ اٹھا اور فضائی کار میں بیٹھ کر اسٹور کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اسٹور کا دروازہ کھولنے میں اسے بہت دقت ہوئی تاہم جیسے تیسے وہ کامیاب ہو گیا۔ اسٹور میں پانی بھی موجود تھا اور خوراک کے ڈبے بھی لیکن ان تک رسائی ممکن نہ تھی پانی کا ہر ڈبا اس کے قدم سے بارہ فٹ اونچا تھا اور مضبوط دھات کا بنا ہوا تھا خوراک بھی ٹین کے تحت ڈبوں میں تھی اور دھات کی اچھانچ موٹی چادر کاٹنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ دوبارہ انجن روم میں گیا اور ساتھ والے کمپن میں اسے ویلڈنگ کا سامان مل گیا۔ اس نے گیس کا سلنڈر ایک رے کی مدد سے فضائی کار سے بانہا اور پرواز کرتا ہوا اسٹور میں پہنچا۔ بڑی مشکلوں سے صحیح نشانہ لیا اور ویلڈر کی مدد سے پانی اور خوراک کے ڈبے پکھلا دیئے پانی فرش پر پھیلنے لگا وہ جلدی سے ایک خالی بوتل کا ڈھکنا اٹھا لیا جس نے اچھا خاصا بالٹی کا کام دیا۔ اس نے بالٹی پانی سے بھری اور اسے سخت گاہ میں لے گیا واپس آ کر وہ خوراک کے ڈبے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ایک لیس دار گاڑھا مادہ ڈبے کے سوراخ میں سے فٹ رہا تھا۔ اس نے ذرا سا پکھا بہت خوش ذائقہ تھا، وہ فرش پر بیٹھ گیا اور خوب سیر ہو کر کھایا پیا، پھر فضائی کار میں بیٹھ کر نشست گاہ میں رکھے ہوئے صوفے تک پہنچا اور بیٹھی نیند کے مزے لوٹنے لگا۔

جب وہ اٹھا تو دیکھا کہ جہاز ٹھیک پرواز

کر رہا تھا۔ فضائی کار قریب ہی تھی لیکن اسے خدشہ تھا کہیں اس کا ایندھن ختم نہ ہو جائے، اس لئے وہ پیدل ہی اسٹور کی طرف چل کھرا ہوا۔ وہاں سے دوبارہ پیٹ بھرنے کے بعد انجن روم میں گیا۔ اچھی خاصی ورزش ہوئی تھی اسٹور سے انجن روم تک کوئی ایک فرلانگ کا فاصلہ ہوگا نقشوں کی مدد سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ نصف فاصلہ طے کر چکا ہے۔

دن اور نصف گزرتے گئے وہ صبح شام ڈٹ کر کھانا کھاتا اور صحت برقرار رکھنے کے لئے پیدل گھومتا۔ خلائی جہاز میں آسکین کے پیچے موجود تھے لیکن ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی، جہاز کے اندر تھی آسکین تھی، وہ اس کے لئے بیہوش کام دے سکتی تھی۔ کبھی بکھار وہ تنہائی سے گھبرا جاتا۔ اس کا جی چاہتا کسی سے باتیں کرے، لیکن وہاں کون تھا جو اس کی خواہش پوری کرتا۔

ایک بار اس نے اسٹور روم میں سے کوئی کتاب تلاش کرنے کی کوشش کی مگر زحل کی چھپی ہوئی کتاب پڑھنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ کتاب کو انگریزی میں تھی اور معلوم ہوتا تھا انہوں نے کسی زمینی کتاب کا خاص ایڈیشن شائع کیا ہے لیکن اس کی لمبائی چورائی اتنی زیادہ تھی کہ ایلی سن کی آنکھ ان حروف کو پوری طرح نہ دیکھ سکتی تھی۔ کتاب کے ایک صفحے سے دوسرے صفحے تک سفر کرنے کے لئے اسے پندرہ بیس منٹ درکار تھے بہر کیف وقت جوں توں گزرتا رہا اور ایلی سن اپنی کوششوں میں مصروف رہا کہ کسی طرح خود کو مایوس نہ ہونے دیا۔ وہ ہر روز دو تین میل پیدل چلتا، ورزش کرتا، ڈٹ کر کھاتا اور پھر لمبی تان کر سو جاتا۔

ایک روز جب وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک خلائی جہاز میں ایک زلزلہ سا آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اسے سمجھوڑ رہی ہے۔ ہر چیز تہہ بالا ہو گئی۔ ایلی سن بھی صوفے پر گر آ اور اسے خاصی چوٹ آئی۔ اگلے ہی لمحے انجن روم سے آواز آنی بند ہو گئی۔ سارے انجن رک گئے تھے وہ فضائی کار کی طرف بھاگا اور اسے تیزی سے اڑتا ہوا انجن روم میں پہنچا یہ

دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ڈائل کے مطابق وہ منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا انجن خود بخود بند ہو گیا تھا اور سبز بتیاں جل اٹھی تھیں اس نے کار کا رخ بیرونی دروازے کی طرف موڑ دیا۔ خلائی جہاز کا یہ دروازہ کھولنے وقت اسے خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، تاہم اس نے وہی پہلے والا طریقہ استعمال کیا اور کار کو ٹھیک نشانے پر پینڈل کے ساتھ ٹکرا دیا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور وہ کار سست باہر آ گیا۔

”عجب دروازہ ہے، اندر کی طرف سے بھی کھلتا ہے اور باہر کی طرف بھی۔“ وہ بڑبڑایا، جہاز سے باہر تخت تاریکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس فضائی کار میں لوگوں کے سروں پر سے گزر جائے گا اور وہ حیرت سے اسے دیکھتے رہ جائیں گے لیکن اس کی ساری امیدیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ جو بھی وہ فضا میں بلند ہوا، ایک دیوقامت ہیولا آگے بڑھا اور ایک بہت بڑے ہاتھ نے جس کی چوڑائی کم و بیش آٹھ فٹ کے لگ بھگ تھی پکڑ کر اس کی کار کو ٹھکی میں لے لیا۔ لمبی لمبی انگلیوں نے کار کا دروازہ کھولا اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور پھر شاید اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی مگر تقدیر سے لڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ جس دیو کے قبضے میں تھا وہ اسے چنگیوں میں مسل سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کی سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو گئیں، لیکن آہستہ آہستہ حقیقت حال اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے سوچا زحل والوں کا خلائی جہاز زمین پر کیسے جا سکتا تھا۔ وہ یقیناً زحل پر پہنچ گیا ہے اور وہ دیونا انسان زحل کی مخلوق ہے شدید بے بسی اور لاچارگی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے معلوم ہوتا تھا زحل والوں کو پہلے سے اپنے جہاز کی واپسی کا علم ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شدید تاریکی کے باوجود فوراً پکڑا گیا۔

بہر کیف اب وہ دشمن کے قبضے میں تھا اور یہاں سے بچ نکلنا ناممکن نظر آتا تھا۔ تاہم وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو جلد ہمت ہار جاتے ہیں وہ آخر دم تک لڑنے



کا قائل تھا چنانچہ اس نے بڑی سنجیدگی سے غور شروع کیا کہ اس دیوے سے کیونکر نجات حاصل کر سکتا ہے اور پھر دفعۃً اسے وہ زہریلی سوئی یاد آئی جس کی مدد سے اس نے جونز کو بے ہوش کیا تھا۔ وہ جیب میں اچھلتے اور کودنے لگا۔ جلد ہی ایک ہاتھ جیب میں آیا اور اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ پہلے سے موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے جلدی سے زہریلی سوئی اس شخص کی وسیع و عریض ہتھیلی میں گھونپ دی۔ نتائج بہت حوصلہ افزا نکلے وہ شخص لڑکھڑایا اور پھر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ایلی سن جیب سے نکلا اور پوری قوت سے دوڑنے لگا۔ وہ جلد از جلد اس شخص سے دور جانا چاہتا تھا۔ راستے میں لکھڑا آئے اور وہ اس میں گرتے گرتے بچا۔ آخر اسے ایک گلی کھائی دی اور وہ اس گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی ڈیڑھ سو گز چوڑی تھی اور فٹ پاتھ کی چوڑائی پچاس فٹ سے کم نہ تھی وہ بڑی مشکل سے فٹ پاتھ پر چڑھنے میں کامیاب ہو سکا۔ اکا دکا راگبر آ جا رہے تھے اور اسے دھڑکا کہیں وہ اسے پیروں تلے نہ چل دیں اس لئے وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ایچانک سامنے ایک چوک آ گیا یہاں ٹریفک کا زور تھا زحل والے اپنی طویل و عریض گاڑیوں میں سوار تھے اور یہ گاڑیاں قیامت کا شور مچاتی ہوئی قریب سے گزرتیں تو اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ آخر ایک جگہ اسے تھوڑی سی روٹی مل گئی۔ اسے وہ روٹی اٹھائی اور دونوں کانوں میں اڑس لی۔ اب وہ شور سے محفوظ ہو گیا تھا۔ سڑک پار کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا وہ دیر تک انتظار کرتا رہا اور آخر جب گاڑیاں گزرتیں اور سڑک تقریباً خالی ہو گئی تو وہ دوڑ کر سڑک پار کرنے لگا۔ ابھی وہ آدھا راستہ طے کر سکا تھا کہ دور سے ایک دیو قامت ٹرک آتا ہوا دکھائی دیا۔ ٹرک لمحہ بے لمحہ قریب آ رہا تھا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ واپس جانے کی کوشش بے سود تھی ٹرک سر پر آ پہنچا ایچانک اسے ایک گڑھا دکھائی دیا سڑک یہاں سے ٹوٹ گئی تھی اور جا بجا گڑھے بن گئے تھے۔ وہ ایک ہی جست میں گڑھے میں پہنچ گیا اور چٹ

لیٹ گیا۔ ٹرک اس کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ اٹھا اور گردوغبار کی وہ تہہ ہٹانے لگا جس نے اسے ڈھانپ لیا تھا ایک اور دوڑ کے بعد وہ سڑک کی دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک بات جس سے وہ بہت پریشان تھا ان گلیوں اور سڑکوں کی حیرت انگیز حد تک زمینی گلیوں سے مشابہت تھی چند سال پہلے جب زمینی لوگوں کے زحل والوں سے تعلقات اچھے تھے تو وہ ایک خبر سنا لی کہ وہ لوگ یہاں آیا تھا لیکن بعد میں تعلقات بگڑ گئے اور زحل والے زمین کے خلاف نت نئی سازشیں کرنے لگے کبھی وہ مرغ اور مشتری کے باشندوں کو ساتھ ملا کر زمین پر چڑھائی کرنے کا منصوبہ بناتے، تو کبھی خود کار راکنوں سے زمین کے کسی حصے کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے لیکن زمینی باشندے سائنس میں ان سے کہیں آگے تھے اور اپنے عظیم حلیے اور یو قامت اعضا کے باوجود زحل والے زمین والوں کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ بہر کیف اب جو وہ چاروں طرف دیکھتا تو ہر شے بدلی ہوئی نظر آتی۔ معلوم ہوتا تھا زحل والوں نے گلیاں، مکان، گاڑیاں، لباس غرض ہر شے میں زمینی باشندوں کی نقل کی تھی۔ اب ہر چیز بڑے پیمانے پر ہونے کے باوجود شکل و صورت میں زمینی چیزوں سے مشابہت تھی۔ وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ اس کی نظر ایک بچے پر پڑی۔ اس نے جھک کر دیکھا یہ لندن ٹائٹنر کا ایک صفی تھا اس کا سر گھومنے لگا لندن ٹائٹنر زحل سے بھی مشابہت ہوتا ہے لیکن اس صفی پر ایک جگہ جلی حروف میں لکھا تھا، نیویارک، خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی کیا یہ ممکن ہے کہ یہ واقعی اس کی اپنی زمین جہاں سے وہ جونز کے ساتھ سیارے کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے ہر چیز اتنی بڑی تھی کہ وہ دنگ رہ گیا تھا لندن ٹائٹنر کا پھٹا ہوا ورق دیکھنے کے بعد اسے کچھ شک سا ہو گیا۔

گلی ایک وسیع و عریض بازار میں داخل ہوتی تھی۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کانوں کے سامنے بورڈ دیکھنے لگا اور پھر ایک بار اسے اپنی بے بسی کا شدت

سے احساس ہوا یہ سب دکائیں اس کی دیکھی بھالی تھیں۔ وہ یہاں بیسیوں بار آچکا تھا۔ گرین ریسٹورنٹ میں وہ مہینوں چائے پیتا رہا تھا۔ موٹر پر جوڈ پارٹمنٹل اسٹور تھا وہاں سے خریدے ہوئے کپڑے وہ ابھی تک پہنے ہوئے تھا جتنی حیران کن بات تھی وہ دوبارہ زمین پر تھا ہر چیز وہی تھی۔ لیکن جماعت میں بڑی ہوئی تھی لیکن نہیں..... وہ خود بہت چھوٹا ہو گیا تھا جونز نے اس کے ساتھ یقیناً مذاق کیا تھا اسے اپنی سائنس سے کام لے کر اسے اتنا مختصر کر دیا تھا کہ وہ دوبارہ دنیا میں پہنچنے پر بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اس بھری پری دنیا میں تو تھا اپنی جماعت کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک مکوڑے سے زیادہ نہ تھی۔ لوگوں کی باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں، کیونکہ وہ زور سے بولتے تھے کہ سوائے بے گم شور کے کچھ اس کے پلنے پڑنا تھا کاش، اسے جونز مل جائے وہ اس سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ اسکی ساری تباہی و بربادی کا ذمہ دار تھا۔ اس نے جونز پر اعتبار کیا تھا لیکن یہ اعتبار اسے بہت بڑبڑا۔ اب وہ کیا کرے، کہاں جائے۔

وہ واپسی سے رونے لگا۔ خاصی دیر تک وہ اپنی قسمت پر آنسو بہاتا رہا، اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایک حقیر جو بے کی طرح دیوار کے ایک شکاف میں دیکھا بیٹھا رہا۔ رد و حرکت جب اس کا جی ہلکا ہوا تو وہ اٹھا اور کچھ سوچ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ سڑکیں اور گلیاں پہچاننے میں اسے بڑی مشکل پیش آتی تھی اس کے باوجود وہ نام پڑھتا ہوا کسی نہ کسی طرح گھر کی سمت سفر کرتا رہا۔ کئی دن گزر گئے چند میل کا فاصلہ اس کے لئے کئی سو میل بن گیا تھا دن بھر وہ کسی تاریک کونے میں چھپا رہتا کیونکہ اسے خوف تھا کہ کوئی اسے دیکھ کر پکڑ لے گا اور جو بے سمجھ کر پڑیا گھر میں بیچ دے گا۔

دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ راگبیروں کے پاؤں تلے نہ آ جائے۔ جب رات خاصی گزر جاتی اور سڑکوں پر بھیڑ کم ہو جاتی تو وہ اپنی عارضی "پناہ گاہ" سے نکلتا اور دیواروں کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف بڑھنے لگتا۔ کئی دفع گزر گئے۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے چہرہ اور ہاتھ

پاؤں زخمی ہو گئے سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے اور وہ اچھا خاصا جانور نظر آنے لگا۔ بھوک اور پیاس مٹانے کے لئے وہ مکانوں اور گھروں کے سامنے بے ہوشے کوڑے کرکٹ کے ڈبوں میں سے کچھ تلاش کر لیتا۔ بسکٹوں کے خالی ڈبوں میں بھی اسے اتنا کچھ مل جاتا کہ وہ خوب پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ ایک دو بار اس نے دودھ کی خالی بوتلوں میں بچا کچھا دودھ بھی پیا معلوم ہوتا تھا اسے گھر تک پہنچنے کے لئے کئی ماہ درکار ہوں گے، لیکن قسمت اچھی تھی جو اسے کڈی نظر آ گیا۔ کڈی اس کے پڑوسی کا بیٹا تھا چار پانچ سال عمر بھی بہت ہی کھلنڈ اور شوخ، اکثر اوقات وہ اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھیلا کرتا تھا جس میں بیٹھ کر ایلی سن اپنی سائنسی رپورٹیں مکمل کرتا تھا کڈی کے باپ کے پاس ایک پرانی سی موٹر کار تھی اور وہ بھی کبھی اسے دھودھلا کر کڈی کے ساتھ محلے بھر کے بچوں کو سیر کرانے لے جایا کرتا تھا۔ ایلی سن ایک دکان کے چمچے کے نیچے کھڑا ایک خالی بوتل میں سے اچار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی نظر کڈی پر پڑی۔ وہ اپنی موٹر کار میں بیٹھا تھا۔ چونکہ وہ ابھی بچہ ہی تھا اس لئے ایلی سن کو اس کا چہرہ اور آنکھیں نظر آ گئیں اور اس نے جھٹ پہچان لیا کہ وہ کڈی ہے۔

کچھ سوچ کر ایلی سن اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور بھاگ کر موٹر کے نیچے چھپ گیا۔ نمبر پلیٹ خاصی اونچی تھی تاہم اسے ایک اینٹ دکھائی دی اور وہ اس اینٹ پر چڑھ کر نمبر پلیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ نمبر پلیٹ اور موٹر کی ڈی کے درمیان تھوڑی سی محفوظ جگہ تھی وہ اس جگہ بیٹھ گیا اور نمبر پلیٹ کے کنارے مضبوطی سے پکڑ لئے تھوڑی دیر بعد اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ موٹر چل پڑی تھی۔

دن بھر وہ اسی جگہ بیٹھا رہا۔ موٹر کئی جگہ گئی اور تین چار مرتبہ رکی، لیکن وہ نہ اترا، جھٹکوں سے اس کا جسم ٹوٹنے لگا۔ چند بار اسے اچھی خاصی چوٹیں بھی آئیں۔ مگر وہ مستقبل مزاجی سے اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ آخر شام ہونے لگی۔ موٹر ایک جگہ رکی اور سب لوگ اتر کر چلے گئے۔ ایلی سن پھر کبھی وہیں بیٹھا رہا۔ جب رات کی سیاہی



چاروں طرف پھیل گئی تو وہ اٹھا اور نیچے چھلانگ لگادی۔ وہ ٹھیک مقام پر پہنچ گیا تھا۔ سامنے اس کا گھر نظر آ رہا تھا، لیکن وہ خود کتنا بدل چکا تھا۔ پلاٹ میں اگی ہوئی گھاس اسے گنجان جنگل دکھائی دے رہی تھی اور دروازے تک پہنچنے والی سرسبزیاں اتنی بلیند تھیں کہ ان پر چڑھنا ناممکن نظر آتا تھا۔ ایلی سن اِدھر اِدھر گھومنے لگا۔ وہ اس تلاش میں تھا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے وہ سیرگی کا کام لے سکے۔ ہلا خراسے دو چھڑیاں مل گئیں اس نے ٹوڑے میں سے ایک لمبا سا اٹھایا (یہ رسا اصل میں ایک باریک دھاگا تھا) اور اچس کی جلی ہوئی تیلیاں تلاش کرنے لگا۔ کل آٹھ تیلیاں مل سکیں اس نے رسے کی مدد سے وہ تیلیاں ان چھڑیوں کے ساتھ اس طرح باندھیں کہ اچھی خاصی سیرگی تیار ہوگئی۔ اوپر کی منزل سے روشنی آ رہی تھی اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ اس کا دوست بیٹن جاگ رہا ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے سیرگی اٹھائی اور زینے سے لگادی۔ جب وہ دروازے میں داخل ہوا، تو ممکن سے اس کا جسم چورتھا اور ایک قدم چلنے کی سکت نہ رہی تھی۔ دروازے کی ایک طرف اسے فرش صاف کرنے کی جھاڑن دکھائی دی۔ وہ اس جھاڑن میں گھس کر سو گیا۔

جب وہ اٹھا تو دن نکل آیا تھا اور چاروں طرف چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آرام کرنے سے اس کی ساری تھکن دور ہوگئی تھی اور اب وہ تازہ دم تھا۔ اس نے سب سے پہلے بیٹن کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اتنی آواز پیدا کرنا اس کے بس میں نہ تھا جس سے بیٹن آگاہ ہو جائے۔ ہلا خراسلی سن نے فیصلہ کیا کہ وہ دروازے کے نیچے سے رینگ کر دوسری طرف پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اوندھے منہ لیٹ گیا اور ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر پہنچ گیا۔ کمرہ بالکل اسی طرح تھا جیسا کہ اس نے بارہا دیکھا تھا۔ ایک پلنگ، لکھنے کی میز اور کرسی اور کتا بوں کی ایک الماری، یہ کمرے کا کل سامان تھا، بیٹن کہیں دکھائی نہ دیا، ایلی سن، بیٹن کی خواب گاہ سے اپنے کمرے کی طرف چلا بگر اس کے کمرے میں تالا پڑا تھا

اور دروازے کے نیچے جگہ اتنی کم تھی کہ وہ اندر نہ جاسکتا تھا۔ ہلا خراسے بیٹن کے کمرے میں آیا اور کھانے کے لئے کچھ تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی اسے ایک بہت بڑی رکابی میں دودھ مل گیا۔ غالباً یہ دودھ بیٹن نے اپنی پالتو بلی کے سامنے رکھا تھا۔ تاہم بلی کہیں دکھائی نہ دی۔ ایلی سن نے ڈٹ کر دودھ پیا اور پلنگ کے نیچے جا کر سونے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مرنے سے سو رہا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دوبارہ رات ہو چکی تھی بیٹن ابھی تک نہ لوٹا تھا۔ وہ اٹھا اور کمرے میں اِدھر اِدھر گھومنے لگا۔ اچانک اس کی نظر دو بڑی بڑی آنکھوں پر پڑی۔ یہ آنکھیں سرخ تھیں اور اسے گھوری تھیں۔ اس نے ذرہ پیچھے ہٹ کر دیکھا، تو اندازہ ہوا کہ وہ بیٹن کی پالتو بلی ہے۔ وہ بارہا اس بلی کو پیار کر چکا تھا، لیکن موجودہ حالت میں بلی اسے کیونکر پہچان سکتی تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ بلی غرائی ہوئی آگے بڑھی۔ ایلی سن کو اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ اس کے پاس بچاؤ کا کوئی طریقہ نہ تھا اور نہ ہی فرار ہونے کی طاقت، قریب پہنچ کر بلی رکی اور اپنا پیٹہ آگے بڑھا یا۔ ایلی سن کی سانس رگ گئی اور سوچنے کھینے کی صلاحیتیں ختم ہو گئیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ بلی کی گرفت میں تھا۔ اس نے آخری بار خود کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر بلی نے اسے مسلنا اور تھوڑا سا شروع کر دیا۔ شاید وہ کھانے سے پہلے اپنے شکار کو بے سدھ کرنا چاہتی تھی۔ یہ لمحہ بہت نازک تھے۔ وہ بے بس تھا اور اس عفریت سے نجات حاصل کرنے کی ساری کوششیں بے کار ہو چکی تھیں۔ دفعۃً بلی نے اپنا پیٹہ اس کے کندھے پر مارا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا اور حلق سے ایک چیخ نکلی۔ تکلیف کی شدت سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ بلی نے اسے پیٹ سے پکڑا اور ہوا میں اٹھا دیا۔ وہ سمجھ گیا آخری گھڑی آ پہنچی اور بلی اسے اٹھا کر مرنے تک لے جا رہی ہے۔

عین اس وقت جب بلی کی مونچھیں اسے چھو رہی

تھیں اسے زہریلی سوئی کا خیال آیا۔ اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر سوئی بلی کے نیچے میں داخل کر دی۔ بلی نے آخری بار اسے بری طرح جھنجھوڑا۔ اس کی ہڈیاں چٹختے لگیں لیکن اگلے ہی لمحے بلی کی گرفت کمزور ہوگئی اور وہ چٹ کر فرش پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ بے ہوش بلی اس پر گرے، وہ اٹھا اور دوڑ کر پلنگ کے نیچے چھپ گیا۔

بلی بے ہوش ہو چکی تھی، لیکن ایلی سن کو خطرہ تھا کہ جوہنی وہ ہوش میں آئے گی، دوبارہ اسے ہڑپ کرنے کی کوشش کرے گی۔ وقت بہت کم تھا اور کام بہت زیادہ بیٹن سے ملنے کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح وہ تجربہ گاہ کی میز تک پہنچ جائے۔ اس طرح بیٹن اسے با سانی دیکھ سکتا تھا۔ بیٹن اور وہ ایک ہی تجربہ گاہ میں کام کرتے تھے۔ اس کی غیر حاضری میں بیٹن ضرور وہاں موجود ہوگا۔ پیدل چل کر وہاں پہنچنا ممکن نہ تھا، کیونکہ وہ گھر سے کئی میل دور تھا اور اس کی موجودہ جسامت کی وجہ سے یہ فاصلہ سینکڑوں میل بن گیا تھا۔

آخرا سے ایک تدبیر سوچی۔ وہ دروازے سے نکل کر باہر برآمدے میں آیا اور اسٹور کی طرف چلا۔ اسٹور میں اسے جلد ہی مطلوبہ شے مل گئی یہ گتے کی ایک خالی ڈبیہ تھی جس میں ڈاک کے ذریعے کوئی دو اینٹین کے نام آئی تھی۔ ڈبیہ کے اوپر بیٹن کا نام اور تجربہ گاہ کا پتہ لکھا تھا۔ ایلی سن نے تھوڑی سی روٹی ڈھونڈ نکالی اور ڈبیہ میں رکھ دی۔ پھر وہ بسکٹوں کا چورہ جمع کرنے لگا اور کافذ کی ایک پڑیا میں باندھ کر ڈبیہ کے اندر رکھ دیا۔ اب وہ یہ چیزیں گھیسٹ کر باہر جن میں لے گیا۔ پھاٹک کے ساتھ ہی لیٹر بکس تھا زینے سے اترنے میں اسے اپنی بنائی ہوئی سیرگی نے بہت مدد دی پھر وہی سیرگی اٹھا کر وہ لیٹر بکس تک لے گیا اور گتے کی ڈبیہ لیٹر بکس میں ڈال دی۔ پھر بسکٹ کی پڑیا اندر ڈالی اور سب سے آخر میں خود اندر چھلانگ لگادی۔

لیٹر بکس میں سخت تاریکی تھی، تاہم رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ اس نے ڈبیہ کھولی بسکٹ کی پڑیا اندر رکھی

اور پھر خود بھی اندر چلا گیا۔ روٹی کا بستر بنا کر اس نے نے ڈبیہ کا ”دروازہ“ بند کر لیا اور آرام سے لیٹ گیا جلد ہی اسے نیند آگئی آنکھ اس وقت کھلی جب اسے ایک زلزلہ سا محسوس ہوا۔ غالباً خط اور پیکٹ الگ الگ کئے جا رہے تھے، پھر پچکولے لگے کسی نے اسے ڈبیہ سمیت اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد ڈاک گاڑی کی مسلسل حرکت اور ہلا خراسے خاموشی چھا گئی ایک بار پھر پچکول پچی اور اسے میز پر پھینک دیا گیا۔ پھر طویل خاموشی اس نے ”دروازہ“ کھولا اور آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ سامنے جانی پہچانی میز تھی۔ وہ اپنی تجربہ گاہ میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے اس کی کرسی پر کوئی بیٹھا تھا۔ بیٹن..... نہیں، وہ جوتھا۔ اس کا بدترین دشمن، وہی جس کی وجہ سے اسے یہ سب مصیبتیں ملی تھیں۔

ایک خوفناک قہقہہ کمرے میں گونجا۔ جوت کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

”ڈاکٹر ایلی سن۔ آخر آپ پہنچ گئے۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ایلی سن نے اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے میز سے چھلانگ لگادی۔ فرش پر گر گئے ہی اس کا دوسرا بازو بھی ٹوٹ گیا۔ اب وہ بالکل بے بس تھا۔ سامنے جوت کھڑا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس کا قدم عام انسانوں جتنا تھا۔ حالانکہ سیارے میں وہ ایلی سن ہی کی طرح تھا، مگر ایلی سن بھاگ کر ڈبیک کے نیچے چھپ گیا اور اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ جوت اس کا پیچھا کرے گا وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جوہنی جوت کی انگلیاں سامنے آئیں، وہ زہریلی سوئی ان میں گھونپ دے گا۔ وہ ہر قیمت پر جوت سے بدلہ لیتا چاہتا تھا۔ جوت نے اس کی اصل حالت غائب کر کے اسے بے یار و مدگار چھوڑ دیا تھا۔

”ڈاکٹر ایلی سن، باہر آ جائیے، میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“







# قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

میری ذات کے دونوں پہلو، ایک ظاہر ایک پنہاں  
میں دل لگانا بھی جانتی ہوں، دل چھڑانا بھی جانتی ہوں  
نظر نظر میں ہے خوشی، کہیں کہیں پر ہے اداسی  
وفا کی بازی لگا کے دیکھو، میں ہارنا بھی جانتی ہوں  
(مریم ماہ نمبر..... لاہور)

بند ہیں درپے تیرے پاس آؤں کیسے  
تو خفا ہو جائے تو میں مناؤں کیسے  
گزری ہے جو دل پہ بھلاؤں کیسے  
داغ وہ ملا ہے تجھے دکھاؤں کیسے  
(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

کون ہمارا درد پڑھے گا ان زخمی دیواروں پر  
اپنا اپنا نام لکھا ہے سب رونے والوں نے  
دل کا غم سے رشتہ کیا ہے، عشق کا حاصل آنسو کیوں  
ہم کو کتنا زہر پلایا ہے ان بے درد سوالوں نے  
(محمد وارث آصف..... وال پھراں)

تھکا ہوا ہے وجود سارا یہ ماتی ہوں  
مگر خیالوں سے کوئی جائے تو نیند آئے  
(فاریہ تبسم..... ٹھینگ موڈ تصور)

یہ کچھ دن ہیں کہ اس کو یاد ہر اک شام کرنا ہے  
پھر اپنے دل کی بستی میں اسے گناہ کرنا ہے  
یہ کچھ دن ہیں کہ اس کی یاد جسم و جاں تھکائے گی  
پھر اس کے بعد ہم کو دیر تک آرام کرنا ہے  
(سائل دعا بخاری..... بھیر پور)

اسے یقین کہ میں جان نہ دے پاؤں گا  
مجھے یہ خوف کہ روئے گا آزما کے مجھے  
(آستر..... کراچی)

بڑی باتوں کو خاطر میں نہ لانا اس کی عادت ہے  
ذرا سی بات پر طوفان اٹھانا اس کی عادت ہے

محبت میں وہ سنجیدہ ہے کتنا دیکھتے رہتا  
محبت ہر کسی سے یوں جتنا اس کی عادت ہے  
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہ دیار)

وہی رات کی خاموشی وہی تنہائی  
یہ ہوا بھی کسی کی یاد لے آئی  
ہم تو بیٹھے چاند کو دیکھ رہے تھے  
نہ جانے کس کے لئے آنکھ بھر آئی  
(موننا جاوید..... کراچی)

اس نے کہا، گہری رات کی تاریکیاں دیکھیں  
کہا میں نے، پرانے عشق ہر پل دل میں جتا ہے  
کہا اس نے محبت میں تپش محسوس ہوتی ہے  
کہا میں نے کہ یہ سچی ہو تو گلزار ہوتی ہے  
(رضیہ..... کراچی)

آج کل کی دوستی کاغذ کے پھول ہوتی ہے  
دیکھنے میں خوبصورت اور سونگھنے میں فستول ہوتی ہے  
(بلقیس خان..... پشاور)

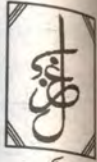
بات چلی کہاں سے اور کہاں، ڈھل گئی  
تم سے ملی نظر..... پھر کہاں تھنجل گئی  
ان نظروں کے حصار میں صرف تم ساگے  
نظریں جو جبک گئی تو طبیعت چل گئی  
(عثمان غنی..... پشاور)

خون کیسا لیوں سے چھوٹا ہے  
سانس ٹوٹی کہہ کاچ ٹوٹا ہے  
ساری دنیا اجڑ گئی جیسے  
اس طرح تیرا ساتھ چھوٹا ہے  
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی..... ٹھینگ موڈ تصور)

وہ جو رہتا تھا اس دل میں کبھی اپنوں کی طرح  
ایسا بھولا کہ ملتا ہے اب سپنوں کی طرح  
پل پل کرتا تھا جو ساتھ نبھانے کی باتیں  
چھوڑ گیا ہم کو پرانی رسوں کی طرح  
(انتخاب: شفیق رضا..... میاں چنوں)

چوٹ لگ جائے تو کیا ہوتی ہے دل کی حالت  
اک آئینے کو پتھر پہ گرا کر دیکھو  
(ریحانہ تبسم..... حیدر آباد)

☆☆



دور آنکھوں سے میری جس نے اجالے رکھے  
خواب آنکھوں نے سبھی اس کے سنبھالے رکھے  
ساتھ خوشیوں نے شب و روز نبھایا کس کا  
ہم نے پہ سوچ کے دکھ درد سنبھالے رکھے  
میری آنکھوں کو بھی کر دے گا وہ روشن اک دن  
جس نے آکاش کے دامن میں ستارے رکھے  
رات سادوں کی طرح ٹوٹ کے برسیں آنکھیں  
رات بھر ہم نے خطوط اس کے سنبھالے رکھے  
دل کے زخموں کو کسی طور بھی بھرنے نہ دیا  
ہم نے محفوظ محبت کے حوالے رکھے  
(حکیم خان حکیم..... کامل پور موسیٰ۔ انک)

کسی سے سل نہ سکا جو وہ چاک داماں ہوں  
کھانا نہ پھول کوئی جس میں وہ بخر خشک بیاباں ہوں  
مزایہ ہے کہ ہوں دنیا میں ایک عجیب اجنبی کی طرح  
لطف یہ ہے کہ میں اس دور میں بھی انساں ہوں  
شفقت تھا ایسا کہ تزئین بزم امکاں تھا  
شکست ایسی کہ خود سے بھی اب گریزاں ہوں  
بقدر طرف کرو کسب فیض دیدہ درو  
شیر گل کی طرح ہیں اب بھی یہاں پریشاں ہوں  
ظلم عقدہ کشائی ہے میرا دست جنوں  
مجھے پڑھو کہ میں بھی عزم شکست زنداں ہوں  
جو نئے جاگے تو دنیا ہلا کے رکھ دیں گے  
نہ مجھ سے الجھو کہ میں بھی سامان حشر سزا ہوں  
یہ حادثات جہاں کیوں ہوں در بدر واجد  
خدا وہ دن ہی نہ لائے کہ میں تن آماں ہوں  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نیگونی..... کراچی)

جو تمہارے لب پہ ہے وہ بات بھی بے ساختہ  
ہاتھ میں جو آگیا، وہ ہاتھ بھی بے ساختہ

اس ہوانے جانے کیا سرکوشی کی ہے جھوم کر  
ناچ اٹھا ہر شجر ہر بات بھی بے ساختہ  
یہ قبیلے اور نسل کے بندھنوں سے بے خبر  
عشق تو اک ذات ہے اور ذات بھی بے ساختہ  
اک ذرا سی بدگمانی بھی جو آئے دریاں  
آنکھوں سے ہو اشکوں کی ہر بات بھی بے ساختہ  
تحفوں سے کب کم ہے یہ اہل وفا کے واسطے  
دلہروں کے ظلم کی سوغات بھی بے ساختہ  
جان لیتی ہیں دلوں کے راز آنکھیں دیکھیں  
راحت دل کو مگر ہے بات بھی بے ساختہ  
آفتاب عشق سے یوں بکھری ہر سو روشنی!  
چچ اٹھے درد سے ذرات بھی بے ساختہ  
قلب خانم سے ٹپکتی ہے دعا یہ بارہا!  
اے خدا ہو سات اس کا، سات بھی بے ساختہ  
(فریدہ خانم..... لاہور)

منزل پاس ہے اور راہ گزر بھی میرے پاس ہے  
اس دشت غبار میں فقط مسافر کی تلاش ہے  
دل میں میرے اک خواہش سی ہے دہلی دہلی  
میرے دل کو اجڑے باغ کو کلی کھلنے کی تلاش ہے  
ہوتا نہیں ہے کسی سے مداوا غم دل کا  
ہمیں خوشیوں کی آرزو ہے، خوشبوؤں کی تلاش ہے  
کل کا کچھ پتہ نہیں طلوع ہو بھی کہ نہ ہو  
میری آنکھوں کو ابھی بھی اک سحر کی تلاش ہے  
کچھ بھی تو مشترک نہ تھا ہم دونوں کے بیچ  
دل لگی اس کا کھیل، ہمیں اک محبت کی تلاش ہے  
دنیا کو تلاش جس کی ہمیں اس تلاش سے کیا  
ہمیں اک خدا اور پھر اک ناخدا کی تلاش ہے  
(مریم ماہ نمبر..... لاہور)

ادائے حسن کی تاثیر بھی کیا ہوتی ہے  
چھب کے رہ جاتی ہے دل کی جو صدا ہوتی ہے  
شونی، چشم، حیا پوش، غم ابرو توبہ  
کسی پر کیف حسینوں کی ادا ہوتی ہے



مراد وجود ہے تشنہ طویل عرصہ سے تصور میں جو آتے ہیں جاں اپ نہ فدا ہوتی ہے بڑے صبر و تحمل کا وقت ہے اے دوست ہو جام و صوبو سامنے پھر کس سے قضا ہوتی ہے صورت حسن پہ کیوں کر نہ فدا ہو امتیاز ہر ادا ان کی قیامت کا نشان ہوتی ہے (ایس امتیاز احمد.....کراچی)

شام سے جو خاموش بنی سی رہتی ہیں جاگتی سرکیں کچھ نہ کچھ تو کہتی ہیں جن کا دھوکہ لے ڈوبا تسکین مری! یاد کی دیکھ آنکھیں اب کیوں بہتی ہیں اس کے ایک کھلونے سے جو کھیلا تھا اب بھی سائیں نام اسی کا لیتی ہیں رات مرے ارمان کو کھائے جاتی ہے جانے آنکھیں مڑ مڑ کے کیا جھکتی ہیں یادوں کے بستر پہ جب بھی سوتا ہوں تیز ہوائیں روح پہ دستک دیتی ہیں کتنی پاگل ہیں قمر کی آنکھیں بھی دیواروں سے دل کی باتیں کہتی ہیں (چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

دیکھتی ہیں میری آنکھیں نظارے کیسے کیسے آشیان سے اٹھتے ہیں نظارے کیسے کیسے جان بوجھ کے بھی نہیں ملتا وہ مجھے زمانے میں مہرباں ہیں ہمارے کیسے کیسے نہیں گم تھے سے بے وفا کی کاہنشاہیں تقدیر میں اپنی ہیں انگارے کیسے کیسے نظروں سے دور جا کے بھی تو خوش رہتے جھکتے ہیں آسمان پہ ستارے کیسے کیسے بدھیتی ہے میری تیرے ستم سہتا ہوں تیری مسکراہٹ کے ہیں نظارے کیسے کیسے زندگی بھی ہم نے داؤ پہ لگادی ہے جاوید چمن میں پھول مہکتے ہیں پیارے کیسے کیسے (محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

تم سے بچھڑے ہیں تو جانی ہے دنیا کی حقیقت ہر سانس یہاں آفت، ہر گھڑی ہے مصیبت کون کہتا ہے کہ بچھڑنے سے آتی ہے یاد میں کی ہمارے دل کو تو آج بھی ہے تم سے وہی عقیدت رقص بھل ہو، زہریلا اہل یا سولی ہو کوئی اس کی آب و تاب وہی کہ یہ ہے وادی محبت ایک پل کے دیدار پر، سو جائیں کردوں فدا یہی ہے دستور وفا، یہی ہے انقضاے الفت (افضل رباب.....فیصل آباد)

اپنی تنہائی کا احساس دلاؤں کیسے جو مرے دل پہ گزرتی ہے بتاؤں کیسے کند ذہنوں سے سیاحتی کو مٹاؤں کیسے راہ سیدھی میں زمانے کو دکھاؤں کیسے سونے لگتا ہوں تو پلکیں یہ چمک جاتی ہیں اپنی آنکھوں میں تیرے خواب چھپاؤں کیسے میرا شیوہ ہے فقط سب سے محبت کرنا دل میں نفرت کی میں دیوار اٹھاؤں کیسے بھول سکتا ہوں زمانے کی نوازش، لیکن میرے محبوب، تیرا پیار بھلاؤں کیسے (شرف الدین جیلانی.....ننڈوالہ پار)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ وعدہ نبھانا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ جو لطف مجھ پر تھے بیشتر وہ کرم تھا میرے حال پر مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں وہ ہر اک بات پر روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو کبھی ہم میں تم میں چاہتی تھی تم کو کبھی ہم سے راہ تھی کبھی ہم تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باؤدا

وہی ہوں دلیر یا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (محمد وارث آصف.....واں پھراں)

نے لی انگڑائی پھر یاد تمہاری آئی بادل کیا آئے پھر یاد تمہاری آئی نے دل کو سمجھایا کہ نہ جانا اس پار کبھی سے موسم بدل گیا پھر یاد تمہاری آئی آنکھوں کے سارے منظر کرجی کرجی ہو گئے آنکھوں سے نکلے پھر یاد تمہاری آئی رنگ زندگی ہے رگوں سے عاری عاری دل کو دیکھ کر پھر یاد تمہاری آئی جتنا بھی کیا جیتا ہے اس سے بہتر مرجانا ہے دل نما چہروں کو دیکھ کر پھر یاد تمہاری آئی (عثمان غنی.....پشاور)

لوگوں پہ اکثر عشق کے حلقے ہوتے رہتے ہیں شہر سناٹے رہتے ہیں اور کھلے ہوتے رہتے ہیں محب کے جاکر وہ بچوں کی مٹیں کرتے ہیں دیوار یار کی خاطر وہ تو بیکے ہوتے رہتے ہیں دیوار کے لمحات میں وہ تو دیدے پھاڑے پھرتے ہیں شہر سے غلے پہلے ہو کر رگے ہوتے رہتے ہیں محب کے محبوب کے چھ چھ عاشق آپس میں مل بیٹھیں تو تو میں میں ہوتی ہے اور دنگے ہوتے رہتے ہیں شوش کو قابو کرنے کو نہ چھوڑیں ایک بھی عامل یہ دیوان خو خالی کروا کر وہ کنگے ہوتے رہتے ہیں دیوار علی جی قصوں کو اب اپنی بھی کچھ بات کہوں اپنی بھی پاگل پن کے اکثر حلقے ہوتے رہتے ہیں (محمد علی چغتائی.....خیر پور نامیوالی)

سے گلے ہیں اسے مجھ پر بھروسہ نہیں اسے سوچ کر ہم نے بھی روکا نہیں اسے شخص بھی چاند ستاروں سے یہ پوچھے کہ کون سی وہ رات جب سوچا نہیں اسے

الفاظ تیر بن کر اتر رہے ہیں دل میں سنتے رہے چپ چاپ ہی ٹوکا نہیں اسے فارسیہ یہ محبت نہیں اصول وفا ہے کہ ہم جان تو دیں گے مگر دھوکا نہیں اسے (فارسیہ تبسم.....ٹھیک موز قصور)

عشق اگر تجھ کو جناب ہو جائے ہجر کا تو بھی نواب ہو جائے روز مر مر کے تو جیسے اے منیر لمحہ لمحہ تیرا عذاب ہو جائے جسے تو چاہے زندگی کی طرح وہ اور آنکھوں کا خواب ہو جائے تو اے ڈھونڈتا رہے ہر دم ختم تیرا بھی شباب ہو جائے اے تو دیکھے ہزار آنکھوں چہرہ مگر اس کا سراب ہو جائے آنکھ میں تیرے ہو جو آنسو عشق میں وہ بھی تیزاب ہو جائے تو بنائے فرشتہ اس کو مگر منیر وہ بھی خراب ہو جائے پھر مقدر تیرا بھی اے میرے ہدم جام و ساغر شراب ہو جائے (منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

عجب لڑکی تھی رہتی تھی بس خیالوں میں وہ ضرب کرتی تھی تقسیم کے سوالوں کو کلاس روم میں پنپل تلاش کرتی تھی وہ بھول جاتی تھی لگا کے اس کو بالوں میں اس کی آنکھوں سے با ظہر تھی ہر اک بات جیسے وہ بند رہتی تھی دل کے ہزار تالوں میں وہ پیار چھوٹوں سے عزت بڑوں کی کرتی تھی نہ میں بچوں میں آسکا نہ عمر والوں میں اب بھی اگر حسینوں کے چہرے نہ پڑھے احسان تو ہم نے کیا سیکھا زندگی کے اتنے سالوں میں



(احسان بحر..... زادے خیالوالہ۔ میانوالی)  
فصیل جسم پر تانی ہے کرب کی چادر  
ہم اہل درد سے پوچھ کہ زندگی کیا ہے  
وہ میرے دل کی ستوں میں طول کی خاطر  
فصیل جسم میں کتنے شکاف کرتا ہے  
وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لئے  
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اٹھالیا مجھے  
ابھی سے میرے روفکر کے ہاتھ تھکنے لگے  
ابھی تو چاک میرے زخم کے سلعے بھی نہیں  
دھک کی یکسانیت سے یہ لگتا ہے  
ایک رات پلٹ کے آئی ہے  
(محمد نواز..... ضلع صوابی)

نہ پوچھ مجھ سے میری داستان  
تمہارے آنسو چھلک پڑیں گے  
یوں نہ چھینو بچوں سے ان کی خواہش  
کہ وہ بچارے بلک پڑیں گے  
ایک تم ہو کہ ہماری طرف دیکھنا گوارہ نہیں کرتے  
مگر یہ جان لو ہم اگر بازار میں نکلے تو چہرے جھل پڑیں گے  
ہمیں پتہ ہے تو کسی اور سے ملتا ہے  
مگر ہر دل سے نکال کر ہم یہ دیکھنے سے جل پڑیں گے  
رضا یہ زمانہ ہے کہ ملنے نہیں دیتا ہمیں  
کیونکہ اگر ہم ملے تو ان کے آنسو نکل پڑیں گے  
(سکندر علی رضا..... فیصل آباد)

اندر سے میں ٹوٹ گیا ہوں  
افیت سے میں چھوٹ گیا ہوں  
تجائی عشق کی ایسی پھیلی  
وقت سے پہلے میں لوٹ گیا ہوں  
اب میں تم سے نہیں بولوں گا  
جاؤ تم سے میں روٹھ گیا ہوں  
دل بدن جگر جل رہا ہے  
عشق میں کھا گہری میں چوٹ گیا ہوں  
سنے پہ بوجھ ہے سانس پھول گئی ہے

دم گھٹنے سے میں پھوٹ گیا ہوں  
تیرے بے رخی سے سہ کر گیا ہوں  
ارمانوں کا گلا میں گھونٹ گیا ہوں  
پیار و محبت میں جنگ جائز ہے  
پیار میں بول پہلا میں جھوٹ گیا ہوں  
(محمد ذاکر..... ہلال آزاد کشمیر)

صحرا کے اس تپتے سفر میں.....  
زخم چور چور اور دل غزدہ ہے.....!  
تپش سورج نے جلادیا ہے انگ انگ.....  
نڈھال ہوں، رنجیدہ بھی.....!  
چلا تھا کوئے بار میں.....!  
بھٹکا کچھ اس طرح کہ.....!  
راستوں نے دھوکہ کچھ یوں دیا.....!  
آنکھوں کی بینائی اور نور قلب چھن چکا.....!  
فلّاح کی تلاش میں رخت سفر باندھا تھا میں نے.....!  
کچھ بچوں کا ساتھ تھا، کچھ اپنے بن سے گئے تھے.....!  
آغاز یورش کی مانند.....!

سفر کے ہر لمحے میں، میرا دل مطمئن رہا.....!  
پھر کچھ یوں بچھڑے کہ ہمیشہ کو چھپ گئے.....!  
قافلہ لٹتا گیا، دل چلتا گیا، زخم بڑھتا گیا.....!  
کچھ زخم اپنوں نے یوں لگائے.....  
شنے سے مٹ نہ پائیں..... اک حصہ یوں کٹا کہ.....!  
آج تک جڑنے میں نہ آیا.....!  
بھوک اور مفلسی کا درد کچھ یوں آن پڑا.....!  
میرے قافلے کا ہر فرد بیکار رہتا.....!  
میں چیخا رہا، گڑگڑاتا رہا.....!  
عصمتیں لیں، چادریں چھینیں.....!  
خون یوں بکھرا..... جیسے پانی ہو.....!  
غیرت کے نام سرکٹ گئے.....!  
آسمان روتا رہا، زمین ہلکتی رہی.....!

(مدثر بخاری..... شہر سلطان)  
☆☆

دل میں اک درد اٹھا ہو جیسے  
لوگ رستے میں ٹھہر جاتے ہیں  
ہر کوئی مجھ سے جدا ہو جیسے  
تم کہاں جاؤ گے، سوچو محسن  
دل بھڑکنے پہ یوں محسوس ہوا  
لوگ تھک ہار کے گھر جاتے ہیں  
تک چوں کی صدا ہو جیسے  
(انتخاب: ساحل دعا بخاری..... بھیرپور)

وعدے پر اعتبار کر کے  
بگاڑی زندگی میں نے  
بچہ کو منزل کا پتہ ہو جیسے  
تمہارے آنے کے انتظار میں  
رنگ بکھرا ہے خیالوں کا میرے  
گزار یوںی زندگی میں نے  
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے  
عشق کے حسین خیالوں میں  
جس کو جی بھر کے بھی دیکھا نہیں  
سنواری زندگی میں نے  
مجھ سے ہر بار ملا ہو جیسے  
تمہارے آنے کی خوشی میں  
کرجیاں دیکھ رہا ہوں رانا  
دل پہ پتھر سا گرا ہو جیسے  
بہت دیر کردی آنے میں  
(قدیر رانا..... راولپنڈی)

نہیں ہے بھروسہ کسی آدمی کا  
زمانے میں کوئی نہیں ہے کسی کا  
محبت میں دیکھ دھوکے ہی دھوکے  
یہاں پیار سچا نہیں ہے کسی کا  
بالے مجھے اندھیری نگر سے توں مولا  
یہاں دیا جلتا نہیں زندگی کا  
(ضمیر احمد ساغر..... میاں چنوں)

جس دنیا سے گزر جاتے ہیں  
ایسا کرتے ہیں، مر جاتے ہیں  
دل جو ٹوٹے تو سر مخفل بھی  
بال بے وجہ بکھر جاتے ہیں  
لب نہ دیکھو میری ہنستی آنکھیں  
ہڑستے دریا تو اتر جاتے ہیں  
دھوپ کا روپ رچانے والے  
شام کو اور نکھر جاتے ہیں  
لب نہ مڑ مڑ کے پکارو ان کو  
میں اکثر سوچتی ہوں اب.....!  
وہ مجھ سے ٹھیک کہتا تھا  
محبت ایک بارش ہے  
تجی یہ جو برستی ہے  
مگر پھر بھی نہیں ہوتی یکساں  
کبھی مجھ پہ بھی برسی تھی  
مگر میرے لئے یہ نہ بن سکی راحت  
یہ راحت کیوں نہیں بنتی  
کبھی میں خود سے پوچھوں تو

یہ دل دیتا دہائی ہے  
بھی کچھ مکاؤں کو بھی بارش آئی ہے؟  
(ساجدہ راجا..... ہندوال سرگودھا)

جلوؤں کی خیرات بھی ہوگی  
پھول کھلیں گے بات بھی ہوگی  
شام ڈھلے گی رات بھی ہوگی  
پادوں کی برسات بھی ہوگی  
نیوں سے جب تین ملیں گے!  
انکھوں کی بارات بھی ہوگی  
جب آؤ گے پاس ہمارے  
تم سے دل کی بات بھی ہوگی  
جو بازی تم کھیل رہے ہو  
اس بازی کو مات بھی ہوگی  
میرے افسانے میں پارو  
شامل اس کی ذات بھی ہوگی  
شب بھر میرے ساتھ رہو گے  
راشد ایسی رات بھی ہوگی  
(راشد ترین..... مظفر گڑھ)

تو نے ایسے دنوں کے تھے سننے بنے  
تو نے اب تک بنائے تھے جو بھی محل  
جن چوں پہ تو نے تھا کیا  
وہی پتے ہوا آج دینے لگے  
تو نے دیکھے تھے جو  
خواب اچھے برے  
تیرے خوابوں کی تعبیر ایسی ہوئی  
میرے امتیاز! تو  
تو تو احمق ہوا  
تو تو پاگل ہوا

اس زمانے میں ڈھونڈتا ہے وفا  
(ایس امتیاز احمد..... کراچی)  
☆☆



# اصل جہنم

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

جنگل میں داخل ہونے والوں کے سامنے اچانک چند دیوہیکل بندر آگئے انہوں نے جدید رائفلیں اٹھا رکھی تھیں ان کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے جیسے انگارے برس رہے تھے اور جب ان بندروں کے منہ سے آواز نکلی تو اچانک.....

ظلم و بربریت کی انتہا پر مبنی جسم و جاں پر لگی طاری کرتی خونچکاں اور حیرت انگیز کہانی



وہ ایک ہولناک رات تھی۔ بار بار گرجنے والے بادل فضا کا دل دہلا رہے تھے، بجلی یوں چمک رہی تھی جیسے قہر بن کر ٹوٹ پڑنا چاہتی ہو۔ بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ پورا گاؤں تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور شکیلہ اپنے شوہر فرحان کا ہاتھ تھامے پاگلوں کی طرح یوں بھاگ رہی تھی جیسے اس کے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں خوفناک بلائیں لگی ہوں۔ وہ اس لئے کوکس رہی تھی جس لئے اس نے شکار کا پروگرام بنایا تھا۔

یہ واقعہ دراصل کچھ یوں تھا کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ایک میگزین میں جنگلات کے بارے میں مضمون چمپا۔ جس میں اس گاؤں میں واقع جنگل کا ذکر بھی موجود تھا۔ یہاں ہرن بکثرت پائے جاتے تھے۔ شکیلہ نے ضد کی کہ وہ بھی اس جگہ جانے گی اور وہ ہرن کا شکار کریں گے۔ اس کا شوہر فرحان جو کہ خود بھی شکاری تھا۔ اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر دوسرے روز ہی شکیلہ اور دو ملازمین رفاقت اور شاہنواز سمیت جنگل کے قریب واقع گاؤں میں پہنچ گیا۔ جنگل گاؤں کے مشرقی حصے میں واقع تھا۔ انہوں نے جنگل کے قریب کچھ فاصلے پر دو خیمے گاڑے، سفر کی تسکین زیادہ تھی اس لئے شکار کا پروگرام کل پر موخر کر دیا گیا۔ شام ہوتے ہی

اندھیرا پھیل گیا، موسم کے تیز بدل گئے۔ اور گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ اسی وقت گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ فرحان نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا نصف درجن گھڑ سوار جن کے ہاتھوں میں جدید طرز کی رائفلیں اور چہرے پر نقاب موجود تھا۔ ”کیا بات ہے آپ لوگ کون ہیں اور اس طرح رائفلیں لے کر ہمارے خیمے کے سامنے آنے کا کیا مطلب ہے؟“ فرحان نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے ایک گھڑسوار سے پوچھا۔ ”میرا نام شیرا ہے۔ اس علاقے پر چوہدری حاکم یار کی حکومت ہے اس کی اجازت کے بغیر یہاں پر اندھ بھی نہیں مار سکتا۔ تم چوہدری حاکم یار سے اجازت لئے بغیر جنگل میں شکار کرنے آ گئے۔ ہمیں چاہئے تھا کہ اس علاقے میں داخل ہوتے ہی چوہدری کی حویلی میں جاتے۔ اس سے یہاں قیام کرنے اور شکار کھیلنے کی اجازت لیتے۔ اب ایسا کرو تم سب شرافت سے ہمارے ساتھ حویلی چلو، چوہدری کے سامنے تمہاری ڈشٹی ہے۔“ گھڑسوار دنگ لے کر چلے گئے۔

اچانک فرحان کا ملازم رفاقت ہاتھوں میں رائل تھاے اپنے خیمے سے باہر نکلا۔ ابھی اس نے



رائفل کا رخ گھڑسواروں کی طرف کیا ہی تھا کہ شیرانے فائر کر دیا۔ رفاقت سینے پر گولی کھا کر چیخے ہوئے زمین پر گر ا اور ساکت ہو گیا۔

”خبردار کوئی غلط حرکت تمہاری بیوی کو بیوہ بنا سکتی ہے۔ جاؤ خیمے سے اپنی بیوی کو لے کر باہر آؤ۔“ شیرا ساپ کی طرف بھینکا۔

اسی وقت شاہنواز پھرتی سے اپنے خیمے سے باہر نکلا اور اپنے ہاتھوں میں تھامی رائفل کا رخ شیرا کی طرف کر کے فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ شیرا کے جوانی فائر نے شاہنواز کو بھی زندگی سے محروم کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی تھی۔ فرقان حیرت و استعجاب کے عالم میں یوں کھڑا تھا گویا اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

”جلدی جاؤ اپنی بیوی کو خیمے سے باہر لے آؤ۔“ شیرا کے دھمکی آمیز لہجے نے فرقان کو سکتہ کی کیفیت سے باہر نکالا۔ فرقان پلٹ کر تیزی سے اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔

شکیلہ خیمے میں خوفزدہ کھڑی تھی۔ اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپا رہا تھا۔ فرقان نے اندر آتے ہی ایک طرف رکھا اپنا شکاری خنجر اٹھایا اور پھیلی طرف سے خیمے کو چھری سے حیرا اور شکیلہ کا ہاتھ پکڑ کر جنگل کی سمت دوڑنے لگا۔

گھڑسواروں کو جلد ہی ان کے فرار کا علم ہو گیا۔ وہ ان کے پیچھے پاگل کتوں کی طرح گھوڑے دوڑاتے ہوئے پیچھے لگ گئے۔

گر جتنی برقی بارش میں وہ گرتے پڑتے گئے جنگل میں داخل ہو گئے۔ اچانک شکیلہ ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ فرقان اسے سنبالنے لگا۔ شکیلہ کو اٹھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس کے بائیں گھٹنے میں شدید چوٹ لگی تھی۔ ”فرقان مجھ سے اب بھاگنا نہیں جائے گا۔“ شکیلہ کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

فرقان نے شکیلہ کے زخم کا جلدی سے معائنہ کیا۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اسی لمحے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ فرقان نے پلٹ کر خوفزدہ

نظروں سے مڑ کر گھڑسوار ڈاکوؤں کی طرف دیکھا۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لئے حیران کر دینے والا تھا۔ شیرا اور اس کے ساتھی گھوڑے روکے ساکت سامنے کھڑے تھے۔

”شیرا اب کیا ہوگا؟ یہ تو جنت کی حدود میں کھڑے ہیں، ہم آگے نہیں جاسکتے، چوہدری نے اس حسینہ کو زندہ لانے کو کہا ہے اسے گولی بھی نہیں مار سکتے۔“

ایک نقاب پوش خوفزدہ لہجے میں شیرا سے کہہ رہا تھا۔ نقاب پوش کے بلند آواز میں کہے گئے جملے ایک طرف فرقان کو ہلکی دے رہے تھے کہ وہ ڈاکو اب ان کے تعاقب میں نہیں آئیں گے۔ دوسری طرف فرقان کو اضطراب میں بھی مبتلا کر رہے تھے کہ جنت کی حدود کا مطلب کیا ہے؟

”گھڑسوار جنت سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟“ ہمت کر کے اس نے شکیلہ کو اپنی ہاتھوں میں اٹھالیا اور گھٹنے جنگل میں مزید آگے بڑھنے لگا۔ ”رک جاؤ آگے ہم سے بھی بڑا خطرہ موجود ہے۔“ شیرا چلا کر بولا مگر فرقان نے اس کی بات پر کان نہ دھرے آگے بڑھتا چلا گیا۔

کچھ دور جاتے ہی اچانک جنگل میں درختوں کی ٹہنیاں چنچنے کی آوازیں آئیں۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدموں کی پراسرار آوازیں ان دونوں کو خوفزدہ کر رہی تھیں۔ ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔

”بخ ٹھنڈی ہوا چلنے کے باوجود انہیں خوف سے پسینہ آنے لگا۔ پانچ منٹ بعد ہی چاروں طرف سے جھاڑیوں سے بن ماس کی طرح قوی پھیل درجن بھر بندرنگل کر انہیں گھیرنے میں لے چکے تھے۔ ان بندروں کی سرخ گھورتی آنکھیں بد صورت چہرے اور بدن سے اٹھتی ہوا ان دونوں کو خوفزدہ کر رہی تھی۔ شکیلہ کے چہرے کا رنگ انہیں دیکھ کر قہقہہ ہو گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان بندروں کی کلائیوں میں عجیب ساخت کی گھڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مزید حیران اور خوفزدہ کر دینے والی بات بندروں کے ہاتھ میں موجود انفلکس

نہیں جن کا رخ ان کی طرف تھا۔ بندر دھیرے دھیرے بات بچپاتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ بندروں کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہونے لگا۔ ڈر اور خوف سے دونوں کی حالت بری ہو رہی تھی۔ بھاگنا بھی ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ بندر انہیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے چکے تھے۔

اچانک ہی انہیں زمین اپنے پاؤں تلے سے ٹھٹھکی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ خوف سے ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسری لہر دوڑ گئی۔ وہ بات ہی حیرت اور خوف میں مبتلا کر دینے والی تھی۔ ان درجن بھر بندروں میں سے سب سے دراز قد بندر کا منہ کھلا اور وہ کمر کھراتی ہوئی انسانی آواز میں بولا۔ ”دائیں بائیں اور پیچھے مڑے بغیر سیدھے چلتے رہو۔ تمہیں حاتم کے حضور پیش ہونا ہے۔“

”کک..... کون..... حاتم..... ہمیں جانے..... پلیر! ہمارے پیچھے چوہدری کے غنڈے لگے تھے..... ہم جان بچانے کے لئے..... غلطی سے ادھر آگے ہیں.....“ فرقان خوف سے ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”بکواس بندر کرو اور سیدھے چلو۔“ بندر اسے رائفل کی نال سے دھکیلتے ہوئے کمر کھراتی ہوئی انسانی آواز میں بولا۔

فرقان خوف کے مارے کپکپاتی ناگوں سے شکیلہ کو ہاتھوں میں اٹھائے بندروں کے گھیرے میں آگے بڑھنے لگا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ خوف کے مارے کی بھی لمحے گھر کر لے ہوش ہو جائے گا، اس کے نرم بدن پر شکیلہ آگے بڑھنے لگے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد سفر کے بعد ان کے سامنے ایک وسیع و عریض عمارت آئی۔ بیرونی گیٹ کھلا ہوا تھا۔ بندر تیزی سے انہیں گھیرے میں لئے عمارت میں داخل ہو گئے۔ دروازے میں جگہ جگہ انسانی جسم کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔

اچانک فرقان کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر شکیلہ کی طرف گرا۔ فرقان نے اٹھتے ہوئے نیچے پڑی چیز کو

دیکھا جس سے اسے ٹھوکر لگی تھی۔ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ گوشت پوست سے محروم کھوپڑی دیکھتے ہی اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ دوبارہ نیچے پڑی شکیلہ پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ شکیلہ اس سے پہلے ہی خوف کی زیادتی سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ دو بندر یہ دیکھ کر آگے بڑھے ایک نے فرقان کو کندھے پر اٹھایا دوسرے نے شکیلہ کو اٹھالیا۔ بندروں کا قافلہ کوریڈور میں چلتا ہوا دائیں سمت کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں بھی انسانی ہڈیاں اور چند انسانی کھوپڑیاں پڑی تھیں۔

کمرے میں بائیں سمت ایک الماری رکھی تھی۔ ایک بندر نے الماری کھولی اور ہاتھ ڈال کر کوئی سوکھا آن کیا۔ کمرے کی دیوار تقریباً چار فٹ کے قریب سرک گئی۔ اب نیچے کی طرف سیڑھیاں جاری تھیں اندر داخل ہو کر دراز قد بندر نے چھت میں کوئی چیز تلاش کی اور دروازہ بند ہو گیا۔ دیوار اپنی جگہ پر آچکی تھی۔ چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ روشنی پھیل جانے کی وجہ سے ہر چیز واضح طور پر نظر آرہی تھی، بندر انہیں اٹھائے ہوئے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگے، سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ ایک وسیع ہال میں داخل ہو گئے، وہاں ہر طرح کا فرنیچر اور دوسرا ساز و سامان موجود تھا۔ گویا یہاں رہائش کا مکمل انتظام تھا۔

ہال میں جگہ جگہ انسانی ڈھانچے لٹک رہے تھے۔ دائیں سمت ایک کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ مقفل تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک بٹن نصب تھا۔ ایک بندر نے بٹن دبایا اور کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ جس میں نصف درجن کے قریب لوہے کے بیڈ پڑے تھے۔ جن کے ساتھ زنجیریں منسلک تھیں۔

کمرے کے وسط میں ایک ادیبہ عمر کا درشتی جسم کا مالک ڈاکڑوں والا گاؤن پہنے کھڑا تھا۔ گہری سانولی رنگت اور چہرے کے بد نما داغ اس کے چہرے کو بھیا یک بنا رہے تھے۔ ایک طرف بڑی سی ٹرائل نما میز پر سر جیکل آلات رکھے تھے۔ ”انہیں بیڈ سے باندھ دو۔“



بد صورت شخص نے بندروں کو حکم دیا۔

حیرت انگیز طور پر بندھروں نے اس کی بات سمجھ لی، چند ہی لمحوں میں فرقان اور شکیلہ بیڈ سے بندھے پڑے تھے۔ وہ شخص سر جیکل میز کی طرف بڑھا۔ میز کے قریب ہی ایک ٹرائی پر ایک کمپیوٹر رکھا جس کی روشن اسکرین پر عمارت کے باہر کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے میز سے ایک سرخ اٹھائی اور باری باری ان دونوں کو انکشن لگادیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ دونوں ہوش میں آ کر خوف زدہ نظروں سے بد صورت شخص اور بندروں کے ٹولے کو دیکھ رہے تھے۔

”تم کون ہو اور ہمیں اس طرح یہاں کیوں لایا گیا ہے اور یہ کس قسم کے بندر ہیں جو انسانوں کی طرح بولتے ہیں کہیں یہ بھوت تو نہیں؟“ فرقان نے ہوش میں آتے ہی اس شخص سے سوالات کئے۔

”میرا نام ڈاکٹر حاتم ہے، اس وقت تم جہاں موجود ہو، یہ ایک جدید ترین تجربہ گاہ ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ میں کس قسم کے تجربے کرتا ہوں؟ تو سنو! مجھے اپنے علاوہ ہر انسان سے نفرت ہے۔ زمین پر ہر قسم کے فساد کے ذمہ دار یہ انسان ہیں۔ میرا مشن ہے جس حد تک ہو سکے انسانوں کا خاتمہ کر کے انہیں بندر بنادوں۔ میں انسان کے دماغ بندر کی کھوپڑی میں منتقل کر دیتا ہوں۔ ویسے بھی انسان اور بندر کے جسم کی بناوٹ تقریباً ایک جیسی ہی ہے۔ دماغ کی منتقلی کے بعد مشینی طریقے سے بندر کی آواز میں تبدیلی کر دیتا ہوں پھر بندر کے ساؤنڈ بکس میں انسانی آواز ریکارڈ کر دیتا ہوں۔ اس کام میں، میں نے اس قدر مہارت حاصل کی ہے۔ جو ناقابل یقین ہے۔ یہ درجن بھر بندر جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ میری مہارت اور قابلیت کا ثبوت ہے۔ دماغ کی منتقلی کے آپریشن کے بعد نہ صرف انسانوں کی طرح بول سکتے ہیں بلکہ ذہن انسانوں کی طرح سوچتے بھی ہیں۔ یہ میرے حکم پر بلا جھجک عمل کرتے ہیں۔ یہ میری پوجا کرتے ہیں۔ اب تک میں میں کے قریب بندروں کو اپنے کامیاب تجربات سے انسان بنا چکا ہوں

اس وسیع عمارت کے نیچے بہت بڑا میٹ ورک ہے اتنا بڑا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

ایک حصے میں زیر زمین جنت ہے جو میری اپنی تخلیق ہے۔ اس میں درجنوں کی تعداد میں دنیا بھر سے لائی گئی حسین ترین لڑکیاں ہیں۔ خوب صورت تالاب ہیں۔ جن میں خود کار فورے نصب ہیں۔ میرا جب دل چاہتا ہے حسین ترین لڑکیوں کی رفاقت میں وقت گزارتا ہوں اور قانون کو مطلوب انتہائی خطرناک ترین مجرم جو قانون سے بھاگتے پھرتے تھے۔ میں نے انہیں یہاں پناہ دی۔ ان کا برین واش کیا۔ وہ بھی اب یہیں رہتے ہیں اور میری پوجا کرتے ہیں۔ وہ اپنا مذہب ترک کر چکے ہیں۔

فی الحال اس جنگل میں میری حکومت ہے، چوہدری حاکم یار خان سے میرا معاہدہ ہے کہ وہ یا اس کا کوئی بھی ہر کارہ ایک حد سے آگے جنگل میں نہیں آئے گا جو اس حد سے آگے آ یا اس کا انجام برا ہوتا ہے۔ ہاں جو میری فرمانبرداری کرتا ہے اس کے لئے میرے بہت سے انعامات ہیں۔“ وہ بولتا چلا گیا۔

”لیکن اس جنگل میں تمہارے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں؟“ فرقان اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”انسانی جسم بہت بڑا خزانہ ہے۔ دماغ کی منتقلی کے بعد بھی انسانی جسم میرے لئے ناکارہ نہیں ہوتا۔

دل، گردے، آنکھیں محفوظ کر کے منہ مانی قیمت پر فروخت کر دیے جاتے ہیں۔ اس کام میں شہر کے بہترین اسپتال کے تین ماہر سرجن میرا ساتھ دیتے ہیں۔ جن کا قیام اکثر جنت میں ہی ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر حاتم ہذیبانی بھئی ہنسنا۔ ”نمبر دو تم لوگ اب جاؤ اور جاتے ہوئے ان سرجنوں سے کہہ جانا کہ آدھے گھنٹے بعد آ جائیں۔ جب تک میں آپریشن کی تیاری کرتا ہوں۔“ ڈاکٹر حاتم نے ایک بندر کو ہدایت دیں۔ بندر فرقان کو عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے تجربہ گاہ سے باہر نکل

”دیکھا! جاتے ہوئے بندر کتنی خوشی سے تمہیں بکھرتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ان بندروں کو انسانی گوشت کا عادی بنادیا ہے، موت کے بعد تمہارا جسم ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ تمہارے گوشت سے دعوت اڑائیں گے۔ جان بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ میرے غلاموں میں شامل ہو جاؤ اور جنت کے مزے لوٹو۔ اب بتاؤ مجھے سجدہ کرو گے یا؟“ ڈاکٹر حاتم نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔

”مسلمان صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ تمہارے جیسے کتنے ہی شیطانوں نے مسلمانوں کو بہانے کی کوشش کی مگر تباہ و برباد ہو گئے۔ تمہارا انجام بھی بھیا تک ہوگا۔“ فرقان نڈر لہجے میں بولا۔

شدت جذبات سے اس کے سینے سے ہنگاریاں پھوٹنے لگیں ڈاکٹر نے فرقان کو انکشن لگادیا، فرقان کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ شکیلہ خوفزدہ نظروں سے ڈاکٹر حاتم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے ایک عجیب ساخت کی مشین گھسیٹ کر فرقان کے بیڈ کے قریب کی اور مشین سے منسلک تاریں فرقان کے جسم کے مختلف حصوں سے منسلک کر دیں اور سرجری کے آلات لے کر فرقان کے جسم کے ساتھ کارروائی شروع کر دی۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور دو گھنٹے ادھیڑ عمر کے افراد تجربہ گاہ میں داخل ہوئے۔ ان دونوں نے بھی ڈاکٹر واپس لے گاؤں پہن رکھے تھے۔ اندر آتے ہی ان دونوں نے ڈاکٹر حاتم کو فرشی سجدہ کیا۔ ”ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر جشد سب انتظامات مکمل ہیں جلدی سے میرا ہاتھ بٹاؤ پھر جنگل سے کسی صحت مند بندر کو بھی لاتا ہے تاکہ اس کا دماغ اس کی کھوپڑی میں منتقل کیا جاسکے۔“ ڈاکٹر حاتم نے حکم دیا۔

وہ تینوں فرقان کے جسم کی چیر پھاڑ کر رہے تھے شکیلہ خوفزدہ نظروں سے کارروائی دیکھتے ہوئے چیخ و پکار کر رہی تھی۔ ڈر اور خوف سے اس کی حالت بری ہو رہی

تھی۔ تقریباً تین گھنٹوں بعد فارغ ہو کر وہ کا پتی چیختی شکیلہ کی طرف بڑھا۔ اس نے شکیلہ کے جسم کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔

”یہ تمہارے گھٹنے میں چوٹ کیسے لگی؟“ ڈاکٹر کے لہجے میں تاسف تھا۔ ”ہم چوہدری کے ہر کاروں سے جان بچا کر بھاگ رہے تھے کہ میں گر کر زخمی ہو گئی۔“ شکیلہ روتے ہوئے بولی۔ خوف سے اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ رہا تھا۔

”افسوس تم زخمی ہو ورنہ جنت میں رہنے والی لڑکیوں میں شامل ہوتیں۔ وہاں رہنے والی لڑکیاں جسبانی خامی سے مبرا ہیں اب میں تمہیں تحفے میں اپنے بھائی حاکم یار کے حوالے کر دوں گا۔ میں اسے فون کرتا ہوں کہ جنگل کے اختتامی حصے میں میرے بندے تمہیں اس کے حوالے کر دیں گے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور ایک انکشن اس کے بازو میں لگادیا تو شکیلہ کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

شکیلہ کو ہوش آیا تو خود کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ اس نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ تنہا خانے میں داخل ہونے کا واحد راستہ ایک دروازہ تھا جو اس وقت مقفل تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک ہٹا کٹا شخص عجیب سی ہیبت میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں دو راکفل بردار شخص تھے۔ جو شکل سے ڈاکٹر کو لگ رہے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں ان کے چہرے کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ ہٹا کٹا شخص شکیلہ کو حریص نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”تم اور تمہارا شوہر کیا سمجھتے تھے کہ میرے جیسے ہوئے لوگوں سے بچ جاؤ گے۔ میرا بڑا بھائی ڈاکٹر حاتم مجھ سے بھی بڑا درندہ ہے۔ تم چوہدری حاکم کا شکار ہو۔“ چوہدری نے تہقہہ لگایا اور شیطانی ارادے سے شکیلہ کی طرف بڑھا۔

شکیلہ نے مزاحمت کی کوشش کی تو چوہدری نے اس کے چہرے پر پھینٹ مارنے شروع کر دیے۔ شکیلہ چیختی چلانے لگی تو چوہدری نے چیختی چلاتی شکیلہ کے کپڑے پھاڑ کر اسے ہر بند کر دیا۔ شکیلہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی



گمراس کی ایک نہ چلی۔ کچھ دیر بعد وہ شرمناک حالت میں حسرت و یاس کی تصویر بنی ایک طرف بکھری پڑی سبک رہی تھی۔

”اب تم لوگوں کی باری ہے۔ اس کے بعد اس کی لاش جنگل میں پھینکوا دینا۔“ اپنے کارندوں سے یہ کہتا ہوا چوہدری تہہ خانے سے باہر چلا گیا اور شیطانی کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔ وہ دونوں شیطان شکلیہ کو اپنے جسم تلے روندنے لگے۔ شکلیہ کی چیخوں سے تہہ خانہ گونگ اٹھا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری احسان ایک شریف اور نیک سیرت انسان تھا۔ اس کے دونوں بیٹے حاکم اور حاتم اس کے برعکس ظالم بے رحم اور شیطان صفت تھے۔ چھوٹا بیٹا حاکم مڈل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کا پسندیدہ مشغلہ گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھانا، گاؤں کی بھولی بھال لڑکیوں کو بے عزت کرنا تھا جبکہ بڑا بیٹا حاتم اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا، وہ بہت ذہین تھا۔ میٹرک سائنس میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ چوہدری احسان نے انٹر کے بعد اس کے اصرار پر تعلیم کے لئے بیرون ملک بھجوا دیا۔ بیرون ملک بھی اس کی قابلیت اور ذہانت کی دھوم مچ گئی۔ پھر وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اسے سائنس اور ٹیکنالوجی سے عشق تھا۔ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ دولت کی کوئی کمی نہ تھی، وہ صرف پڑھتا رہا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا برین سرجن بھی تھا اور ہیضہ عمری تک ملک سے باہر رہا۔ خوب دولت کمائی۔ ادھر اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔

وہ ادھیڑ عمری میں داخل ہوا تو ایک نوجوان لڑکی روپی پر عاشق ہو گیا۔ روپی کا تعلق ایک پاکستانی گھرانے سے تھا جو گزشتہ کئی سالوں سے لندن میں مقیم تھا۔ روپی سے ڈاکٹر حاتم نے اظہار محبت کیا اور منہ کی کھائی۔ صاف گوروپی نے اسے آئینہ دکھادیا کہ چالیس سال کی عمر میں اسے اٹھارہ سالہ لڑکی سے اظہار محبت کرتے

ہوئے شرم آنی چاہئے۔ کچھ ڈاکٹر کی بد صورتی کا بھی قصور تھا۔ روپی کی باتیں اس نے دل پر لے لیں۔

اس دوران اس کی ملاقات ایک عالم دین سے ہو گئی۔ انہوں نے اسے نیکی کے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ نیک اور پرہیزگار لوگوں کے لئے جنت میں اعلیٰ مقام ہے۔ اچھا مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان برائی کے راستے سے دور رہے۔ انگریزوں کے نقش قدم پر چلنے والا ڈاکٹر حاتم جو شراب پانی کی طرح پیتا تھا۔ فقہیہ لگا کر مذہبی ہستی نہ تھی۔ ”میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اپنی جنت خود بنا سکتا ہوں۔“ اتنا قابل سائنسدان ہونے کے باوجود وہ سکی اور خطی قسم کا انسان تھا۔ دل میں نہ جانے کیا مانی کہ ایک روز اپنا سب کچھ سمیٹ کر اپنے وطن کے لئے چل پڑا۔

والدین کے انتقال کے بعد تمام دولت جائیداد پر چھوٹے بھائی حاکم کا قبضہ تھا جو سیاست میں حصہ لے کر اپنے حلقہ سے صوبائی الیکشن جیت کر وزیر بن چکا تھا۔

حاتم نے چھوٹے بھائی حاکم سے اپنے حصے کی جائیداد کی رقم لی۔ حاتم کی اپنی دولت بھی بے شمار تھی جو اس نے بیرون ملک کمائی تھی۔

ڈاکٹر حاتم نے درجنوں کی تعداد میں شہر سے تعمیرات کے ماہرین بلوائے، شہر سے ہی ایک قابل انجینئر آیا۔ جنگل میں وسیع رقبے میں کافی گہری کھدائی کروائی گئی۔ اعلیٰ درجے کا سرایا منگوایا۔ وسیع عریض عمارت تعمیر کی گئی۔ خوب صورت تالاب بنوائے گئے۔ ان تالابوں میں خوب صورت فوارے نصب کروائے۔ اس عمارت کے اوپر مٹی ڈلو کر اسے خفیہ بنا دیا گیا۔ اسی عمارت کے اوپر ایک دوسری عمارت تعمیر کروائی گئی۔ زیر زمین عمارت کو روشن رکھنے کے لئے ہیری جزیرہ منگوائے گئے۔ اس پروجیکٹ میں دولت پانی کی طرح بہائی گئی اور پھر عمارت کی تعمیر میں حصہ لینے والے افراد کو ڈاکٹر حاتم نے خفیہ طریقے سے قتل کروا دیا۔

ڈاکٹر حاتم کا دل ایک لڑکی نے توڑا تھا۔ لہذا اس نے عہد کیا کہ اپنے لئے بنائی گئی خود ساختہ جنت میں ملک بھر سے خوب صورت ترین لڑکیاں منگوائے گا۔ انہی دنوں ایک لڑکی عاشی جو کہ بہت خوب صورت اداکارہ تھی۔ جب وہ سینما اسکرین پر دکھائی دیتی تو فلم بینوں کے دلوں پر بجلی گر جاتی اس کے کونیز حسین چہرے کی طرف انہی نظریں واپس پلٹنا بھول جاتیں۔ فلم بین جب اس کا نیم عریاں قصہ دیکھتے تو دیوانے ہو جاتے۔ فلمی افق کے اس درخشاں ستارے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لوگ بے چین ہو جاتے۔ گھر سے ٹونک کے لئے نکلے وقت وہ رنگین شیشوں والی گاڑی استعمال کرتی ایسا وہ سیکورٹی کی وجہ سے کرتی تھی سڑک پر ایک کروڑ اس کی گاڑی پر ٹوٹ پڑتے تھے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے، اپنے پرستاروں کی اس قدر پابند کے باوجود وہ مغرور ہرگز نہ تھی۔

سر محفل اپنے درجنوں پرستاروں سے ملتی آٹو گراف دیتی پرستاروں کی فرمائش پر ان کے ساتھ تصویریں تک کھینچواتی تھی۔ اس روز بھی ایک اعلیٰ درجے کی پارٹی میں عاشی شریک تھی۔ اس نے کافی حد تک تنگ اور چھوٹا لباس پہن کر نمایاں نظر آنے کی کوشش کی تھی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی تھی۔ اس پر پڑنے والی مردوں کی نظروں میں حسرت اور غور توں کی نظروں میں حد تھا۔ وہ تقریب تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اب تقریب اختتام ہونے والی تھی اس وقت وہ ایک گوشے میں تنہا بیٹھی تھی کہ چونک پڑی۔ ایک آدمی نے قد و قامت کا نوجوان اس کے قریب آ بیٹھا۔ ”میرا نام فرہادی ہے آپ کے لئے ایک بہترین آفر ہے، ہمارے ملک کی ایک نامور شخصیت فلم بنانا چاہتی ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ آپ ان کی فلم میں مرکزی کردار ادا کریں۔“

”دیکھئے اس وقت میرے پاس کافی فلمیں ہیں اب فرصت ملی تو غور کروں گی۔“ عاشی نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”مس عاشی آپ ایک فلم کا معاوضہ پچیس لاکھ لیتی ہیں اس فلم میں مرکزی کردار ادا کرنے کی ہامی بھرتے ہی آپ کو ایک کروڑ روپے دیئے جائیں گے۔ یہ میرا کارڈ ہے جب دل چاہے رابطہ کر لیتا۔“ فرہاد نے اپنا کارڈ اسے دیا۔

دوسرے روز عاشی نے بے اختیار فرہادی کو فون کیا۔ ایک کروڑ کی خلیفہ رقم کی آفر نے اس کے ہوش و ہواس اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔

فرہادی کا بنگلہ شہر کے ایک پوش علاقے میں تھا۔ فرہادی نے اپنے بنگلے میں اس کی خوب آؤ بھگت کی اور ایک کروڑ روپے کا چیک اسے پیش کیا۔ اس دوران ایک ملازم کافی لے آیا۔ کافی پیتے ہی عاشی کھونٹھی۔ اس کے بعد عاشی کو کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ جنگل میں واقع ڈاکٹر حاتم کی خود ساختہ جنت میں پہنچادی گئی۔ کچھ روز اخبارات میں اس کے اغوا کے چرچے ہوتے رہے پھر دنیا اسے بھولی چلی گئی۔ اسی طرح مختلف طریقوں سے ملک بھر سے درجنوں لڑکیاں اغوا کر کے وہاں پہنچادی گئیں۔ سنگین مقدمات میں ملوث افراد جو قانون سے چھپتے پھرتے تھے انہیں لالچ دے کر جنگل میں ڈاکٹر حاتم کی تجربہ گاہ میں بھجوا دیا گیا۔ جہاں ڈاکٹر حاتم نے برین واش کر کے اپنا غلام بنالیا۔

☆.....☆.....☆

اسلم، جاوید اور حیدر اس وقت ایک جیپ میں موجود تھے، جیپ اسلم چلا رہا تھا۔ وہ تینوں آپس میں کزن ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے دوست بھی تھے۔ ان کا تعلق ایک بڑے سیاسی گھرانے سے تھا۔ اس وقت وہ شکار کی غرض سے اس جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ سیدھے چلتے چلتے اسلم نے جیپ کو بائیں ست موڑا۔ آگے گھٹنا جنگل تھا۔ جیپ جیسے ہی گھٹنے جنگل میں داخل ہوئی۔ اسے جیپ کو چلانا دشوار ہونے لگا۔ تو اس نے جیپ روک دی۔ ”ایسا کرتے ہیں جیپ یہیں روک کر پیدل چلتے ہیں۔“ اسلم نے کہا اور رانگل ہاتھ میں تمام کر جیپ سے اتر گیا۔ اس کے دوستوں نے بھی اس کی



تقلید کی۔

اب وہ تینوں ہاتھوں میں رانقلیں تھامے چوکنے انداز سے آگے بڑھ رہے تھے ان تینوں کا تعلق بڑے گھرانوں سے تھا، اس کے باوجود وہ اچھے کردار اور دوسروں کے کام آنے والے انسان تھے۔ وہ چلتے ہوئے گھنے جنگل میں گھستے چلے گئے، ابھی انہوں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ انجانی سمت سے کوئی شے ان کے جیسوں میں پیوست ہوگئی انہوں نے اگر کچھ محسوس کیا تو صرف جسم پر سوئی کی نوک جیسی جھین پھروہ تینوں ہوش سے بیگانے ہو گئے۔

انہیں ہوش آیا تو انہوں نے خود کو لوہے کے بیڈوں پر زنجیروں سے بندھا پایا، اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے، ان کے بدن زنجیروں سے اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ ان کا پلٹنا بھی مشکل تھا۔ اس ہال نما کمرے میں عجیب و غریب قسم کی مشینیں موجود تھیں۔

قریب ہی ڈاکٹروں والا گاؤں پہنچے ڈاکٹر حاتم کھڑا تھا۔ ڈاکٹر حاتم کے قریب دو، دراز قد بندر کھڑے سرخ سرخ آنکھوں سے ان تینوں کو دیکھ رہے تھے ان آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی، بندر انہیں دیکھتے ہوئے بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ ”یہ سب کیا ہے تم نے ہمیں کیوں اغوا کیا ہے؟“ اسلم نے پوچھا۔

”میں ہوں ڈاکٹر حاتم، جنت کا خالق جہاں ہر قسم کا عیش و آرام، درجنوں کی تعداد میں حسین لڑکیاں ہیں اگر تم مجھ کو خدا مان کر سجدہ کرو تو اس جنت میں رہو گے ورنہ تم بھی دوسروں کی طرح میرے تجربے کا شکار ہو جاؤ گے۔ جو بہت ہی خوفناک ہے۔ میں انسان کا دماغ بندر کی کھوپڑی میں منتقل کر دیتا ہوں۔ ویسے بھی انسان اور بندر کے جسم کی بناوٹ تقریباً ایک ہے۔ اس کے بعد مشینی طریقے سے بندر کی آواز میں تبدیلی کر دیتا ہوں پھر بندر کے ساؤنڈ بکس میں انسانی آواز ریکارڈ کرتا ہوں۔ اس کے بعد انسان کا دل، آنکھیں، گردے نکال کر محفوظ کر لئے جاتے ہیں، بھاپنا چکا جانے

والے جسم کو یہ میرے آدم خور بندر کھا جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف بول سکتے ہیں بلکہ ہر قسم کا اسلحہ بھی مہارت سے چلا سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر حاتم کی باتیں سن کر ان تینوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھتے ہوئے پاگلوں کی طرح تجھہ لگایا اور کیپوڑ کا ایک ٹکڑا دبا کر مائیک میں بولا۔ ”مہر تھری اندر آؤ۔“ خود کار دروازہ کھلا اور ایک بندر اندر داخل ہوا۔

حیرت انگیز طور پر بندر نے اندر آتی ہی ڈاکٹر حاتم کو سجدہ کیا اور کھر کھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرے لئے کیا حکم ہے؟“

”ڈاکٹر کا مرمان اور ڈاکٹر جشید کو بلاؤ۔“ ڈاکٹر حاتم نے اسے حکم دیا۔ بندر سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ ”اب تم تینوں مجھے سجدہ کرو گے یا نہیں۔“ ڈاکٹر حاتم سرد لگا ہوں سے انہیں نکلنے لگا۔

”ہم تمہاری شجہہ بازیوں سے ڈرنے والے نہیں۔ تم چاہو تو ہمیں جان سے مار دو مگر ہم اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔“ اسلم اور اس کے ساتھی ایک زبان ہو کر بولے۔

اسی وقت ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر جشید اندر داخل ہوئے ڈاکٹر حاتم نے حیدر کو انکشن لگا دیا۔ حیدر کی آنکھیں بند ہونے لگیں ان تینوں جلاصفت ڈاکٹروں نے حیدر کے جسم کو تختہ مشق بنالیا۔ تھوڑی دیر بعد جاوید اور اسلم کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔ ڈاکٹر حاتم حیدر کی کھوپڑی کا اوپری حصہ الگ کر رہا تھا۔ تینوں ڈاکٹر قصائیوں کی طرح حیدر کے جسم پر نشتر چلا رہے تھے۔ اسلم اور جاوید خوف اور دہشت سے چلانے لگے انہیں اپنی اپنی بھیاک موت صاف نظر آرہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یاسر اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھی الیش ٹرے میں سگریٹ کے پیچے ہوئے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ یاسر نے زندگی میں کبھی سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ گزشتہ روز سے



اس کی ذہنی حالت نہایت اتر چھی اس کے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ یاسر کا تعلق آری سے تھا۔ وہ فوج کا دلیر کمانڈر تھا۔ ایک روز اس کے دل میں نہ جانے کیا سہمی کہ اس نے فکمی دوستی کے ایک ویلکی میگزین میں اپنا تعارف اور فون نمبر شائع کروادیا۔ تعارف شائع ہونے کے کچھ روز بعد اسے ایک لڑکی نے کال کی اور اپنا نام سمیرا بتاتے ہوئے دوستی کی پیشکش کی۔ یاسر لڑکی کی خوب صورت آواز پر مر مٹا۔ دونوں گفتگوں فون پر باتیں کرتے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان ملاقاتوں میں دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں ان کی اس اواسٹوری کی زندگی بہت مختصر تھی۔

سمیرا کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔ اس کے والد محسن صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑی بہن خوشی ایک حساس ادارے کی افسر تھی اور سمیرا یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ سمیرا نے ملنے ملانے کا سلسلہ اچانک منقطع کر دیا۔ اس کا نمبر بھی آف رہنے لگا۔ یاسر دن میں کئی بار اس کے موبائل نمبر پر ٹرائی کرتا۔ مگر ہر بار اس کی سماعت سے آواز نہ نکلتی۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے برائے مہربانی کچھ دیر بعد کال کیجئے۔“ مگر اس کے باوجود وہ روزانہ اس کے موبائل نمبر پر دن میں سیکڑوں بار ٹرائی کرتا۔ بالآخر ایک روز اسے سمیرا کا موبائل نمبر آن ملا۔ پہلے تو اس نے یاسر کی کال ریسیو ہی نہ کی بالآخر بڑی دیر بعد اس نے کال اٹینڈ کی۔ ”کیا بات ہے سمیرا تم اچانک ہی غائب ہو گئیں تمہارا نمبر بھی آف تھا۔ اب جبکہ تمہارا نمبر آن ملا ہے تو کال ریسیو نہیں کر رہیں۔ کیا تم مجھے بھولنے کی کوشش کر رہی ہو؟“ یاسر نان اسٹاپ بولنا چلا گیا۔

”سوری یاسر! تم مجھے بھول جاؤ۔ میرے گھر والوں نے میری شادی کر دی ہے اب میں کسی اور کی امانت ہوں، آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ سمیرا کے الفاظ یاسر کے دل میں خنجر کی طرح اتر گئے۔

”سمیرا میں نے تو دوستی کے پہلے روز ہی کہہ دیا

تھا کیوں بناتی ہو ریت کے تاج محل، سب ٹوٹ کے کچھ جائیں گے۔ آج کہتی ہو تم میرے ہو، کل میرا نام تک بھول جاؤ گی۔

اور تم نے مجھے جوابی Sms کیا تھا۔ Hills Can fly, Rivers can dry, you can forget me, but never can. شدت جذبات سے یاسر کی آواز بھرانے لگی۔

”یاسر اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں اب میں سمیرا حماد ہوں۔“ سمیرا نے بے رحمی سے رابطہ منقطع کر دیا۔ یاسر کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ گھر والوں کے لاکھ پوچھنے پر وہ کچھ بتانے کو تیار نہ تھا۔ دراصل اس کے اور سمیرا کے گھر والے دونوں کی محبت سے لاعلم تھے۔ سمیرا کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے وہ آکٹا کریڈ پر لپٹ گیا۔ اس کے دماغ میں پھر ماضی کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں، زندگی کے چند خوشگوار لمحوں کی پرچھائیاں، اب اس کی زندگی ایک اذیت ناک موز پر آ چکی تھی، وہ محسوس کر رہا تھا کہ زندگی بھران پرچھائیاں سے چھپنا نہیں چھڑا سکے گا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اس کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اچانک اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازے کی سمت دیکھا۔ اس کی والدہ اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ”لیئے ہو؟“ انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“ والدہ نے تھرمامیٹر سے اس کا نمبر پکڑ لیا۔ ”ایک سو تین بخار ہے اور تم کہہ رہے ہو معمولی بخار ہے چلو ڈاکٹر کے پاس۔“

”نہیں امی! کوئی ٹیبلٹ دے دیں، میں ٹیبلٹ کھا کر سوجاؤں گا۔“ والدہ نے بخار کی دو ٹیبلٹ اسے کھلائیں۔ ”میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”نہیں امی، میں اب سوؤں گا مجھے نیند آرہی ہے۔“ یاسر نے بھانہ کیا اور اس کی امی اثبات میں سر

ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ والدہ کے جانے کے بعد اس کے ذہن پر خیالات کی یلغار ہو گئی۔ سوچتے سوچتے وہ خبر ہو گیا۔

اچانک کسی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے آنکھیں کھول کر آواز کی سمت دیکھا آواز کھڑکی کی طرف سے آرہی تھی۔ کھڑکی کے باہر کسی کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ یاسر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اٹھ کر بلب روشن کیا۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لئے حیرت انگیز تھا۔ کھڑکی میں سمیرا کھڑی تھی وہ بے تاب سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔

اچانک سمیرا غائب ہو گئی۔ یاسر نے اپنی آنکھوں کو مسلا اسی دوران اس کی انگلیاں اپنی پیشانی سے مس ہوئیں، اس کی پیشانی آگ کی طرح جل رہی تھی، اسے بہت تیز بخار تھا، وہ چلا کر گرا اور ہوش و حواس سے عاری ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری حاکم بیڈ پر گاؤں تکیہ سے ٹیک لگائے شراب پی رہا تھا اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی تقریباً نیم عریاں حالت میں بیٹھی سسک رہی تھی۔ سولہ سال انشیں ایک غریب کسان کی بیٹی تھی جسے چوہدری کے کارندے زبردستی اٹھا لائے تھے۔ اس کے والدین اور بھائی نے مزاحمت کی تو چوہدری کے حکم پر اس کے کارندوں نے ان تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور انشیں کو اٹھا کر جوہلی لے آئے جہاں چوہدری نے اس کی عزت لوٹی، انشیں اپنی لٹی ہوئی آبرو کا ماتم کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب چوہدری اسے اپنے کارندوں کے حوالے کر دے گا۔

گاؤں کی کئی لڑکیوں کی چوہدری اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں بربادی کی داستانیں اس نے سن رکھی تھیں۔ اسے اپنا ہولناک انجام صاف نظر آرہا تھا۔ اسی وقت چوہدری کا موبائل فون بجا۔ دوسری طرف گاؤں کے تھانے کا اے ایس آئی شاگرد لکھا تھا۔

”چوہدری صاحب غضب ہو گیا۔ گزشتہ دو روز

پہلے تین نوجوان شکار کے لئے جنگل گئے اور لاپتہ ہو گئے۔ آج صبح ایک لکڑ ہارا لکڑیاں کاٹنے جنگل گیا، اسے تین لاشیں دکھائی دیں، اس کا کہنا ہے کہ لاشیں ناقابل شناخت اور زیادہ گوشت سے محروم ہیں۔ اگر یہ لاشیں ان نوجوانوں کی تھیں تو غضب ہو جائے گا۔ ان کا تعلق ایک بڑے سیاسی گھرانے سے ہے۔ میڈیا والوں نے ویسے بھی ان کی کشدگی پر ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، اوپر سے بھی نکلے پر کافی دباؤ ڈالا گیا ہے، ہم آپ کے حکم پر گئے جنگل کے اس حصے میں نہیں جاتے جہاں جانے سے آپ نے منع کر رکھا ہے۔ مگر آئی جی صاحب کے حکم پر ایس پی شہریار صاحب تفتیش کے لئے یہاں آرہے ہیں وہ با اصول اور ایماندار افسر ہیں اس کے علاوہ ان کا تعلق بارسوخ خاندان سے ہے وہ آئی جی صاحب کے داماد بھی ہیں اگر وہ تفتیش کرتے ہوئے گئے جنگل میں مخصوص مقام تک چلے گئے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ آپ کے بھائی حاکم صاحب کا ٹھکانہ ان کی نظروں میں آجائے۔“ شاکر اللہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

”گھبراؤ مت میرا بھائی کوئی کبوتر نہیں جو تیرا ایس پی اسے پکڑے گا۔ وہ چوہدری حاکم کا بھائی ہے، اس وقت تو کہاں ہے۔“ چوہدری نے پوچھا۔

”میں سرچ پارٹی کے ہمراہ جنگل جا رہا ہوں۔“ شاکر اللہ بولا۔

”ٹھیک ہے تم جنگل پہنچو میں بھی آتا ہوں، ہو سکے تو لاشیں غائب کرادو۔“ چوہدری نے کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

چوہدری کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات نمایاں نظر آرہے تھے۔ گاؤں کی پولیس تو اس کی زرخیز تھی اگر ایس پی شہریار تفتیش کے لئے گاؤں آجاتا تو گریڈ ہو جاتی گاؤں کے لوگ اگرچہ اس کے ڈر سے خاموش تھے لیکن اگر کسی نے زبان کھول دی تو اس کے سیاسی کردار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چوہدری نے اپنے دست راست شیر اور دیگر چار کارندوں کو بلا کر صورتحال



سے آگاہ کر کے گاڑی تیار رکھنے کا حکم دیا۔

چند منٹ بعد ہی ان کی جیب تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ اے ایس آئی شاکر سمیت پانچ پولیس اہلکار جائے وقوعہ پر موجود تھے۔ میڈیا کے چند افراد بھی وہاں موجود تھے۔ چوہدری تیزی سے شاکر اللہ کی طرف بڑھا اور اسے لے کر میڈیا والوں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ ”شاکر اللہ تمہیں چاہئے تھا کہ میڈیا والوں کے پہنچنے سے پہلے لاشیں غائب کرا دیتے۔“ چوہدری نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”چوہدری صاحب آج کل میڈیا بہت فاسٹ جا رہا ہے ہمارے پہنچنے سے پہلے میڈیا والے جائے وقوعہ پر پہنچ چکے تھے۔“ شاکر اللہ نے اپنی صفائی پیش کی۔ چوہدری اسے گھورتا ہوا لاشوں کے قریب جا پہنچا۔ وہ لاشیں ڈھانچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں، ہڈیوں کے پنجروں سے زیادہ تر گوشت غائب تھا۔ لاشوں کی حالت دیکھ کر چوہدری جیسے ظالم انسان کی حالت بھی غیر ہو گئی۔

اچانک چوہدری چونکا ایک نوجوان اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس رپورٹر کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ شہزاد نامی یہ پولیس رپورٹر ایک بڑے اخبار سے وابستہ تھا۔ ”چوہدری صاحب یہ علاقہ آپ کے حلقہ میں شامل ہے آپ کا یہاں بہت اثر رسوخ ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس علاقے میں کیا ہو رہا ہے؟ ہم نے سنا ہے گزشتہ کچھ عرصے سے یہاں اس قسم کی بہت ہی لاشیں ملی ہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس سے پہلے جو لاشیں ملیں ان کے مقدمات کیوں درج نہیں ہوئے؟“ رپورٹر کے سوالات پر چوہدری کو ساپ سو گھہ گیا۔

”دیکھئے مشرا ابھی ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوگا تب ہی پتہ چلے گا کہ ان کی موت کی وجوہات کیا ہیں۔ پھر ڈی این اے ٹیسٹ ہوگا تا کہ معلوم ہو سکے یہ تینوں کون تھے، آپ خود دیکھ رہے ہیں یہ صرف ہڈیوں کے خنجر ہیں۔“

چوہدری کو رپورٹر کے گھیرے میں دیکھ کر اے

ایس آئی شاکر اللہ، اس کی مدد کو لپکا۔ ”اچھا آفسر میں چلتا ہوں یہ درنگی دیکھ کر میری حالت خراب ہو رہی ہے۔“ چوہدری بہانہ بنا کر وہاں سے کھٹک گیا۔

☆.....☆.....☆

حماد کا ڈرائیو کرتے ہوئے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر اس کی جوان سال بیوی سمیرا بیٹھی تھی۔ دونوں کی شادی گزشتہ ماہ ہوئی تھی۔ سمیرا حماد کی کزن تھی۔ حماد کے والد حسین صاحب کی گاؤں میں تھوڑی سی زمین تھی جس سے ان کی گزر بسر ہو رہی تھی حماد بی اے کرنے کے بعد باپ سے ضد کر کے روزگار کے سلسلے میں دہلی چلا گیا۔ اس کے دہلی جانے کے اخراجات حسین نے اپنی آدمی سے زائد زمین فروخت کر کے پورے کئے۔ حماد دس سال دہلی میں رہا اس دوران اس نے اچھا خاصا کمایا تھا۔ اس کے والد کا شہر جانا ہوا۔

خوشی کی بہن سمیرا کو دیکھ کر اپنے بیٹے حماد کے لئے پسند کر لیا۔ حماد اور سمیرا دونوں کزن تھے۔ لہذا چٹ مگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق اگلے ماہ حماد کے پاکستان آتے ہی دونوں کی شادی ہو گئی۔ سمیرا مشرقی لڑکی تھی لہذا اس نے کسی قسم کا احتجاج کئے بنا ہی بھری تھی۔ شادی کے بعد سمیرا نے باپ کو بھلانے کی ممکنہ کوشش کی، وہ دونوں ہی مومن کے لئے پہاڑی علاقے میں چلے گئے اس وقت وہ بھی مومن سے فارغ ہو کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے سمیرا پہلی بار گاؤں اپنے سرال جا رہی تھی۔ ابھی ان کی گاڑی گاؤں کی حدود سے کچھ فاصلے پر تھی کہ ہلکی ہلکی بوند باندی ہونے لگی۔ حماد نے دیکھ کر پتہ چلا دیا۔

”کہیں بارش تیز نہ ہو جائے۔“ سمیرا نے خدشے کا اظہار کیا۔

”فکرمات کرو گھنٹے بھر کا سفر باقی ہے اکثر یہاں ایسے ہی ہوتا ہے بس بوند باندی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دو تین بار بارش بھی ہوئی لیکن ہلکی سی۔“ حماد بولا۔

لیکن ایسا ہوا نہیں حماد کی توقع کے برخلاف جب ان کی گاڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی گرج

چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ”لو بارش کو بھی ابھی تیز ہونا تھا۔ سر پرانز دینے کے چکر میں ابو کو فون بھی نہیں کیا، اب گنگل کام نہیں کر رہے۔“ حماد موبائل فون کی اسکرین دیکھتے ہوئے بولا۔ بارش کی وجہ سے اس نے گاڑی کی رفتار کم کر رکھی تھی۔ ہیڈ لائٹس زیادہ دور تک کام نہیں کر رہی تھیں۔ ”بارش رکتی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔“ حماد بڑبڑایا۔ اس کا خیال اس بار درست ثابت ہوا بارش مزید تیز ہو گئی۔

اچانک سامنے سے ایک جیب آتی دکھائی دی۔ حماد نے گاڑی سائیڈ پر روکی۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک کافی ناہموار تھی۔ جیب ان کی گاڑی کے قریب آ کر رک گئی۔ حماد نے جیب کی طرف دیکھا۔ چوہدری حاکم اپنے چار حواریوں سمیت جیب میں موجود چار بیس نظروں سے سمیرا کو دیکھ رہا تھا۔ ”دہلی سے آتے ہی شادی کر لی حماد بابو، ہمیں بلایا تک نہیں۔ چلو ہم خود ہی ملنے آ جائیں گے۔“ چوہدری نے قہقہہ لگایا۔

”چوہدری صاحب ابو نے شادی کے سلسلے میں جلدی کی تھی اور ہماری شادی بھی شہر میں ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کو دعوت نہ دے سکے۔“ حماد معذرتی لہجے میں بولا۔

”او سناؤں کوئی گلا نہیں فیہر ملاں گے۔“ چوہدری نے کہا اور اس کی جیب آگے بڑھ گئی۔ حماد نے گاڑی اشارت کی۔ ”یہ نمونہ کون تھا ویسے شکل سے تو بد معاش لگتا تھا۔“ سمیرا ہنسیکھ لہجے میں بولی۔

”ہمارے گاؤں کا چوہدری ہے۔“ حماد نے مختصر جواب دیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے گھر پر موجود تھے۔ حماد کے والدین نے بھوک خوب آؤ بھگت کی۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ صبح ان کی آنکھ دیر سے کھلی ابھی وہ ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ حسین صاحب نے دروازہ کھولا۔ دروازے میں شیرا سمیت چوہدری

کے نصف درجن کارندے موجود تھے۔ وہ دیدہ دلیری سے حسین صاحب کو دھکیلتے ہوئے گھر میں کھتے چلے گئے۔ ”اوہو میں بھی بولوں چوہدری کا دل اس چھوکر پر کیوں آ گیا، یہ تو چاند کا کلڑا ہے، سن او باؤ، آج اسے رات کو کوئی بھجوا دینا یہ چوہدری حاکم کا حکم ہے۔“ شیرا نے ان پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ حماد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے اپنی راکٹوں کا رخ حماد کی طرف کر دیا۔

”کو بیٹا! یہ نادان ہے سمجھتا نہیں یہ رات کو آئے تھے سڑکی تھکن ہے، میں کل خود ہی بھوکھو کی لے آؤں گا۔“ حسین صاحب مصلحت بھرے لہجے میں بولے۔

”بوڑھا سمجھدار ہے، اور سن کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔“ شیرا نے حسین صاحب کو تنبیہ کی اور سب افراد کے ہمراہ گھر سے نکل گیا۔

”ابو آپ نے اس خبیث سے ایسا وعدہ کیوں کیا؟“ حماد کی پیشانی عرق آلودھی۔

”ایسا میں نے انہیں ٹالنے کے لئے کیا ہے، ہم آج رات ہی یہ گاؤں چھوڑ کر فرار ہو جائیں گے۔“ سارا دن ان کا پریشانی میں گزرا پریشانی کے عالم میں وہ بھوکے رہے۔ جب مصیبت انسان کے سر پر کھڑی ہو تو نہ ہی بھوک لگتی ہے نہ نیند آتی ہے۔ وہ چاروں بھوکے پیاسے جاگتے رہے اور رات میں دے قدموں گھر سے باہر نکلے، نصف شب کا وقت تھا، حسین صاحب اور حماد نے سوٹ کیس ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ حماد کی والدہ اور سمیرا نے چہرے چادروں سے ڈھانپ رکھے تھے ان کی گاڑی گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی وہ گاڑی کے قریب جیسے ہی پہنچے، چوہدری کے کارندے اندھیرے میں کہیں سے اچانک نمودار ہو گئے۔ وہ شیرا سمیت چھ افراد تھے جنہوں نے جدید طرز کی رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ ہوشیاری مت دکھانا، چوہدری کبھی اپنے شکار سے غافل نہیں رہتا، تم نے بھاگنے کی کوشش کر کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اب چلو



چوہدری کے سامنے۔“ وہ ان چاروں کو رانقلوں سے دھکیلے لگے۔ شیرا نے میرا کواٹھا کر جیب کی پچھلی سیٹ پر پھینکا، دو رانقل بردار جلدی سے اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے، انہوں نے میرا کواٹھ طرح دیوچ لیا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔

”چھوڑو اسے۔“ حماد پھر کر ایک رانقل بردار سے لپٹ گیا تو دوسرے نے رانقل کا ہٹ حماد کے جڑے پر مارا۔ حماد کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی وہ لہو لہا ہوا گیا۔

”اسے مت مارو۔“ حسین صاحب شیرا کے قدموں میں گر گئے۔ شیرا کے روکتے روکتے رانقلوں کے بنوں سے حماد کی اچھی خاصی مرمت ہو چکی تھی۔

”چلو تم لوگ اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھو۔“

شیرا اور اس کے ساتھیوں نے حماد اور والدہ کو ان کی گاڑی کی پچھلی سیٹوں میں دھکیلا ایک رانقل بردار ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ شیرا نے ڈرائیوگ سیٹ سنبھالی۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے حویلی کی طرف دوڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں انہیں بے دست دیا کر کے حویلی پہنچا دیا گیا۔ شیرا چلتی ہوئی میرا کو تہہ خانے میں بند کر آیا جبکہ حماد اور اس کے والدین کو حویلی کی عقبی سمت لے جایا گیا۔

چوہدری اس جگہ موجود مچھوں کو تاؤ دے رہا تھا کہ ایک جگہ خندق نما بڑا سا گڑھا کھد پڑا تھا۔ تین صحت مند قسم کے افراد گڑھے سے نکلنے والی مٹی کے ڈھیر کے پاس کھڑے تھے۔ تینوں نے اپنے ہاتھوں میں نیلے چٹڑے ہوئے تھے۔ ”حاکم کے حکم سے تمہیں انکار کی ہمت کیسے ہوئی۔“ چوہدری چلا یا۔

”چوہدری اللہ سے ڈرو اس کی لٹھی بے آواز ہے۔ جب تیرے سر پر پڑے گی تب تو اپنے برے افعال برے کاموں، پھیلے گناہوں پر پچھتائے گا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔“ حسین صاحب گھمبیر لہجے میں بولے۔

چوہدری چراغاں ہو گیا۔ ”ان تینوں کو زندہ دفن

کردو۔“ مسلح افراد نے رانقلوں کے بنوں سے ان تینوں کو مارنا شروع کر دیا کچھ دیر بعد وہ تینوں زمین پر ادھ موئے پڑے تھے۔ حماد اور اس کے والدین کو گھسیٹ کر گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ چوہدری کے اشارے پر گڑھے میں مٹی ڈالنی شروع کر دی گئی۔ کچھ ہی دیر میں گڑھا مٹی سے بھر گیا وہ تینوں اس گڑھے میں زندہ دفن ہو چکے تھے۔

اب چوہدری کا رخ تہہ خانے کی طرف تھا جہاں بے بس میرا قید تھی۔ ادھر میرا تہہ خانے میں قید اندیشوں میں گھری ہوئی تھی۔ چوہدری کی خالمانہ فطرت کا اسے اندازہ ہو چکا تھا اپنی عزت اور زندگی اسے خطرے میں نظر آ رہی تھی اس ویران تہہ خانے میں اس کا کوئی انسان مددگار نہ تھا۔ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا۔

”جہاں کوئی انسان مدد کو نہ پہنچ سکتا ہو۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امیدیں واسطہ رکھنی چاہئیں۔ اسی ذات پاک نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچایا، وہی اللہ ہے جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو چھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا۔ اسی پاک پروردگار نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں محفوظ رکھا۔“

میرا جس نے زندگی میں نماز نہ پڑھی تھی۔ اس کی والدہ نے زبردستی اسے نماز پڑھنا سکھایا تھا۔ وہ تہہ خانے میں ایک طرف نیت کرنے کے بعد نماز پڑھنے لگی۔ سجدہ میں جاتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

نماز پڑھنے کے بعد اس نے سلام پھیرا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ”یا اللہ میری مدد فرما۔ جس طرح تو نے حضرت ابراہیم کو آگ سے محفوظ رکھا۔ جس طرح تو نے حضرت یوسف کی کنوئیں میں حفاظت فرمائی۔ جس طرح تو نے حضرت یونس کو چھلی کے پیٹ میں محفوظ رکھا۔ یا اللہ میری عزت کو اس درندے سے محفوظ رکھ۔“ وہ روتے ہوئے دعا کر رہی تھی۔

اسی وقت چوہدری حاکم عجیب ہیبت میں اندر داخل ہوا۔ اندر بٹھی کیمرا کے دعا کے الفاظ اور اس کے رونے کی آواز اور پیٹے آنسوؤں کو دیکھ کر ہتھکڑیاں مار کر ہنسا۔ ”تیرے شوہر اور ساس سر کو زندہ زمین میں دفن کر کے آ رہا ہوں۔ اس تہہ خانے میں کتنی لڑکیوں کی عزت میں نے بربادی کی۔ اب تیری باری ہے۔ دیکھتا ہوں تیرا خدا تجھے کیسے بچاتا ہے۔“ وہ شیطانی ارادے سے کیمرا کی طرف بڑھا۔

”کون کہتا ہے کہ اللہ نہیں سنتا۔ وہ سچے دل سے مانگی ہر دعا قبول کرتا ہے مظلوم کے آنسو عرش کو ہلادیتے ہیں۔“

اچانک ان دونوں کے درمیان ایک ہولہ سا نمودار ہوا جس نے رفتہ رفتہ ایک خوب صورت لڑکی کی شکل اختیار کر لی اچوہدری اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی پلکوں تک نے جھپٹنا بند کر دیا تھا۔

”میرا تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہے جلدی سے باہر بھاگ جاؤ کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔ حویلی کا ہر فرد پتھر کا بت بن چکا ہے۔ تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔ ایک گھنٹہ تک یہ پتھر کے بت بنے رہیں گے۔“ نمودار ہونے والی لڑکی نفرتی آواز میں بولی۔

”آپ کون ہیں؟“ میرا نے ہمت کر کے پوچھا۔

”میرا نام شکیلہ ہے۔ اسی تہہ خانے میں اس درندے نے مجھے بھی برباد کیا تھا۔ آج تم نے سچے دل سے اللہ کو پکارا تو اللہ کی رحمت جوش میں آ گئی۔ تمہاری مدد کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ اب وقت ضائع مت کرو۔“ روح نے کہا اور میرا بھاگتی ہوئی تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے تہہ خانے سے باہر نکل کر کوریڈور میں بھاگنے لگی۔ کوریڈور میں نصف درجن افراد ساکت کھڑے تھے وہ گیٹ تک جا پہنچی گیٹ پر بھی دو مسلح افراد بت کی طرح ساکت تھے۔ وہ حویلی سے نکل کر بھاگنے لگی۔ وہ دونوں کی طرح دوڑ رہی تھی۔

دوڑتے دوڑتے وہ جنگل میں داخل ہو گئی۔

جب وہ گھنے جنگل میں داخل ہوئی تو صبح کے چھ بج رہے تھے۔

اچانک کسی شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا دائیں سمت جھاڑیوں سے ایک قد آور شیر دھاڑتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں کیمرا پر جمی ہوئی تھیں۔ کیمرا خوف سے اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی شیر نے اپنا پیٹ زمین سے لگایا اور کیمرا پر حسرت لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ خوفناک موت شیر کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔

☆.....☆.....☆

ایس پی شیر یار نصف درجن پولیس اہلکاروں کے ہمراہ جنگل میں تفتیش کے لئے آیا ہوا تھا۔ یہ وہی مقام تھا۔ جہاں سے اسلم اور اس کے دو ساتھیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ لاشوں کے ناقابل شناخت ہونے کی وجہ سے DNA ٹیسٹ کروایا گیا۔ ٹیسٹ سے ثابت ہو گیا کہ لاشیں اسلم اور اس کے ساتھیوں کی ہیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ چونکا دینے والی تھی۔ لاشوں کے جسم سے دماغ، دل، گردے، آنکھیں سرجری کے ذریعے نکال دی گئی تھیں، مرنے سے پہلے انہیں بے ہوش کیا گیا تھا۔ ”یہ کام کسی درندے یا عام انسان کا نہیں کسی ماہر سرجن کا ہے۔“ شہر یار کا دماغ ان ہی خطوط پر درست سوچ رہا تھا۔

سوچنے کے دوران وہ اپنے ارد گرد سے غافل ہو گیا۔ اس غفلت کی اسے بھاری قیمت چکانی پڑی، انجانی سمت سے آنے والی کوئی شے ان کے جسموں میں پیوست ہو چکی تھی۔ وہ سب اپنے ہوش کھو بیٹھے۔

ایس پی شہر یار کو ہوش آیا تو اس نے اٹھنا چاہا مگر ناکام رہا اس کے ہاتھ پاؤں لوہے کی زنجیروں کی مدد سے آہنی بیڈ سے بندھے پڑے تھے۔ اس ہال کمرے میں عجیب مینشیں پڑی تھیں۔ ایک اڈیٹر عمر کا شخص ہاتھوں میں سرجیکل آلات لئے اس کے قریب کھڑا تھا۔ ”کون ہو تم اور میری فورس کے نوجوان کہاں ہیں؟ جنگل میں تم نے ایسا کیا کیا تھا جو ہم سب سینکڑوں



میں بے ہوش ہو گئے؟“ شہر یار بے خونی سے اس سے پوچھنے لگا۔

”تم دس گھنٹے بعد ہوش میں آئے ہو۔ اس دوران تمہارے ساتھی اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں، ان کے دل، گردے، آنکھیں اور دماغ، سر جری کے ذریعے نکال دی گئیں اور گوشت آدم خور بندر کھا گئے اب تمہاری باری ہے۔“ ڈاکٹر حاتم نے قہقہہ لگایا۔

اس کی بات سن کر ایس پی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ”تم نے جنگل میں ہمارے ساتھ کیا کیا تھا؟“ ایس پی نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے تجربہ گاہ سے کچھ فاصلے پر ایسا جدید سسٹم نصب کیا ہے کہ تجربہ گاہ کی حدود سے ایک کلومیٹر سے بندہ جب ہماری حدود میں داخل ہوتا ہے تو ہمیں علم ہو جاتا ہے۔ اس سسٹم میں یہ خوبی ہے کہ چھوٹے جانوروں اور پرندوں کی آمد پر سنکڑل موصول نہیں ہوتے صرف انسانوں اور بڑی جسامت کے جانوروں کی آمد پر متحرک ہوتا ہے۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بے ہوش کرنے کا کمال میرے غلام بندروں کا ہے۔ جو نہ صرف انسانوں کی طرح بول سکتے ہیں بلکہ انسانوں کی طرح سوچتے سمجھتے ہیں۔ یہ ہر قسم کا ہتھیار چلانا جانتے ہیں ان بندروں کی کلائی پر مخصوص ساخت کی گھڑی موجود ہے جس میں چھوٹی اور باریک سوئی نصب ہے گھڑی کا رخ مطلوبہ فرد کی طرف کر کے گھڑی کا بین دبایا جاتا ہے۔ سوئی گھڑی سے نکل کر مطلوبہ فرد کے بدن میں پیوست ہو جاتی ہے اس سوئی میں انسان کو سیکنڈوں میں بے ہوش کر دینے والی انتہائی تیز ترین دوا شامل ہے۔

میرے ساتھی بندر اس وقت بیس عدد ہیں سب کی کلائیوں پر گھڑی موجود ہے۔ اب زیادہ باتوں کا وقت نہیں تمہارے ماتحت اوپر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر حاتم سفاک لہجے میں بولا۔

”ڈاکٹر مجھے مار کر تم اپنے حق میں بہت برا کرو گے پولیس کا محکمہ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جائے گا۔

میں ایس پی شہر یار خان ہوں آئی جی پولیس کا داماد میرا فیملی بیک گراؤ بند بھی بہت بڑا ہے۔“

”تم جو کوئی بھی ہو تمہارا قانون میرا کچھ نہیں لگاؤ سکتا میرے حفاظتی انتظامات انتہائی سخت ہیں۔ قانون کو مطلوب سفاک ترین نارگٹ کلر اور بیس کے قریب میرے تیار کردہ انسان نمابندر اور اس تجربہ گاہ کے اوپر عمارت کے باہر کچھ فاصلے پر خود کار گنیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ اس عمارت کی چھت پر خطرناک ترین میزائل سسٹم نصب ہے۔ ایک بین دبائے کی دیر ہے یہ میزائل سیدھے تمہارے شہر پر جا گریں گے اور وہ شہر صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا، یہ سب کچھ میں اس تجربہ گاہ سے کنٹرول کر سکتا ہوں۔ میں ناقابل تغیر ہوں۔“ ڈاکٹر حاتم قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا اور اس کے بازو میں انکشن لگانے لگا۔

ایس پی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ خوف اور دہشت، دلیر اور اندر پولیس افسر کے چہرے پر نمایاں نظر آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کامران اور ڈاکٹر جشید تجربہ گاہ میں داخل ہوئے اور بے ہوش ایس پی کے بدن کی جیر پھاڑا کام سر انجام دینے لگے۔ دو گھنٹے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ بندر ڈاکٹر حاتم کے حکم پر اندر آئے اور دل، گردے، آنکھوں اور دماغ سے محروم لاش اٹھا کر باہر نکل گئے ان کی آج کی دعوت کا بھرپور انتظام ہو چکا تھا۔ ایس پی کے ساتھیوں کے بعد ایس پی کا گوشت بھی انہیں نصیب ہو رہا تھا۔

اجاک تجربہ گاہ میں ٹوں ٹوں کی آواز تیزی سے گونجنے لگی ڈاکٹر حاتم کمپیوٹر کی طرف لپکا۔ کمپیوٹر اسکرین پر عمارت کے باہر گھنے جنگل کا منظر تھا جس نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ یہ منظر انتہائی ناقابل یقین تھا اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نظر آنے لگے۔ کمپیوٹر اسکرین پر روبی نظر آرہی تھی۔ اس کی محبت روبی جس نے اسے ٹھکرایا تھا۔

ایک بھاری جسامت کا شیر اس سے کچھ فاصلے

پر حملے کے لئے پرتول رہا تھا۔ شیر نے اس پر جست لگانے کی تیاری کر لی تھی۔ ڈاکٹر حاتم نے پھرتی سے چند بن دبائے خفیہ خود کار گنوں سے گولیاں نکلیں اور شیر کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ شیر زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ گولیوں کے برسٹ نے شیر کا جسم چھلنی کر دیا تھا۔ شیر کے پراسرار طور پر مرتے ہی گولیوں کی آواز سن کر لڑکی خوفزدہ کھڑی متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”نمبر دن، نمبر نو، روبی کو جنگل سے بہ حفاظت یہاں لے آؤ۔“ ڈاکٹر چلایا۔

تقریباً دس منٹ بعد بن مانس کی جسامت کے دو بندر روبی کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ روبی جو کہ اصل میں سمیرا تھی۔ ڈاکٹر کی پسند روئی کی ہمشکل خوفناک بندروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر خوف سے بے ہوش ہو کر گر گئی۔ ایک بندر نے آہستگی سے اسے اٹھایا، چند منٹ بعد ہی سمیرا تجربہ گاہ میں موجود ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

”ڈاکٹر کامران تم لوگ جنت میں جا کر وقت گزارو۔ میری ذہنی کیفیت درست نہیں ہے۔“ ڈاکٹر حاتم بولا اور وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے تجربہ گاہ سے نکل گئے۔

ڈاکٹر حاتم سمیرا کی طرف بڑھا۔ سمیرا ہو ہو روبی کی ڈیلی کیٹ معلوم ہو رہی تھی۔ دونوں کی شکل و صورت قد و قامت اور رنگت بالکل ایک جیسی تھی۔ یہ ایک حیرت انگیز اتفاق تھا بالکل فلی چویشن تھی۔ سمیرا گویا روبی کا ڈبل پارٹ تھی۔ ڈاکٹر نے ایک انکشن سمیرا کو لگایا اب وہ بے تابی سے سمیرا کے چہرے کو نکد رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ ”آخر تم مجھے مل گئیں۔ اب میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔“

کچھ دیر بعد سمیرا کو ہوش آ گیا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ ارد گرد کا منظر دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ ”تت، تم کون ہو۔ میں کہاں ہوں، خدا کے لئے مجھے جانے دو؟“

”روبی میں ڈاکٹر حاتم ہوں جو تم سے محبت کرتا

تھا۔ بے انتہا محبت مگر تم نے مجھے ٹھکرایا۔ اب ایسا مت کرنا، میں دنیا کو آگ لگا دوں گا۔ تم میری ہو، تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو میں سب کو تباہ و برباد کر دوں گا۔“ ڈاکٹر حاتم بذیانی لہجے میں بولا۔ وہ روبی کی ہمشکل سمیرا کو دیکھ کر دیوانگی کی آخری حد پر جا پہنچا تھا۔

سمیرا جو اٹھ کر بیٹھ گئی تھی خوفزدہ ہی اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے ساتھ آسمان سے گرا چھوڑ میں انکا والا معاملہ ہوا تھا۔ چوہدری کے کھنچے سے نکل کر اس پاگل ڈاکٹر کے قہقہے سے جا چڑھی تھی۔

”ارے میں نے تو تم سے کچھ کھانے پینے کا پوچھا ہی نہیں۔ میں چائے منگواتا ہوں۔“ ڈاکٹر حاتم نے کوئی بین دبایا اور مائیک میں بولا۔ ”چائے لاؤ میری جان کے لئے۔“ دس منٹ بعد ایک بندر چائے کا کپ ٹرے میں لایا ان کے قریب ٹرے رکھنے کے بعد فحشی سجدہ کیا اور بولا۔ ”اور کوئی حکم میرے آقا۔“

سمیرا بندر کے منہ سے کھر کھراتی ہوئی انسانی آواز سن کر خوفزدہ ہو گئی۔

”نہیں اب تم جاؤ۔“ ڈاکٹر نے اسے خوفزدہ دیکھ کر بندر کو جانے کے لئے کہا۔ ”ان سے مت ڈرو، یہ میرے بنائے ہوئے ہیں، میرے اشاروں پر چلتے ہیں یہ کھانا کھا سکتے ہیں، چائے بنا سکتے ہیں، ہماری طرح بول چال سکتے ہیں۔ میں ہمیں یہاں کی ہر چیز دکھاؤں گا اپنی بنائی ہوئی، جنت بھی دکھاؤں گا۔“ وہ سمیرا کے قریب جا بیٹھا۔

”میں تمہاری جدائی میں برسوں رویا ہوں۔ اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔“ ڈاکٹر حاتم نے اس کے گرد اپنے بازو حائل کر دیئے۔ روبی تم اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔“

”دیکھو تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں روبی نہیں سمیرا ہوں۔ چوہدری حاکم نے میرے شوہر اور ساس سر کو قتل کر دیا ہے، میں اس سے عزت اور جان بچا کر بھاگی اور جنگل میں جا بیٹھی۔“ سمیرا بے بسی سے



ڈاکٹر حاتم بھڑک اٹھا۔ اس نے چائے کا کپ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ ”تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم روٹی ہو۔ کھوتم روٹی ہو ورنہ میں اس شہر کو کھنڈر بنادوں گا۔ سب کو فنا کر دوں گا، تمہیں بھی مار دوں گا۔“ ڈاکٹر حاتم جنونی ہو کر اسے جھنجھوڑنے لگا۔

”ہاں میں روٹی ہوں۔ اب تو مجھے چھوڑ دو۔“ سمیرا خوفزدہ لہجے میں بولی۔ سمیرا نے اندازہ لگا لیا کہ ڈاکٹر حاتم جنون میں مبتلا ہو چکا ہے اس سے جان بچانی ہے تو اس کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔

ڈاکٹر حاتم پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ”بولو تم میری ہوتاں۔“ سمیرا کے چہرے پر گہری نظریں مرکوز کرتے ہوئے ڈاکٹر گہری متانت سے بولا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ وہ شپٹا گئی اور ڈاکٹر حاتم نے اسے گلے لگا لیا۔ ”چلو میں تمہیں تجربہ گاہ کی سیر کراؤں۔“ وہ اسے لے کر کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔ ”یہ دیکھو کمپیوٹر اسکرین پر عمارت کے باہر کے مناظر دکھائی دے رہے ہیں اگر دشمن اس حدود میں آ جائے تو سنگٹل موصول ہوتے ہیں۔ تجربہ گاہ میں الارم بجنے لگتا ہے، تب یہ گرین بٹن دبان پڑتا ہے، درجنوں خفیہ خودکار گنیں نارگٹ پر برسنے کے لئے تیار ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد ریڈ بٹن دبا ہے ہی گولیاں نارگٹ پر برس جاتی ہیں۔ اب یہاں آؤ۔“ وہ سمیرا کو لئے ہوئے دوسری طرف چلا گیا۔

”اس لیپ ٹاپ کے قریب مشین پر جو لیور ہے اس کو نیچے کرتے ہی میزائل فائر کے لئے تیار ہوجائیں گے۔ پھر یہ بلیک بٹن دبان پڑے گا، پانچ منٹ بعد ہی یہ خطرناک ترین میزائل شہر پر جا گریں گے پھر پورا شہر تباہ ہوجائے گا۔“

”لیکن اگر وہ وہاں کے بجائے یہاں گر گئے تو؟“ سمیرا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا جب تک اس لیو کو دوبارہ اوپر نہ کیا جائے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر کسی غلطی

سے فوراً ہی لیور اوپر کر کے میزائل روکنے کی کوشش کی تب ہی ایسا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اس تجربہ گاہ میں میرے ڈاکٹر جشیہ اور کامران کے علاوہ کسی کو یہاں کسی مشین کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔ چلو تمہیں گے ہاتھوں جنت کی سیر بھی کرا دوں۔“ وہ اسے لئے ہوئے تجربہ گاہ کے کونے میں چلا گیا۔ اس نے چھت میں لگے ایک لیور کو گھمانا شروع کر دیا۔ دائیں سمت کی دیوار اپنی جگہ سے ہٹ گئی یہ ایک دوسری سرنگ میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ وہ سمیرا کا ہاتھ تھامے سرنگ میں اتر گیا۔

ان کے اندر جاتے ہی سرنگ کا دروازہ بند ہو گیا اور لائٹس آن ہو گئی۔ ”یہاں کئی جگہوں پر الیکٹرک سوئچ لگے ہیں، یہاں پر ہمارا الیکٹرک نظام اپنا ہے۔ اس سرنگ کے آخری حصے میں اسلحہ خانہ بھی ہے اور وہ سوئچ آن کرتا ہوا باتیں کرتا رہا اور سمیرا کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا رہا۔ آخری حصے میں اسلحہ خانے کے قریب چھت پر لگے لیور کو گھماتے ہی ایک خفیہ دروازہ کھلا، ہوا کے سرد جھوکے ان کے بدن کو راحت دینے لگے جیسے ہی وہ دروازے سے اندر داخل ہوئے دروازہ خود کار طریقے سے بند ہو گیا۔

یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا ان کے ارد گرد خوب صورت مناظر تھے، قسم قسم کے پھولوں کے پودے ارد گرد موجود تھے۔ چار عدد خوب صورت تالا با جن میں فوارے نصب تھے۔ تالابوں میں سونے کے بنے عورتوں کے عریاں تجسے تھے اور دلکش فوارے بھی تھے، دیواریں سنہری رنگت کی تھیں جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ درجنوں خوب صورت لڑکیاں نیم عریاں لباس میں گھوم پھر رہی تھیں۔

ڈاکٹر حاتم اور سمیرا آگے بڑھے تو ڈاکٹر کامران اور جشیہ پر نظر پڑی جو دو لڑکیوں سے اکھیلیاں کر رہے تھے درجن کے قریب خوفناک شکل کے افراد انہیں ہاتھوں میں لئے گھوم رہے تھے۔ ان جرائم پیشہ افراد کے چہرے وحشت زدہ تھے انہوں نے ڈاکٹر حاتم کو سجدہ کیا۔ وہ دونوں کافی دیر خود ساختہ جنت میں رہے پھر ڈاکٹر حاتم

اسے دوبارہ تجربہ گاہ میں لے آیا۔

سمیرا کو وہاں رہتے ہوئے تین روز گزر چکے تھے۔ ایک روز ڈاکٹر حاتم جنگل گیا ہوا تھا اور سمیرا تجربہ گاہ میں اکیلی تھی۔ ڈاکٹر حاتم سمیرا پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ اب تک تو سمیرا اس سے محفوظ تھی۔ دراصل ایک روز جب ڈاکٹر حاتم نے اس سے دست درازی کی کوشش کی تو سمیرا نے اسے ٹوک کر کہا۔ ”شادی سے پہلے یہ ممکن نہیں اور شادی وہ عہد کی مدت گزرنے کے بعد ڈاکٹر حاتم سے کرے گی۔“

ڈاکٹر حاتم اس کا دیوانہ تھا اس نے سمیرا سے وعدہ کر لیا کہ شادی سے پہلے اسے ہاتھ نہیں لگائے گا، اب اسے سمیرا کی عدت ختم ہونے کا انتظار تھا۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے سمیرا کی نظر ایک طرف پڑے موبائل فون پر پڑی اس نے موبائل فون اٹھایا اور خوشی کا نمبر ملانے لگی نمبر مل گیا۔ ”باجی میں سمیرا بول رہی ہوں۔“

”سمیرا کہاں ہو تم! تمہارا اور حماد کا اور انکل، تینوں کے نمبر بند جا رہے ہیں۔“ خوشی بے تابی سے بولی اور سمیرا نے اپنی تمام روداد سنا ڈالی اور بتایا کہ چوہدری نے کیسے اس پر ظلم ڈھائے اب وہ ڈاکٹر حاتم کی قید میں ہے جو جنگل میں واقع ہے۔ ”باجی میرے پاس وقت نہیں، یہ نہ ہو کہ ڈاکٹر حاتم آجائے وہ جنونی انسان ہے۔“ سمیرا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ یاسر کو فون کرے اور وہ یاسر کا نمبر ملانے لگی۔

صبح کے وقت خوشی اپنے ادارے کے اعلیٰ افسر کے سامنے بیٹھی تھی اور افسر کو سمیرا پر بیٹنے والے مظالم کی کھٹا سنار ہی تھی۔ افسر نے اپنی میز پر پڑی بہت سی فائلوں میں سے ایک فائل نکالی۔ اسے کھولا اور دستخط کرنے کے بعد فائل خوشی کے حوالے کر دی۔ ”خوشی تم ہمارے محکمے کی ذمہ دار اور ذہین افسر ہو، اب تک تم نے بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں، یہ فائل کل ہی ہمارے ادارے کے حوالے کی گئی ہے۔ جس گاؤں کا تم

نے ذکر کیا ہے اس کے جنگل میں بہت سے لوگ لاپتہ ہو گئے ہیں۔ لاپتہ ہونے کے بعد کچھ لوگوں کی لاشیں ملی ہیں جن کے جسم پر گوشت برائے نام ہوتا ہے۔ یعنی ڈھانچے ملے ہیں فیض لاپتہ افراد کا سراغ ہی نہیں ملا۔ پچھلے دنوں ایک بڑے سیاسی گھرانے سے تعلق رکھنے والے تین نوجوان شکار کھیلنے گئے اور لاپتہ ہو گئے دوسرے روز ان کی ناقابل شناخت لاشیں ملیں۔ لاشیں کیا تھیں ڈھانچے تھے۔ DNA ٹیسٹ سے ان کی شناخت ہوئی۔ اس کے کچھ روز بعد ایس پی شہر یار جو کہ وہاں کے آئی جی صاحب کے داماد بھی تھے کچھ پولیس اہلکاروں کے ساتھ جنگل میں تفتیش کے لئے گئے اور لاپتہ ہو گئے۔ ان لاپتہ پولیس افسران میں سے صرف ایس پی شہر یار کا ڈھانچہ ملا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ ہلاک ہونے سے پہلے انہیں بے ہوش کیا گیا تھا، اس کے بعد سر جری کے ذریعے ان کے دماغ، آنکھیں، دل، گردے نکال لئے گئے۔ ظاہر ہے یہ کام کسی ماہر سر جرن کا ہی ہو سکتا ہے۔

اب یہ کیس صوبائی حکومت کی درخواست پر ہمارے حساس ادارے کو ملا ہے۔ ہمارے ادارے کو تمہاری بہت ضرورت ہے اب تک تمہیں جتنے بھی کیسز ملے ہیں۔ تم نے تقریباً ہر مجرم کو اس کے انجام تک پہنچایا ہے اس کے علاوہ تم نے اپنی بہن کی داستان بیان کی ہے اس لئے یہ کیس میں تمہارے حوالے کرتا ہوں۔

چوہدری با اثر شخصیت ہے وہ اپنے حلقے سے ایکشن جیت چکا ہے اور حکمران جماعت کا وزیر ہے تم بغیر ثبوت کے اس کے اوپر ہاتھ نہیں ڈال سکتیں۔ میڈیا بھی ان حادثات کے بعد بہت اچھل کود کر رہا ہے۔ جلد از جلد اس کیس کو حل کر کے مجرموں کو کیفر کر دیا تک پہنچاؤ۔“ افسر اعلیٰ نے تفصیلی گفتگو کی۔

”سر ہو سکتا ہے جنگل میں غائب ہونے والے افراد کی ہلاکتوں میں ڈاکٹر حاتم کا ہاتھ ہو، اسی ڈاکٹر حاتم کا جس کا فون کال پر سمیرا نے مجھ سے ذکر کیا ہے۔“ خوشی نے افسر اعلیٰ کی بات کاٹ کر اپنے خدشے کا اظہار



کیا۔

”ہوسکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا ہے۔ تمہاری سیرا سے تفصیلی بات نہیں ہوئی۔“ افسر نے پوچھا۔

”ساس سر کی لاشیں چوہدری کی حویلی کے عقبی حصے میں دفن ہیں اور یہ بھی بتایا کہ وہ گھنے جنگل کی کسی عمارت کے تہ خانے میں واقع تجربہ گاہ میں جنوبی ساہنسان حاتم کے قبضے میں ہے۔ ڈاکٹر حاتم اسے اپنی محبوبہ روٹی سمجھ رہا ہے کیونکہ سیرا کی شکل روٹی سے ملتی جلتی ہے۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔“ خوشی بولی۔

”تمہارے ساتھ ہمارے گلے کا ہونہار افسر نوید اختر جائے گا۔ وہ تمہارے اندر رہے گا۔ علاقہ پولیس بھی تم سے تعاون کرے گی اس کے علاوہ کسی بھی پرائیلم کی صورت میں تم وہاں سے بھاری نفری بھی منگوا سکتی ہو اور کوئی سوال؟“

”نوسر۔“ خوشی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اپنا خیال رکھنا۔“ افسر بولا۔ خوشی تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

خوشی اور نوید اختر دوسرے روز سہ پہر کے وقت گاؤں میں موجود تھے۔ انہوں نے گاؤں کے تقریباً ہر فرد سے تفتیش کی مگر کوئی بھی حقیقت بتانے پر تیار نہیں تھا۔ ظالم و جاہل چوہدری کا خوف لوگوں کے دلوں پر اس قدر بیٹھ چکا تھا کہ اس کے ظلم کی چکی میں پسنے کے باوجود کوئی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ تھک ہار کر تھانے پہنچ گئے۔ گاؤں دیہاتوں میں عموماً شام ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا ہے، اس وقت اگر چہ رات کے نو بج رہے تھے۔ مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رات آدھی سے زائد بیت چکی ہو۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھانے کے اس کمرے میں خوشی، نوید اختر اور انسپکٹر عارف موجود تھے۔ اس تھانے کا عملہ انسپکٹر عارف سمیت چھ افراد پر مشتمل تھا۔

اجا تک خوشی چوک پڑی کسی عورت کے چننے کی آواز آ رہی تھی۔ ”یہ کس کے چننے کی آواز ہے لگتا ہے

کسی پر ظلم ہو رہا ہے۔“ خوشی مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ”میڈیم یہ اکثر یہاں کا معمول ہے آپ ریلیکس ہو کر بیٹھی رہیں۔ باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔“ انسپکٹر عارف بھائی لیتے ہوئے بولا اسے نیند کی وجہ سے بار بار جھانپنا آ رہی تھیں۔

”تمہارا دماغ تو درست ہے، تمہارے جیسے اگر قانون کے رکھوالے ہوں تو اس ملک کا اللہ حافظ ہے۔“ اسی وقت نسوانی چیخ پھر سنائی دی۔ خوشی تیزی سے تھانے سے باہر نکلی۔ نوید نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ تیزی سے اپنی جیب کی طرف بڑھے، اسی لمحے چیخ پھر سنائی دی ساتھ ہی لگا تار چار پانچ فائر ہوئے انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ تھانے سے کچھ دور ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ آوازیں وہیں سے آ رہی تھیں۔ ”نوید جیب اشارت کرو۔“ خوشی چلائی۔ اور جیب میں چھلانگ لگادی۔ نوید نے جیب اشارت کی، اسی لمحے اس مکان کے قریب سے کسی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا۔ وہ ایک جیب تھی جو تیزی سے ایک طرف دوڑتی جا رہی تھی۔ نوید نے اپنی جیب اس جیب کے تعاقب میں لگادی۔

دونوں جیبیں تیز رفتاری سے آگے پیچھے جاری تھیں۔ عورت کے چننے کی آواز پھر سنائی دی۔ اب وہ جیبیں جیب کے اندر سے گون رہی تھیں۔ اسی وقت جیب سے ان پر بے درپے تین فائر ہوئے۔ نوید نے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا ان کی جیب لہر اکر رہ گئی۔

خوشی نے اپنے ہوسٹر سے پہلے نکالا اور نوید سے گاڑی کی رفتار تیز کرنے کو کہا۔ جیب اب ان سے کچھ فاصلے پر تھی، اسی وقت دو فائر مزید ہوئے، گولیاں ان کی گاڑی کے بونٹ میں لگیں۔

خوشی نے جیب کے پچھلے ٹائروں کا نشانہ لے کر بے درپے دو فائر کئے۔ اس کا نشانہ بے مثال تھا۔ زور دار دھماکے سے جیب کے دونوں پچھلے ٹائر برست ہو گئے۔ تیز رفتار جیب کو جھکا لگا وہ لہر لاتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی سڑک سے اتری اور درختوں میں ہستی چلی گئی۔

بہت سے چھوٹے بڑے پودوں کو توڑنے کے بعد وہ ایک بڑے درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ جیب کے شیشے پکنا چور ہو چکے تھے۔ نوید نے اپنی جیب کو زوردار بریک لگا کر روکا۔ جیب کے رکتے ہی وہ دونوں چھلانگ لگا کر جیب سے اترے اور دوڑتے ہوئے قریبی قد آور درختوں کی آڑ میں چھپ گئے۔

الٹی ہوئی جیب سے سب سے پہلے ایک گرائیل شخص رانقل تھا۔ نوید نے مضطربانہ طور پر جھانک کر اسے دیکھنا چاہا یہ اس کی غلطی تھی جس کی اسے سزا بھگتنا پڑی۔ گرائیل شخص کی رانقل سے نکلنے والی گولی نوید کے شانے میں لگی۔ وہ چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔ نوید کی چیخ سن کر خوشی کا خون کھول اٹھا۔ اس کے پہلے سے نکلی گولی گرائیل شخص کے سینے میں لگی تو وہ چیختا ہوا گر گیا۔

خوشی پھرتی سے جگہ تبدیل کر کے ایک دوسرے درخت کی اوٹ میں چلی گئی۔ اس کی یہی دور اندیشی اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی۔ جیب سے نکلنے والے دوسرے شخص کے ماؤڈر سے نکلنے والی گولی وہاں لگی جہاں چند لمحے پیشتر خوشی موجود تھی۔ خوشی نے فوراً ہی اس کا نشانہ لے کر گولی چلائی۔ گولی اس کے سر پر لگی اور اس کا مغز توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ اس کے غضب کا تیرا نشانہ لنگڑا کر جیب سے باہر نکلا ایک موٹا شخص بنا۔ گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔ الٹی ہوئی جیب سے آخری شخص جو باہر نکلا وہ چوہدری کا دست راست شیرا تھا، خوشی کی چلائی ہوئی گولی نے اس کی کلائی میں سوراخ کر دیا۔ وہ اپنی زخمی کلائی دوسرے ہاتھ سے تھامے پھٹی پھٹی لگا ہونے سے اپنے ہاتھوں سے چھوٹ کر گرنے والے پہلے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تعجب تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی اتنی دیدہ دلیری سے اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دے گا۔ خوشی چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے پہلے کی ٹال کا رخ شیرا کی طرف تھا اور انگلیاں ٹرگر پر۔

جیب سے ایک نوجوان لڑکی باہر نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ شیرا کی آنکھیں یہ دیکھ کر حیرت سے مزید پھیل گئیں کہ اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کرنے والی ایک لڑکی ہے آج تک وہ عورت کو کمزور جان کر اس پر ظلم ڈھاتا چلا آیا تھا۔ اب ایک عورت اس کے سامنے موت کا روپ دھارے کھڑی تھی۔ عورت کا یہ روپ اس کے لئے نیا تھا۔ ”ماردو اس شیطان کو بھی مار دو، اس نے نہ جانے کتنی ہی عورتوں کی عصمت بڑا کر ڈالا ہے کتنے گھر برباد کئے آج میرے باپ بھائی کو قتل کر کے مجھے بھی چوہدری کے ہاتھوں برباد کرنے لے جا رہا تھا۔“ لڑکی اس کے قریب آ کر روٹی ہوئی بولی۔

شیرا کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔ ”مجھے مت مارو، تم جیسا کہو گی میں کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ خوشی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھکھیا رہا تھا۔

”نہیں اسے مت چھوڑنا یہ سانپ ہے اور سانپ کی فطرت ڈنڈا ہے۔ وہ ڈنڈے سے باز نہیں آتا۔ یہ شیرا ہے چوہدری کا دست راست، اسے مار ڈالو۔“ لڑکی دوبارہ چلائی تو خوشی کی انگلیوں کا دباؤ ٹرگر پر بڑھ گیا۔ اس کے پہلے کی گولی شیرا کی پیشانی میں لگی۔ شیرا کا جسم کٹے ہوئے درخت کی مانند گر اور ساکت ہو گیا۔ خوشی تیزی سے نوید اختر کی طرف لپکی۔ نوید بے ہوش پڑا تھا۔ خون اس کے شانے سے بہہ رہا تھا۔ لڑکی کی مدد سے خوشی نے اسے جیب میں ڈالا اور تیز رفتاری سے تھانے کی طرف روانہ ہو گئی۔ تھانے پہنچ کر نوید کو اسپتال بھجوا گیا۔ اغوا کی جانے والی لڑکی کو گاؤں ہی کے ایک شریف گھرانے میں ٹھہرایا گیا۔ دوسرے روز خوشی پولیس پارٹی کے ہمراہ چوہدری کی حویلی جا پہنچی۔

اس وقت چوہدری کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں خوشی انسپکٹر عارف اور پانچ پولیس اہلکاروں کے ہمراہ موجود تھی۔ چوہدری ان کے سامنے سٹبل صوفے پر بیٹھا تھا۔ ”چوہدری صاحب آپ کا دست راست شیرا اور



اس کے پیچھے ایک معصوم لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ کل رات پولیس مقابلے میں ہلاک ہو چکے ہیں، آپ کو تو یہ خبر پہنچ ہی گئی ہوگی۔“ خوشی بولی۔

”یہ جھوٹ ہے پولیس نے جھوٹا الزام لگا کر میرے ملازموں کا ان کاؤنٹر کیا ہے، میں اس کی شکایت اوپر کروں گا۔“ چوہدری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ چوہدری صاحب حکمہ پولیس کی درخواست پر حکومت نے یہ کیس ہمارے جھگے کے حوالے کیا ہے۔ پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے آپ کے ہر کاروں کے قبضے سے غیر قانونی اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ معویہ لڑکی نے بیان دیا ہے کہ آپ کے کہنے پر اسے اغوا کیا گیا تھا۔ اغوا ہونے والی لڑکی کے رشتے دار بھی آپ کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی حویلی کے عقبی سمت تین بے گناہ انسانوں کو زندہ دفن کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس آپ کی حویلی کی تلاشی کا سرچ وارنٹ موجود ہے۔“ خوشی بغیر کسی گھبراہٹ کے بولی۔

”کس کی ہمت ہے جو حویلی کی تلاشی لے۔“ چوہدری بھڑک اٹھا۔

”مسٹر چوہدری حویلی کی تلاشی کا سرچ وارنٹ ہے ہمارے پاس۔“ خوشی نے وارنٹ چوہدری کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”میں کسی وارنٹ کو نہیں مانتا، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم لوگ خیر و عافیت سے چلے جاؤ۔“ وہ غصے سے دھاڑا۔

”چوہدری اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ہم سے تعاون کرو۔ ورنہ ہمیں زبردستی تلاشی لینا پڑے گی۔“ خوشی آسانی سے بولی۔

چوہدری غصے سے اٹھا۔ ”کیا بکواس ہے، میں ابھی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔“ چوہدری نے آئی جی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ”آئی جی کیجیہ اور ہا ہے۔ اب پولیس میرے جیسے وزیر کے گھر کی تلاشی لے گی۔“

”چوہدری صاحب حالات بہت گمبیر ہو چکے ہیں۔ آپ کے علاقے میں پے در پے قتل کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ کئی پولیس والے مارے جا چکے ہیں۔ آپ کے جو بندے پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں ان کے قبضے سے غیر قانونی ہتھیار ملے ہیں معویہ لڑکی اور اس کے رشتہ دار آپ کے خلاف گواہ بن چکے ہیں اگر آپ کے ہاتھ صاف ہیں تو تلاشی دینے میں حرج نہیں، ہمیں اس سلسلے میں اوپر سے سخت احکامات ملے ہیں۔“ آئی جی نے کہا تو چوہدری نے غصے سے رابطہ منقطع کر دیا۔

”تم لوگ تلاشی لے سکتے ہو۔“ چوہدری کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ خوشی انپکڑ اور دوسرے پولیس اہلکار حویلی میں پھیل گئے، تلاشی کی کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی لیکن کوئی غیر قانونی چیز برآمد نہ ہوئی۔ چوہدری کے ملازموں کے پاس جو اسلحہ تھا اس کا انسپکشن موجود تھا، اب خوشی کے حکم پر حویلی کے عقبی سمت کھدائی شروع کر دی گئی۔ جگہ جگہ کھدائی کی گئی مگر یہاں بھی نتیجہ صفر رہا۔ حویلی کلائی بڑی تھی۔ اس کے عقبی سمت کا ایریا بھی کافی طویل و عریض تھا۔ اتنی بڑی جگہ کی مکمل کھدائی ناممکن بات تھی۔ کھدائی کرنے والے پولیس اہلکاروں کے جسم سے مسلسل کھدائی کے باعث پسینہ بہہ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وقت گزر رہا تھا۔

شام چھ بجے کھدائی رکا دی گئی۔ پولیس اہلکاروں کا تھکن سے برا حال تھا۔ خوشی مایوس نظر آ رہی تھی۔ ”اب بولو کیا ملا تمہیں یہ سب کر کے، میں نے کہا بھی تھا کہ یہاں کچھ بھی نہیں۔ تم لوگوں نے مجھے ہراساں کیا۔ کھدائی کر کے میری حویلی کا بیڑا غرق کر دیا۔ میں تم لوگوں پر کیس کروں گا۔“ چوہدری سخت غصے میں تھا۔

خوشی اداس تھی۔ اتنی سخت تلاشی اور کھدائی کے باوجود چوہدری کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملا تھا وہ اس درندے کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے یہ ناممکن تھا۔ حالانکہ اپنی فون کال میں

سیرانے یقینی لہجے میں کہا تھا کہ حویلی کے عقبی سمت میں اس کے مقتول شوہر اور ساس سر کو دفن کیا گیا ہے۔ مایوسی کے عالم میں وہ بے خیالی سے بچلی اور اس کا پاؤں سلب ہوا اور وہ منہ کے بل گرنے لگی، خوشی گرتے ہوئے اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر اپنے چہرے کو چوٹ لگنے سے بچایا۔

اچانک وہ چونک بڑی جہاں اس کا ہاتھ گرتے ہوئے نکرایا تھا۔ وہاں ایک مردانہ گھڑی پڑی تھی۔ خوشی نے اٹھتے ہوئے گھڑی اٹھائی اور بغور اس کا معائنہ کرنے لگی یہ گھڑی اس نے حجاد کو تحفے میں دی تھی۔ یہ جدید طرز کی انتہائی مہنگی گھڑی تھی۔ گھڑی کا بیشک ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید جیمینا چھٹی اور تشدد کے دوران گھڑی حجاد کی کلائی سے ٹوٹ کر گر پڑی تھی جس پر چوہدری اور اس کے کارندوں کی نظر نہیں پڑی۔

چوہدری کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔ ”اس جگہ کھدائی کرو۔“ جہاں سے گھڑی ملی تھی۔ پولیس اہلکاروں نے وہاں کھدائی شروع کر دی۔ تین فٹ کھدائی کر لینے کے بعد وہ احتیاط سے کھدائی کرنے لگے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ان کے ہاتھ رک گئے۔ انسانی جسم ظاہر ہونے لگا تھا۔ اس وقت تک اندھرا چھا چکا تھا۔ حویلی میں چاروں طرف روشنی تھی۔ اب وہ مزید احتیاط سے کھدائی کرنے لگے رات دس بجے کے قریب تینوں لاشیں زمین سے نکال لی گئیں لاشوں کی حالت بہت خراب تھی۔ بدبو کے پھسکے اٹھ رہے تھے۔

”چوہدری صاحب آپ خود کو قانون کی حراست میں سمجھیں۔“ انسپکٹر بھٹنڑی نے کرچوہدری کی طرف بڑھا۔

اچانک بے در پے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی انسپکٹر کی پیشانی میں لگی۔ تو وہ بنا آواز نکالے زمین پر گر گیا۔ بقیہ پولیس اہلکار سینے پر گولیاں کھا کر زمین پر گر گئے۔ ”خبردار لڑکی کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے جسم میں بھی گولی اتاری جائے گی۔“ ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ خوشی نے سر گھما

کر دیکھا اسے چوہدری کے نصف درجن مسلح اہلکاروں نے گھیر رکھا تھا۔ ”لاشوں کو دوبارہ دفن اداوان لاشوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے اس لئے کھدائی ذرا زیادہ کرنا اور اس لڑکی کو تہہ خانے میں لے جا کر بند کر دو کچھ دیر بعد میں اس سے ملوں گا جب تک میں شغل کروں۔“

چوہدری اپنی موچکوں کو تادڑ بیٹا ہوا دھان سے چلا گیا۔ خوشی کو راتقلوں کی زد میں تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ہولسٹر سے پستل نکال لیا گیا تھا۔ اب خوشی بنا کسی ہتھیار کے اس خونی تہہ خانے میں قید تھی۔ جہاں نہ جانے کتنے بے گناہوں کی زندگی کے چراغ گل کر دیئے گئے۔ خوشی کو اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ بدترین گھڑی آن پہنچی جس کے اندیشوں نے خوشی کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور چوہدری اندر داخل ہوا۔ چوہدری نے عقابانی نظروں سے خوشی کا جائزہ لیا۔ ”تمہارے ساتھیوں کو باعزت طریقے سے حویلی کے عقبی حصے میں دفن کر دیا ہے۔ اب بہت جلد تمہیں بھی ان کے پاس بھجوا دوں گا۔“ اس نے خوشی کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم یہ تو بتاؤ تم میرے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو؟“

”سیرانام کی جس لڑکی پر تم نے ظلم ڈھائے ہیں وہ لڑکی میری بہن ہے۔“

”اوہ جب تم یہ سب جانتی ہو تو یہاں آنے کی حماقت کیوں؟ تمہاری بہن تو بچ کر بھاگ گئی پر تم نہیں بچ سکو گی۔“ چوہدری حینانہ انداز میں ہنسا۔

”چوہدری تمہاری عقل پر ماتم کرنے کو دل کر رہا ہے۔ آج کا دن تمہاری بد نصیبی کے آغاز کا دن ہے۔ آج کے دن تم غلط وقت پر غلط جگہ پر اپنی مصیبت کو دعوت دے بیٹھے ہو۔ تمہیں میرے سامنے اکیلے نہیں آنا چاہئے تھا۔ ہر لڑکی تر والہ نہیں ہوتی، میں کوئی عام لڑکی نہیں حساس ادارے کی افسر ہوں۔“ خوشی نے ترشی سے جواب دیتے ہوئے اپنی پوزیشن واضح کی۔ چوہدری نے اپنے ہولسٹر سے ریولور نکالنا چاہا



مگر اس کی یہ حسرت اس کے دل میں رہ گئی۔ خوشی بجلی کی طرح اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس نے فضا میں قلابازی کھائی اور چوہدری کے سینے پر فلائنگ کلک ماری۔ چوہدری اچھل کر دور جا کر ابھی وہ بمشکل اٹھائی تھا کہ خوشی کی اپیلن کلک اس کے جڑے سے لکرائی چوہدری کی نگاہوں کے سامنے ستارے سے رقص کرنے لگے اس نے چیختے ہوئے اپنے خون آلود جڑے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ خوشی کی زوردار جھپ سائیڈ کلک چوہدری کے سینے پر لگی چوہدری الٹ کر چیخا ہوا گر گیا اسے یوں محسوس ہوا ہاتھ کی جیسے اس کی کئی پھلیاں ٹوٹ گئی ہوں وہ بری طرح خوشی سے پٹ رہا تھا۔ اس نے چند منٹ میں لاتوں اور گھونٹوں سے چوہدری کی خاطر خواہ تواضع کی تھی۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ”بچاؤ۔ بچاؤ۔“ وہ مدد کے لئے چیخ پکار کر رہا تھا۔

اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور نصف درجن رائفل بردار اندر داخل ہو گئے اندر کا منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ چوہدری فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا اور چیخ چلا رہا تھا اور خوشی بے دردی سے اس کے جسم پر ٹھوکریں برسا رہی تھی۔ ”رک جا لڑکی۔“ ایک رائفل بردار چلایا۔ ان کی انگلیوں کی گرفت ٹریگر پر سخت ہونے لگی۔ خوشی نے خونی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور ایک طرف ہٹ گئی۔ نصف درجن رائفل برداروں کے سامنے خالی ہاتھ مزاحمت حماقت تھی۔ انہوں نے خوشی کو رسیوں سے باندھ کر بیڈ پر پھینکا۔ چوہدری بمشکل اٹھا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔

”چوہدری صاحب اگر اجازت ہو تو اسے جان سے مار دوں۔“ ایک رائفل بردار نے خوشی کی طرف رائفل کی نال کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں اوئے کچھ گھنٹوں کی بات ہے۔ میری طبیعت ذرا سنبھل جائے۔ میں اس کی ساری کسر نکالوں گا۔ اب تو یہ بندھی ہے کیسے ہاتھ پیر چلائے گی۔“ چوہدری اپنے ہلکا روں کے سہارے چلتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

خوشی بے بس پڑی آنے والے وقت کی تکینگی کا اندازہ کرنے لگی۔ پہلے تو وہ آزاد تھی اس لئے چوہدری کو چھٹی کا دودھ یاد کروادیا۔ اب وہ رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ کچھ گھنٹوں بعد تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور چوہدری اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی سوچا ہوا تھا۔ چوہدری اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا خوشی کی طرف بڑھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک ابر آلود رات تھی۔ ہلکی بوندا بوندا ہوری تھی۔ گاہے بہ گاہے بوندا بوندا رک جاتی پھر برسنے لگتی۔ یاسر کے دل کا موسم بھی عجیب ہو رہا تھا۔ سیرا اسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ اور دل گھٹنے لگتا تھا کہ کیا سمیرا ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو جائے گی۔ تاریک رات میں تیز ہوانے ایک بار پھر سائیں سائیں کرنا شروع کر دیں۔ بادل زور زور سے گرجنے لگے۔ اس کے ذہن میں بھی آندھیوں کے جھگڑ چل رہے تھے۔ سمیرا کی حماد سے شادی کے بعد وہ بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ اس روز تیز بخار کے سبب بے ہوش ہو گیا اور کئی روز اسپتال میں ایڈمٹ رہا۔ ان دنوں اسے ہر طرف سمیرا دکھائی دیتی تھی۔ اس روز شام پانچ بجے وہ گھر پر اکیلا تھا۔ گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی یاسر نے اٹھ کر دروازہ کھولا دروازے میں ایک سولہ سالہ معصوم لڑکی کھڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ لڑکی تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔

”جی فرمائیے!“ یاسر اسے الجھن زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”یاسر صاحب میرا نام افشین ہے، میں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچی ہوں، آپ کی محبت سمیرا خطرے میں ہے، چوہدری نے اس کے شوہر اور سر کو قتل کر کے اسے اغوا کر لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے عزت بجا کر وہاں سے بھاگی اور چوہدری کے بھائی ڈاکٹر حاتم کے ہتھے جا چھی جس نے اسے قید کر لیا

ہے۔“ افشین بولی۔

”مس افشین آپ کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں اور جس گاؤں کا آپ ذکر کر رہی ہیں وہ کہاں ہے؟“ یاسر نے بے تابی سے پوچھا۔

”افشین اسے گاؤں کا ایڈریس بتا کر بولی۔ ”میں اسی گاؤں کی رہائشی ہوں اور فضل دین کی بیٹی ہوں۔ میں بھی چوہدری حاکم کے مظالم کا شکار ہوئی۔“ افشین نے کہا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گئی۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے پورے گاؤں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یاسر تیز قدموں سے کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ رات کے اس مہیب سنائے میں سب گھروں میں سوئے پڑے تھے۔ صرف کتوں کے بھونکنے کی بے سری آواز آ رہی تھی جو بھونک کر گاؤں والوں کو کسی اجنبی کی آمد کی اطلاع دے رہے تھے۔ چلتے چلتے یاسر کے سامنے ایک چکی اینٹوں سے بنا مکان آ گیا اس نے بنا سوچے سمجھے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ مگر دروازہ نہ کھلا اس نے مسلسل دستک دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ تقریباً دس منٹ بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا شخص باہر نکلا۔ ”کیا بات ہے پتر؟“ بوڑھے نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

”میں افشین سے ملنا چاہتا ہوں جو فضل دین کی بیٹی ہے۔“

بوڑھے نے یاسر کو عجیب نظروں سے گھورا۔ ”افشین اور اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے پتر۔“ یاسر سنائے میں آ گیا۔ ”کب کیسے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اسے دنیا سے گزرے ایک سال بیت چکا ہے۔ چوہدری نے اسے اغوا کر لیا تھا، باپ اور بھائی نے مزاحمت کی تو چوہدری نے سب کو قتل کر دیا۔“ افشین کی عزت لوٹ کر اس نے اسے اپنے کارندوں کے حوالے کر دیا، اس کے کارندوں نے افشین کو نوچنے کھونٹنے کے بعد بے دردی سے قتل کر دیا۔“

بوڑھے کے منہ سے داستان سن کر یاسر چکر کر رہ گیا۔ اس نے بوڑھے کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھتے ہیں۔

”بابا تین روز پہلے افشین مجھے شہر میں ملی تھی یہ تم کب کی بات کر رہے ہو؟“ یاسر بولا۔

”میں نے بتایا نا کہ سال بھر پہلے کی بات ہے۔“ بوڑھے کے جواب نے یاسر کے ہوش اڑا دیے۔ اس کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ ابھی چند دن پہلے تو افشین اس سے ملی تھی وہ کون تھی وہ چکر کر رہ گیا۔

”اچھا آپ مجھے چوہدری کی حویلی کا پتہ بتا دیں۔“ بوڑھا تفصیل سے اسے حویلی کا ایڈریس سمجھانے لگا۔ یاسر بوڑھے سے رخصت ہو کر تیز قدموں سے حویلی کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ انہونی ہو چکی تھی۔ ایک روح اس سے ملنے آئی تھی۔ ”وہ تیز تیز قدموں سے تقریباً گھما گیا ہوا چل رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ حویلی کی پشت پر موجود تھا۔ حویلی کی دیواریں کافی اونچی تھیں۔ وہ فوج کا کمانڈو تھا۔ اونچی دیواریں پھلانگنا اس کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ چنانچہ چند لمحوں بعد ہی دیوار پھلانگ کر حویلی کے اندر موجود تھا۔

رات نصف سے زائد بیت چکی تھی حویلی میں سنانا چھایا ہوا تھا۔ یاسر کے جسم پر موجود دونوں ہولسٹرز میں پستل موجود تھے اس نے دونوں ہولسٹرز سے پستل نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں قیام لئے اور دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چوکنے انداز میں چل رہا تھا۔

اچانک اسے رکنا پڑا۔ ایک رائفل بردار اس کی طرف پشت کئے چوکنے انداز میں کھڑا تھا۔ یاسر نے پستل اپنے ہولسٹر میں رکھے اور کرائنگ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ رائفل بردار سے کچھ فاصلے پر رک کر اس نے اپنی پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکالا اور پھرے دار کے قریب پہنچ کر پھر پی سے کھڑا ہو گیا۔ ہلکی سی آہٹ



کیاس اٹھا کر پہن لیا۔ ”کون ہو تم اور سب کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔“

”باپو جی کیا کریں۔ میں یہاں ملازمہ ہوں۔ یہ چوہدری کے کارندے ہیں۔ انکار کرنے پر بھی نہیں چھوڑتے۔ زبردستی کرتے ہیں۔“ عورت بے بس لہجے میں بولی۔

”حویلی میں کتنے افراد موجود ہیں؟“ یاسر نے پوچھا۔

”چوہدری سمیت سات افراد ہیں۔“ لڑکی سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

یاسر نے اندازہ لگایا۔ چوہدری کے علاوہ حویلی کے تمام افراد مارے گئے۔ ”چوہدری کہاں ہے؟“

”چوہدری صاحب تہہ خانے میں ہیں۔“ وہ گولیوں کی آواز سن کر تہہ خانے سے باہر کیوں نہیں آیا؟“ یاسر نے حیرت سے پوچھا۔

”تہہ خانے سے کسی قسم کی آواز باہر نہیں سنائی دیتی نہ ہی باہر کی آواز اندر جاتی ہے۔“ عورت نے جواب دیا۔

یاسر سمجھ گیا۔ تہہ خانہ ساؤنڈ پروف ہے۔ ”چلو مجھے تہہ خانے تک لے چلو۔“ یاسر نے اسے پہل کی نال سے اشارہ کیا۔ لڑکی اسے لئے ہوئے تہہ خانے کے دروازے پر جا پہنچی۔ ”تم یہیں کھڑی رہو۔“ یاسر نے کہا اور دروازہ کھولا۔ خوش قسمتی سے دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ چوہدری کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس کی حویلی میں گھس کر اس کے اہلکاروں کی لاشیں بچھا کر تہہ خانے تک آ سکتا ہے۔ یاسر جیسے ہی اندر داخل ہوا ٹھٹک گیا۔ ایک لڑکی بیڈ پر بندھی پڑی تھی۔ چوہدری اس کے قریب کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سن کر چوہدری مڑا اور حیران رہ گیا۔ دروازے پر ایک نوجوان پہل اس کی طرف تانے کھڑا تھا۔

چوہدری نے اپنے ہوسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ یاسر وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑا۔ اس نے

نے رائفل بردار کو ہوشیار کر دیا۔ اس نے پلٹنا چاہا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ یاسر نے ایک ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جمادیا اور دوسرے ہاتھ سے تیز دھار خنجر اس کی شہہ رگ پر چلا دیا۔ اس کی شہہ رگ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا اور اس کا جسم تڑپنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا تو یاسر نے اسے آہستگی سے اٹھا کر دیوار کی آڑ میں لٹا دیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اس دوران وہ خنجر اپنی پٹلی سے باندھ کر ہوسٹر میں سے پہل نکال کر ہاتھ میں لے چکا تھا۔

اچانک غیر متوقع طور پر دو مسلح افراد اس کے سامنے آ گئے یاسر کو دیکھ کر انہوں نے اپنی رائفلوں کو پھرتی سے سیدھا کرنا چاہا مگر وہ یاسر کی تیزی کا مقابلہ نہ کر سکے حویلی گولیوں کی آوازوں اور ان کی آخری چیخوں سے گونج اٹھی ایک طرف سے تین افراد رائفلیں تھامے باہر نکلے انہوں نے یاسر کی طرف رائفلیں سیدھی کر کے فائر کئے۔ یاسر نے پھرتی سے چھلانگ لگائی اور فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا ایک طرف گرا۔ گرتے ہی پے درپے فائر کئے یہاں بھی اس کی بے مثال نشانہ بازی کام آئی۔ وہ تینوں افراد جھنجھے ہوئے جہنم واصل ہو گئے۔ حویلی کے درندوں کی بد قسمتی تھی کہ آج ان کے مقابل فوج کا مانا ہوا کمائنڈو تھا جو قہر اور غضب کی علامت بنا ہوا تھا۔

یاسر اس وقت کوریڈور میں محتاط انداز میں دوڑ رہا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے باہر نکلتا چاہا مگر یاسر کے پہل سے نکلنے والی گولی نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ یاسر دروازے پر لات مار کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں گندی رنگ کی حامل ایک مناسب جسم کی مالک عورت کھڑی تھی۔ یاسر نے اس کی طرف دیکھتے ہی اپنا چہرہ دوسری طرف گھما دیا۔ عورت برہنہ حالت میں بھی شاییدہ کمرے سے نکلنے والے مرد کے ساتھ عیاشی کر رہی تھی۔ میز پر ایک طرف شراب کی بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ ”اپنے کپڑے پہن لو۔“ یاسر سرد لہجے میں بولا۔ عورت نے جلدی جلدی بیڈ پر پھر پڑا اپنا



چوہدری پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ چند لمحوں بعد ہی چوہدری تہہ خانے کے فرش پر ادھ موا پڑا تھا۔ یاسر نے چوہدری کو پاؤں سے ہلا جلا کر دیکھا اور اندازہ کر لیا کہ چوہدری اب بے ہوش ہو چکا ہے۔ اس نے خوشی کو کھولا۔ ”صینکس! آپ نے مجھے بچایا ویسے آپ ہیں کون اور یہاں کیسے پہنچے؟“

”میرا نام یاسر ہے اور تعلق آری سے ہے، اس سلطان نے میری ایک دوست سمیرا کو اغوا کیا تھا۔ جو اس کے چنگل سے بھاگ کر اس کے بھائی کے ہتھے جا چڑھی، میں اس سے اس کے بھائی کا ایڈریس پوچھنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ میرا ارادہ تھا اس پر نارچہ کر کے اس کے بھائی کا پتہ معلوم کروں گا، اس کے تمام کارندوں کو واصل جہنم کر چکا ہوں، اب اس کی باری ہے، تاکہ یہ دوبارہ کسی پر ظلم نہ کر سکے، اب آپ بتائیں آپ کون ہیں؟ اور اس شیطان کے نرغے میں کیسے آ گئیں؟“

”میرا نام خوشی ہے میرا تعلق ایک حساس ادارے سے ہے۔ سمیرا میری بہن ہے، میں یہاں سمیرا کی تلاش اور ایک مشن پر آئی ہوں۔“ خوشی نے اپنی روداد سے سنا ڈالی۔

”اچھا تو آپ سمیرا کی باجی ہیں۔“  
”تمہاری سمیرا سے کب دوستی ہوئی؟“ خوشی نے پوچھا۔

وہ میری کلاس فیلورہ چکی ہے۔“ یاسر نے بات بنائی۔ خوشی نے اندازہ لگالیا کہ یاسر جھوٹ بول رہا ہے اس کا لہجہ چغلی کھارہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ شاید دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ لیکن پھر سمیرا نے چپ چاپ شادی کیوں کر لی گھر والوں کو بتایا کیوں نہیں کروہ کسی سے پیار کرتی ہے باتوں کے دوران یاسر کو چوہدری کا خیال آیا اس نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ چوہدری رپو اور ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ خوشی کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ ”اب تم دونوں بھی جہنم میں جاؤ گے۔“ اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز

سنائی دی۔ چوہدری نے مڑ کر دیکھا چاہا، یاسر کے لئے یہی لمحہ اہم تھا۔ پھرتی سے ہولستر سے پٹل نکال کر گولی چلا دی مگر گولی چوہدری کے سینے میں دل کے مقام پر لگی، وہ بنا آواز نکالے جہنم رسید ہو گیا۔ چوہدری کے پیچھے دروازے میں وہ عورت کھڑی تھی جو اس کی ملازمت تھی۔ ”وہ جی میں نے سوچا بہت دیر ہو گئی ہے، جھانک کر دیکھ لوں۔“ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا اور یاسر کے لب مسکرائے۔

☆.....☆.....☆

خوشی اور یاسر پچاس کے قریب پولیس کمانڈوز کے ہمراہ مختار انداز میں آگے بڑھ رہے تھے ان کی آنکھوں پر مخصوص ساخت کے گلاسز موجود تھے جن کی وجہ سے اندھیرے میں بھی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ خوشی کے چہرے پر نقاب بندھا ہوا تھا اس نے جیز کی پیٹ اوپنل آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ لیکن اس گھنے جنگل میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رات آدھی سے زائد بیت چکی ہو، چاروں طرف سے مختلف اقسام کے جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گھنے جنگل میں داخل ہوتے ہی وہ دودو کی ٹولیوں میں ہٹ کر آہستگی سے آگے بڑھنے لگے تھے۔ دو درمیانے قد کے پولیس کمانڈوز جو دائیں سمت بڑھ رہے تھے کہ اچانک چونک پڑے۔ ایک طرف کھنی جھاڑیوں سے چار عدد توپ بیکل بندر نکلتے دکھائی دیے۔ وہ دونوں حیرت سے بندروں کی طرف دیکھنے لگے۔ چاروں بندروں کے کندھے سے جدید طرز کی رائفلیں موجود تھیں۔ بندروں کا رخ ان کی طرف تھا۔ ابھی وہ ان سے کچھ فاصلے پر تھے کہ بندروں نے اپنی اپنی کلائی اپنی نظروں کے سامنے کی حیرت کی بات یہ کہ ان کی کلائیوں پر گھریاں موجود تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ وقت دیکھ رہے ہوں۔ اسی وقت انہیں اپنے جسم میں سوئی کی چیچن کا احساس ہوا۔ اور دونوں کمانڈوز کے حواس ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ایک طرف سے ادھر آتی خوشی اور یاسر نے دونوں

کمانڈوز کو گرتے دیکھا اور بندروں کے کندھوں پر موجود رائفلوں کو دیکھا اسی وقت بندروں نے رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لے لیں۔ خوشی نے ماؤز رکارخ بندروں کی طرف کر کے ٹیگر دبا یا، لگا تار چار فائر ہوئے چاروں بندر کریمہ انداز میں چیختے ہوئے گرے۔ گولیاں ان چاروں کے سر میں لگی تھیں۔ خوشی اور یاسر دوڑتے ہوئے بندروں کے قریب پہنچ گئے نیچے پڑے کمانڈوز کا معائنہ کیا اور سکون سے گہری سانس لی، وہ دونوں زندہ تھے صرف بے ہوش ہوئے تھے۔

”حیرت ہے یہ دونوں بے ہوش کیسے ہوئے۔“ وہ دونوں مردہ بندروں کی طرف لپکے چاروں بندروں کی کلائی میں گھڑی تھی۔

”خوشی حیرت اور تعجب سے اس عجیب ساخت کی گھڑی کا معائنہ کر رہی تھی اسی اثناء میں آٹھ کے قریب کمانڈوز بھی وہاں پہنچ گئے۔“ میں سمجھ گئی۔“ خوشی پر جوش انداز میں بولی۔ ”اس گھڑی میں ایسا میکینزم سیٹ کیا گیا ہے کہ اس میں موجود باریک سی سوئی انتہائی تیز رفتاری سے کافی فاصلے پر موجود کسی بھی جاندار کے جسم میں پیوست ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں سوئی میں انتہائی زود اثر بے ہوشی کی دوائی ملی ہوگی جو انسان کو سینکڑوں میں بے ہوش کر دیتی ہے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان بندروں کے پاس جدید اسلحہ اور ایسی جدید ساخت کی گھڑیاں کیسے آئیں اور یہ بندر انہیں اتنی مہارت سے کیسے استعمال کرتے ہیں۔“ خوشی نے تبصرہ کیا۔

”دو کمانڈوز بے ہوش افراد کو ہوش میں لانے کی کوشش کریں اور بتایا آگے روانہ ہوتے ہیں۔“ یاسر بولا اور وہ لوگ آگے بڑھ گئے اچانک تڑتڑا ہٹ کی آواز سنائی دی ایسا لگا کئی مشین گنیں ایک ساتھ چلی ہوں، ان سے آگے چلنے والے کئی کمانڈوز چیختے ہوئے زمین پوس ہو گئے۔ گولیاں نامعلوم مقام سے آئی تھیں۔ خوشی اور یاسر پھرتی سے ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ ”سمجھ نہیں آتا یہ گولیاں کہاں سے

آئیں؟“ یاسر نے کہا۔

اسی وقت ایک طرف سے چار کمانڈوز برآمد ہوئے اس سے پہلے کہ خوشی اور یاسر انہیں روکتے مشین گنیں ایک بار پھر گر جیں وہ چاروں بھی اپنے فرض پر قربان ہو گئے اس بار خوشی اور یاسر دونوں نے دیکھا تھا کہ گولیاں سامنے کی جھاڑیوں سے چلائی گئی تھیں۔ گولیاں چلانے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔ ”لگتا ہے خود کار گنیں ہیں، لیکن انہیں آپریٹ کون کر رہا ہے اور کہاں سے کر رہا ہے؟“ خوشی تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

ان کے ارد گرد سے قدموں کی چاپ سنائی دی انہوں نے پلٹ کر دیکھا پولیس کمانڈوز بھی ادھر ہی کا رخ کر رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر وہ بھی سکتے میں آ گئے۔ ”آگے مت بڑھنا سامنے موجود جھاڑیوں میں خود کار گنیں نصب ہیں جنہیں کسی خفیہ مقام سے آپریٹ کیا جا رہا ہے۔ سب لوگ اس طرح درختوں کی آڑ میں چھپے رہیں۔“ خوشی نے چلا کر مذبح بن جانے والے کمانڈوز کو خبردار کیا۔ اسی لمحے نصف درجن کمانڈوز نے جذبات میں آ کر غلطی کی ان کے ہاتھوں میں ہینڈ گریینڈ موجود تھے جو انہوں نے پن کھینچنے کے بعد سامنے جھاڑیوں میں اچھال دیئے، ان کے سامنے آتے ہی خود کار گنیں گر جیں اور وہ نصف درجن کمانڈوز چیختے ہوئے زمین پر گر گئے، ان کے ہاتھوں سے اچھالے ہوئے ہینڈ گریینڈ سامنے موجود جھاڑیوں میں گرے، پورے ساعت شبنم دھماکے ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد خوشی آہستگی سے باہر نکلی اور کرائنگ کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس پر فائرنگ نہیں ہوئی۔ پیچھے رہ جانے والے افراد بھی ہمت کر کے درختوں کی آڑ سے نکلے اور خوشی تک جا پہنچے۔ اس کا مطلب ہے شہید ہونے والے کمانڈوز کی قربانی رنگ لائی ہے اور خود کار گنیں تباہ ہو گئی ہیں۔“ خوشی اپنے ساتھ کرائنگ کر کے چلتے ہوئے ایک کمانڈوز سے کہہ رہی تھی۔



کچھ دیر بعد انہیں دور ایک وسیع عمارت دکھائی دی۔ ”گلتا ہے ڈاکٹر حاتم کا گھناٹہ یہی ہے اور یہاں ہونے والے پراسرار واقعات کا ذمہ دار بھی ڈاکٹر حاتم ہی ہے۔“ خوشی نے کہا۔

اسی وقت ایک درخت کے اوپر سے راتقل گرجی، آگے چلنے والے تین کمانڈوز چینیخیں مارتے ہوئے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، یاسر اور دیگر کمانڈوز نے آواز کی سمت فائر کئے، درخت سے تین بندر کریمہ آواز میں چیختے ہوئے گرے۔ اب وہ مزید احتیاط سے کرائنگ کرتے ہوئے نہایت آہستگی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ عمارت اب انہیں واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ سرخ رنگ کی وسیع وعریض عمارت چاروں طرف سے جھاڑیوں اور درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ اچانک فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ”تم سب کے لئے آخری وارنگ ہے، اپنی جان بچا کر یہاں سے نکل جاؤ، اس کے بعد تمہیں اس کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ تم لوگ ڈاکٹر حاتم کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے، اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ، میری جنت ناقابل تخییر ہے۔“

”ڈاکٹر حاتم ہم مسلمان سپاہی ہیں موت سے نہیں ڈرتے تم نے بہت سی انسانی زندگیاں برباد کی ہیں، ہم تمہیں کیفر کردار تک پہنچا کر جائیں گے۔“ یاسر نے بلند آواز سے پر عزم لہجے میں کہا۔ ”اب تم لوگ یہیں ٹھہرو ہم دس کمانڈوز آگے جاتے ہیں۔“ کمانڈوز کا انچارج بولا اور دس افراد کے ہمراہ کرائنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی وہ عمارت کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اس طرف جھاڑیوں سے دو خود کار گنیں تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ گولیاں برسائے لگیں فضا کمانڈوز کی چیخوں سے گونجی اُرد گرد کی زمین پر ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آنے لگے۔ درندہ صفت ڈاکٹر حاتم نصف سے زائد کمانڈوز کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

خوشی ذہین ترین سیکرٹ ایجنٹ تھی اور زندگی میں پہلی دفعہ اس کا واسطہ ایسے خطرناک مجرم سے پڑا

تھا۔ اس مشن میں حقیقت میں اس کے ذہن پر ناقابل فراموش بوجھ تھا۔ ”اگر ڈاکٹر حاتم کے حملے کا سیاق ہوتے رہے تو یہ مشن ناکام ہو سکتا ہے۔ اب ہم لوگوں کو کافی محتاط رہنا پڑے گا۔ ڈاکٹر حاتم انتہائی خطرناک اور ذہین مجرم گلتا ہے، اس عمارت کے ارد گرد ایسے آلات نصب ہیں کہ ڈاکٹر حاتم کو ہماری ہر حرکت کی خبر ہو جاتی ہے۔ وہ سائنس دان بھی ہے، اس پر قابو پانا کافی مشکل لگ رہا ہے، خیر ہم بھی ہمت نہیں ہاریں گے، میں قسم کھاتی ہوں کہ اس مشن کو کامیاب کئے بغیر واپس نہیں لوٹوں گی، آپ لوگ بھی یہ تصور کر لیں کہ اس مشن کی کامیابی کے لئے ہم نے اپنی کشتیاں جلادی ہیں، یا تو ہم یہیں جان دے دیں گے یا اس مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔“ خوشی پر عزم لہجے میں بولی۔

”اب میں اور یاسر ہینڈ گرنیڈ لے کر آگے جائیں گے ہم نے وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں خود کار گنیں نصب ہیں، آپ لوگ یہیں رہیں۔“ وہ دونوں ہینڈ گرنیڈ لے کر کرائنگ کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک چوڑے درخت کی آڑ میں ہو کر ارد گرد کا معائنہ کرنے لگے، کچھ دیر بعد انہوں نے انتہائی مہارت سے پے در پے سات، آٹھ ہینڈ گرنیڈ جھاڑیوں میں پھینکے، جہاں ان کے خیال میں خود کار گنیں نصب تھیں، دھماکوں سے زمین لرز اُچی چاروں طرف گرد و غبار چھانے لگی، وہ دونوں پلٹے اور درختوں کی آڑ میں ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

اچانک ایک طرف جھاڑیوں سے کمانڈوز پر فائرنگ ہوئی۔ کمانڈوز میں ہل چل مچ گئی۔ اس حملے میں تین کمانڈوز مزید مارے گئے۔ پلٹ کر درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے کمانڈوز نے جھاڑیوں کی سمت لگاتار فائرنگ کی۔ جھاڑیوں سے بندروں کی بھیجا تک چیخیں سنائی دیں۔ یاسر اور خوشی محتاط انداز میں جھاڑیوں کی طرف لپکے۔ فائرنگ دونوں طرف سے رک چکی تھی۔ جھاڑیوں میں نصب درجن بندر مرے پڑے تھے ان کے جسم گولیوں سے چھلتی ہو رہے تھے۔ اب وہ دوبارہ

آہستگی سے عمارت کی طرف بڑھے اس بار کوئی بھی فائر ان پر نہ ہوا۔ ”گلتا ہے خود کار گنوں کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے۔“ ابھی وہ عمارت کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھے کہ ارد گرد کے درختوں سے ان پر فائرنگ ہوئی، اس حملے میں تین کمانڈوز مزید اپنے فرض پر قربان ہو گئے۔ ”خوشی یاسر اور دیگر کمانڈوز نے آواز کی سمت فائر کئے۔ بندروں کی بھیجا تک چیخیں سنائی دیں اور خاموشی چھا گئی یہ تقریباً آٹھ کے قریب بندر تھے جن کے گولیوں سے چھلتی مردہ جسم درختوں سے گرے تھے۔ اب وہ سب مختلف درختوں کی آڑ میں چھپے تھے۔

اچانک ڈاکٹر حاتم کی بھاری آواز ایک بار پھر گونجی۔ ”تم لوگوں نے میری برسوں کی محنت ضائع کر دی۔ ان مارے جانے والے بندروں پر میں نے بہت محنت کی تھی۔ تم نے میری عمر بھر کا سرمایہ ختم کر دیا۔ اب اگر تم میں سے کوئی آگے بڑھا اور عمارت کے دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو میں میرا نکل فائر کر دوں گا یہ میزائل تمہارے شہر کو ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے منادیں گے۔“ ڈاکٹر حاتم کے الفاظ سن کر وہ سکتے میں آ گئے۔

اپنی زندگی کی انہیں پرواہ نہیں تھی لیکن وطن عزیز پر آج آئے۔ یہ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے ان کے ساتھی کمانڈوز کی تعداد بھی پندرہ کے قریب رہ گئی تھی۔

اچانک خوشی چونگی عمارت کے قریب جھاڑیوں سے سیاہ لباس میں ایک نقاب پوش نکل رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر سیاہ رنگ کا لباس موجود تھا۔ چہرے پر ماسک کی طرح نقاب تھا۔ نقاب پوش کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی نے یاسر کو اشارہ کر کے سمجھا دیا۔ ”درخت کے پیچھے چھپے رہو اس پر فائر مت کرنا۔“ نقاب پوش بڑی مہارت سے کرائنگ کرتے ہوئے اس درخت کے قریب سے گزرنے لگا۔ جہاں وہ لوگ چھپے ہوئے تھے اسی وقت خوشی کے اشارے پر یاسر نے اسے درخت کی آڑ میں گھسٹ لیا۔ یاسر کا ایک ہاتھ نقاب پوش کے منہ پر تھا اور دوسرے ہاتھ

سے وہ نقاب پوش کی گردن کی رگوں کو مخصوص انداز سے مسل رہا تھا۔ نقاب پوش ہاتھ چلا کر خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ خوشی نے آگے بڑھ کر اس کی کینٹی پرنٹ مخصوص انداز سے گھونٹ مارا۔ نقاب پوش بے ہوش ہو گیا وہ دونوں اسے گھسٹ کر ایک طرف لے جانے لگے۔ ایک طرف کھائی نما چھوٹا سا گڑھا تھا۔ وہ دونوں اسے لئے گڑھے میں اتر گئے۔

”اب میں اسے ہوش میں لا رہی ہوں، تم پہلے اس پر تان لو۔“ خوشی آہستگی سے بولی اور اس کی کینٹی پرنٹ موجود رگوں کو مخصوص انداز سے ملا۔ نقاب پوش کچھ ہی دیر میں ہوش میں آ گیا۔ یاسر نے اپنا پہل اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ نقاب پوش نے ہوش میں آتے ہی یاسر کے ہاتھ میں موجود پہل کو دیکھا جس کی نال اس کی پیشانی پر اور ٹیگر پر یاسر کی انگلی موجود تھی۔ ”سنو مشر! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تم سے چند سوالات کئے جائیں گے اگر صحیح جواب دیا تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے اگر جھوٹ بولا تو گولی تمہارا مقدر ہوگی! اب بتاؤ مرو گے یا ہمارے سوالات کے جواب دے کر زندہ رہو گے۔“ خوشی سرد لہجے میں بولی۔

”پوچھو! وہ تھوک نکل کر بولا۔“

”اس عمارت میں اس وقت کتنے افراد موجود اور کون کون ہیں؟“ خوشی نے پہلا سوال کیا۔

”ڈاکٹر حاتم، ڈاکٹر کامران، ڈاکٹر جمشید اور دس عدد میرے جیسے نقاب پوش ہیں۔“

”خطرناک بندر کتنے باقی بچے ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ کیا انہیں ڈاکٹر حاتم نے ٹریننگ دی ہے؟“ خوشی نے پوچھا۔

”بندر سب مارے جا چکے ہیں اس بات پر ڈاکٹر بہت غصے میں ہے۔ ڈاکٹر کا سب سے بڑا ہتھیار یہ بندر تھے جو تقریباً میں کے قریب تھے انسان کا دماغ بندر کی کھوپڑی میں منتقل کرنے کے بعد وہ شبی طریقے سے بندر میں ایسی تبدیلیاں لاتا تھا جو حیرت انگیز تھیں یہ بندر انسانوں کی طرح بولتے تھے۔ سوچتے تھے ڈاکٹر



کے ہر حکم پر عمل کرتے تھے ہر قسم کا اسلحہ چلانے میں ماہر تھے، یہ تجربہ گاہ اب بھی ناقابلِ تخریب ہے، اگر تم لوگ اندر جانے کا سوچ رہے ہو تو یہ تمہاری حفاظت ہے وہاں بے حد حفاظتی انتظام ہیں، ایسا میزائل سسٹم ہے کہ ایک اشارے پر پورا شہر کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔

”اچھا یہ بتاؤ، یہ حقیقت کیا ہے؟ میں نے کہیں سے سنا ہے کہ ڈاکٹر نے خود ساختہ جنت بنا رکھی ہے۔“

خوشی نے پوچھا۔

”وہ بہت خوب صورت جگہ ہے جہاں ملک بھر سے لائی گئی درجنوں خوب صورت لڑکیاں جمع ہیں۔ ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔“

”تم کس لئے باہر آئے تھے۔“ اس بار یاسر نے پوچھا۔

”تم نے جو ہم پھینکے تھے اس سے خود کار گنیں تو تباہ ہوئیں مگر خفیہ کیمرے بھی ناکارہ ہو گئے ہیں۔“ نقاب پوش نے جواب دیا۔

”سمیرا کو ڈاکٹر نے کہاں رکھا ہے؟“ خوشی نے پوچھا۔

”سمیرا کو تو نہیں جانتا البتہ ڈاکٹر کی محبوبہ تہہ خانے کی تجربہ گاہ میں ڈاکٹر کے ساتھ رہتی ہے۔“

”تہہ خانے تک جانے کا راستہ بتاؤ۔“ خوشی کے پوچھنے پر وہ تہہ خانے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

”اب مجھے چھوڑ دو، تم نے وعدہ کیا تھا۔“

”ہمارا وعدہ تمہیں زندہ رکھنے کا ہے، چھوڑنے کا نہیں۔“ خوشی نے کہا۔ اور اس کی کپٹن پر زور دار گھونہ مارا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی خوشی اور یاسر اسے گھسیٹ کر کمانڈوز تک لائے۔

”تم لوگ عمارت سے باہر ہو گے۔ یاسر اس کی نقاب اور لباس پہن لے گا اور مجھے کندھے پر لا کر اس عمارت کے اندر لے جائے گا۔ ڈاکٹر اسے اپنا کارندہ سمجھے گا۔ میرے بارے میں یہ اسے بتانے گا کہ میں اس جنگل میں بے ہوش لیٹی تھی۔“

عمارت میں جاتے ہی میں سانس روک کر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دوں گی۔ ویسے بھی میں مارشل آرٹ کے ساتھ ساتھ یوگا کی ماہر بھی ہوں۔“ خوشی بولی۔

یاسر بے ہوش نقاب پوش کو ایک درخت کی آڑ میں لے گیا۔ اس کے کپڑے خود پہنے اور اپنے اسے پہنا دیئے۔ چہرے پر اس کا نقاب چڑھایا۔ اب وہ خوشی کو کندھے پر لا کر عمارت کی طرف اسی راستے پر چل دیا۔ جہاں سے انہوں نے نقاب پوش کو ٹریس کیا تھا۔

بیرونی گیٹ سے اندر جاتے ہی یاسر کو میڈور میں چلنے لگا۔ میڈور میں جگہ جگہ انسانی جسم کی ہڈیاں اور گوشت سے محروم کھوپڑیاں پڑی تھیں۔ وہ چلتے ہوئے کن اکھیوں سے جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اسے دیواروں میں پوشیدہ کئی خفیہ کیمرے بھی نظر آئے۔

”گلتا ہے ڈاکٹر نے عمارت میں ہر جگہ کیمرے نصب کر رکھے ہیں۔“ اس نے سوچا۔

خوشی اس کے کندھے پر ساکت پڑی تھی یہاں آنے سے پہلے خوشی نے زنانہ لباس پہن لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر خوب صورت لڑکیوں کو جنت میں رکھتا ہے۔ یاسر کو میڈور میں چلتا ہوا دائیں سمت کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں بائیں سمت رکھی الماری کھول کر نقاب پوش کے بتائے گئے طریقے کے مطابق سوچ گئی۔

آن کیا۔ کمرے کی دیوار تقریباً چار فٹ کے قریب سرک گئی۔ اندر داخل ہو کر چھت میں لگا سوچ گئی۔

خانے کا دروازہ بند ہو گیا دیوار اپنی جگہ پر آ گئی اور چاروں طرف روشنی پھیل گئی یہ ایک عظیم الشان تہہ خانہ تھا۔ وہ میز حیاں اتر کر وسیع ہال میں داخل ہو گیا۔

ہال میں جگہ جگہ انسانی ڈھانچے موجود تھے۔ تہہ خانے کا انتظام دیکھ کر یاسر متاثر نظر آ رہا تھا۔ دائیں سمت والے کمرے کے دروازے کا سوچ گئی آن کرتے ہی ہال نما کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ اس ہال نما کمرے میں نصف درجن لوہے کے بیڈ عجیب قسم کی مشینیں، کمپیوٹر، سرجری کے آلات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا گویا یہ جدید ترین لیبارٹری تھی۔

ڈاکٹر حاتم اس وقت لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھا۔ سمیرا ایک طرف بیڈ پر لیٹی تھی شاید سو رہی تھی باجے ہوش تھی۔ یاسر نے اپنے آپ کو پرسکون رکھا۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جنگل میں بے ہوش پڑی لیٹی تھی۔ میں اٹھا لیا شاید آپ کے کام آجائے۔“ یاسر نے بھرائے ہوئے لیجے میں بولتے ہوئے اس نقاب پوش کے لیجے کی نقالی کی کوشش کی۔ جس میں وہ کسی حد تک کامیاب رہا۔

”اسے بیڈ پر لٹا دو۔“ ڈاکٹر کے حکم پر یاسر نے خوشی کو ایک بیڈ پر لٹا دیا۔

”بہت خوب! کیا حسین لڑکی ہے، اسے بھی جنت میں پہنچا دوں گا لیکن یہ روپی کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ آج اسے پھر سمیرا بننے کا دورہ پڑا تھا، اس لئے اسے نیند کا انکشن لگا دیا۔“ ڈاکٹر ہڈیاں ہنسی ہنسا اور کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ کوئی مٹن دیا یا اور غصے سے کمانڈوز کو دھمکیاں دیتے لگا۔

”عمارت کے قریب مت آنا ورنہ سب کو ختم کر دوں گا۔“ اس کے بعد اٹھا۔ اس پری کو اٹھاؤ اسے جنت میں چھوڑ آئیں یہ نہ ہو کہ روپی جاگ کر مجھ سے ناراض ہو جائے۔“ وہ دوبارہ ہنسا۔

یاسر نے خوشی کو دوبارہ اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر کی خود ساختہ جنت میں تھے۔ یہاں دس کے قریب مسلح نقاب پوش بھی تھے۔ ڈاکٹر جمشید اور کامران بھی وہیں موجود تھے۔ ڈاکٹر کے اشارے پر یاسر نے خوشی کو ایک طرف لٹایا اور اس کے ساتھ باہر نکلے لگا۔

”تم میں سے چار افراد باہر جاؤ اور عمارت کے قریب ہی رہو۔ جیسے جیسے موقع ملے سرکاری کتوں کا خاتمہ کرتے جاؤ۔“ ڈاکٹر نے کہا اور چار نقاب پوش ان کے ساتھ چل دیئے۔

اب وہ دوبارہ تجربہ گاہ میں تھے ڈاکٹر وقفے وقفے سے کمپیوٹر پر نگاہ ڈالتا رہا تقریباً ایک گھنٹہ بعد تجربہ گاہ میں الارم بج اٹھا۔ ڈاکٹر کمپیوٹر کی طرف دیکھتے ہوئے چلایا۔

”حرام خورد و انہیں آگے آنے سے روکو۔“

کمپیوٹر پر سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کمانڈوز درختوں کی آڑ سے نقاب پوشوں پر فائر کر رہے تھے اچانک دو نقاب پوش جیتے ہوئے جہنم واصل ہو گئے۔ کمانڈوز نے ان کے سینوں میں گولیاں اتار دی تھیں کچھ دیر بعد دوسرے دونوں نقاب پوش بھی مارے گئے۔

اسی وقت سمیرا کسمانے لگی، اسے ہوش آ رہا تھا۔

”حرام خورد میں تمہارے شہر کو کھنڈر بنا دوں گا۔“ ڈاکٹر لیپ ٹاپ کی طرف لپکا۔ اس نے لیور پر دیا یاں ہاتھ رکھا اور اسے فینچے کر دیا۔ اسی اثنا میں سمیرا ہوش میں آ چکی تھی۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟ پاگل انسان رک جاؤ، خدا کے لئے بلیک مٹن مت دہانا۔“ وہ چلائی، ڈاکٹر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا اور اپنی انگلی بلیک مٹن کی طرف بڑھا دی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر کامران ڈاکٹر جمشید اور نقاب پوش جو ان لڑکیوں کو دبوچے ان کے ساتھ خرمستیاں کر رہے تھے۔ خوشی نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اندازہ لگالیا کہ لڑکیاں اپنی جان بچانے کے لئے خود پر جبر کر کے ہوئے تھیں۔ نقاب پوشوں کا اسلحہ ارد گرد پڑا تھا۔ وہ بے فکری سے شراب پی رہے تھے اور لڑکیوں کو چھیڑ رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی خفیہ ایجنٹ ان کو کیفر کردار تک پہنچانے آ گئی ہے۔ ان کا شرمناک کھیل اب اخلاقی حدود پار کرنے والا تھا۔ خوشی نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اسی وقت ایک نقاب پوش جھومتا ہوا خوشی کی طرف بڑھا اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ خوشی کے جسم کو چھوتے خوشی کی زوردار فرنٹ کلک اس کے سینے پر لگی وہ اچھل کر تالاب میں جا کر خوشی نے ایک رائفل کی طرف جھلانگ لگادی۔

اس سے پہلے کہ نقاب پوش کچھ کرتے یا سنہیلے رائفل خوشی کے ہاتھوں میں تھی ان لڑکیوں کو چھوڑ دو چھوڑ وہ چلائی۔ نقاب پوش نے لڑکیوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ خوشی کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اپنی رائفلوں کی طرف لپکے۔ خوشی نے پے درپے



فائرنگ شروع کر دی۔ اس کا نشانہ غضب کا تھا۔ وہاں موجود نصف درجن نقاب پوش واصل جہنم ہو گئے۔ ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر جشید خوف سے کانپ رہے تھے۔ ”لڑکیوں! تم لوگ آزاد ہو یہ تمہارے مجرم ہیں، ان کا فیصلہ کرو، پھر تمہیں اس جہنم سے آزادی دلائی ہوں۔“ درجنوں لڑکیاں ڈاکٹروں پر ٹوٹ پڑیں، ڈاکٹر چیخنے چلانے لگے درجنوں کے قریب لڑکیاں انہیں زمین پر لٹائے مار پیٹ رہی تھیں ان میں سے بعض غیض و غضب کے عالم میں ڈاکٹروں کے جسم پر اچھل رہی تھیں کچھ نے وہاں رکھی لوہے کی کرسیاں اٹھالیں اور ڈاکٹروں پر برسانے لگیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں ڈاکٹروں کی خونچکاں لاشیں پڑی تھیں۔

خوشی ہاتھوں میں رانفل تھاے لڑکیوں کو لئے خفیہ راستے پر چلتی ہوئی تجربہ گاہ کے اندر داخل ہو گئی۔ لڑکیاں اس کے عقب میں تھیں۔ ڈاکٹر لیور کھینچ کر قہقہہ لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا اب بلیک بٹن دباتے ہی میزائل فائر ہو کر شہر پر جا گریں گے اور سب تباہ ہو جائے گا۔ ”رک جاؤ ڈاکٹر۔“ یاسر چلایا اور اس پر چھلانگ لگادی، یاسر نے ڈاکٹر کو کرسی سے گھسیٹ لیا، ڈاکٹر نے نیچے پڑے یاسر کو اپنے اوپر سے اچھالا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف لپکا، اس بار وہ بلیک بٹن دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ تجربہ گاہ میں خوفناک سائرن بجنے لگا۔ ”ہا ہا۔ اب پانچ منٹ بعد یہ میزائل فائر ہو جائیں گے۔“ اس نے دیوانگی سے ہنسا شروع کر دیا۔

یاسر اس پر پل پڑا اس کے طاقتور گھونے اور لائیں ڈاکٹر کے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ لڑکیاں اور سیرا ساکت کھڑی تھیں۔ خوشی نے لیپ ٹاپ کی طرف چھلانگ لگائی اور لیور کو کھینچ کر اوپر کرنے لگی۔ ”باجی رک جائیں لیور کھینچنے سے یہ تجربہ گاہ اور عمارت تباہ ہو جائے گی، میزائل یہیں پھٹ جائیں گے، ہم سب مارے جائیں گے۔“ سیرا چلائی اور خوشی کی آنکھیں چپکے لگیں اس نے خطرناک فیصلہ کیا اور لیور اوپر کر دیا۔ ”نہیں۔“ ڈاکٹر حاتم چلایا، اسی لمحے اس کی کپٹی

سے یاسر کا گھونسلہ نکل آیا تو وہ چکرا کر گر اور بے ہوش ہو گیا۔ ”بھگوا! سمیرا نے کہا اور سب باہر کی طرف بھاگے، دھماکے شروع ہو گئے۔ عمارت لرزنے لگی۔ وہ ہال میں بھاگ رہے تھے کہ ایک طرف کی دیوار گری تقریباً پانچ کے قریب لڑکیاں بلے کے نیچے دب گئیں جگہ جگہ سے بلاک، ستون، ملبر گرہا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت عمارت ان کے سروں پر گر جائے گی۔ وہ تہہ خانے کی سیڑھیوں تک پہنچے، پھر وہ کوریڈر تک جا پہنچے تھے، پے در پے دھماکے ہو رہے تھے۔ پوری عمارت بلے کا ڈھیر بن گئی اور ڈاکٹر حاتم واصل جہنم ہو گیا تھا۔

وہ مین گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ دھماکے شدت اختیار کر گئے، خوشی کے جسم سے ایک ستون سے بلاک کے ٹکڑے ٹکڑے ٹکرائے اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

یاسر، سیرا اور پندرہ کے قریب لڑکیاں زندہ بچی تھیں۔ خوشی کی حالت بہت خراب تھی۔ اسے فوری طور پر ہسپتال کا پٹر میں شہر کے ایک بڑے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت وہ ICU میں تھی ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اس کی زندگی کو سخت خطرات لاحق تھے، اس کے سچنے کے امکانات بہت کم تھے۔

خوشی نے ہزاروں بلکہ لاکھوں زندگیاں بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگادی تھی۔ اہم ترین شخصیات ملک کی عوام اس کی زندگی کی دعا کر رہے تھے۔ ملک بھر کے ٹی وی لائیو پروگرام اس کے بارے میں بار بار بتا رہے تھے۔ حکومت نے اسے متغیر شجاعت دینے کا اعلان کیا تھا۔ پھر لوگوں کی دعائیں سن لی گئیں۔ ڈاکٹروں نے خوشی کے خطرے سے باہر ہونے کا اعلان کر دیا۔

تقریباً تین ماہ بعد پھولوں سے نئی کاری طرف سمیرا اپنے شوہر یاسر کے ہمراہ آگے بڑھ رہی تھی اور خوشی اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

